نامُراد

ملک صفدر حیات
(ریٹائیرڈ ڈی ایس پی)

فہرست

نامراد	5
لنگڑی غیرت	63
عشق کاذب	127
زہرِ ماضی	191

نامراد

قیام پاکستان کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ رمضان کا آخری عشرہ تھا۔ طاق راتوں میں شب بیداری کا سلسلہ جاری تھا۔ مسجدیں آباد اور لوگوں کے دل خوشیوں سے معمور تھے۔ وہ اس ماہِ مبارک کی رحمتوں اور فضیلتوں سے بھرپور استفادہ کر رہے تھے مگر کچھ بد بخت ایسے بھی تھے جو اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی کو مزید گہرا کرنے میں مصروف تھے۔

اس روز صبح ہی سے میری طبیعت ناساز تھی۔ میں تھانے سے بھی جلدی اٹھ آیا تھا اور تراویح کی ادائیگی کے لیے مسجد میں نہیں جا سکا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد میں اپنے کوارٹر میں بستر پر لیٹا آرام کر رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ یقیناً کوئی اہم معاملہ درپیش تھا ورنہ میں شبینہ ڈیوٹی والے عملے کو اچھی طرح سمجھا آیا تھا کہ انتہائی ناگزیر حالات ہی میں مجھے بلایا جائے۔ اس وقت بھی مجھے اچھا خاصا بخار تھا۔

میں نے بستر چھوڑا اور صحن کو عبور کر کے اپنے کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔ سامنے حوالدار کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے صوبے خان؟''

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''آپ کو بے آرام کرنے کے لیے معذرت چاہتا ہوں ملک صاحب لیکن معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آپ کو چلنا ہوگا۔''

''ایسا کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا ''محلہ بخت والا میں ڈکیتی کی واردات ہو رہی ہے۔''

''ڈکیتی کی واردات ہو رہی ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے

ہوصوبے خان؟ واردات ہورہی ہے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جناب ملک صاحب! میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔'' حوالدار صوبے خان الجھن آمیز لہجے میں بولا ''ادھر تھانے میں ایک بندے نے اطلاع دی ہے کہ اس کے پڑوس میں ڈکیتی ہورہی ہے۔ یہ محلہ بخشے والا سے آیا ہے۔ آپ کہیں تو میں فضل دین نامی اس شخص کو یہیں آپ کے پاس لے آتا ہوں۔''

میں اپنی خراب طبیعت کو چشم زدن میں بھول گیا تھا۔ محلہ بخشے والا میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے حوالدار سے پوچھا۔ ''فضل الدین نے اپنے گھر کا پتا کیا بتایا ہے؟''

حوالدار نے مجھے مذکورہ ایڈریس سمجھادیا۔ وہ گلی میری دیکھی ہوئی تھی۔ میں پہلے بھی ایک دو مرتبہ اس طرف جاچکا تھا۔ میں نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم فوراً دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر موقع واردات پر پہنچو۔ میں بھی تیار ہوکر تمہارے پیچھے ہی آرہا ہوں۔''

صوبے خان جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''اور ہاں' اگر تم چاہو تو زیادہ سپاہیوں کو لے جاؤ۔ پتہ نہیں وہاں کیا صورتِ حال پیش آجائے۔ ذرا ہوشیاری سے ہر قدم اٹھانا۔ ڈاکوؤں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ جب ان کی جان کو خطرہ درپیش ہو تو وہ گھر کے افراد کو یرغمال بنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایک آدھ بندہ پھڑکانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جو لوگ برکتوں اور رحمتوں والے اس مقدس مہینے میں ڈکیتی جیسے مکروہ فعل سے باز نہیں رہ سکے' ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب' میں بہت احتیاط سے کام لوں گا۔'' صوبے خان نے پُریقین لہجے میں کہا اور رخصت ہوگیا۔

حوالدار کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی اپنی وردی پہنی۔ سروس ریوالور کو ہولسٹر میں اڑسا اور بخشے والا جانے کے لیے روانہ ہونے سے پہلے تھانے میں جھانک لیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اے ایس آئی اسلم باجوہ نے مجھے سلیوٹ کیا اور مؤدب لہجے میں بتایا۔

''ملک صاحب' آپ کے حکم کے بہ موجب حوالدار چار سپاہیوں کے ساتھ بخشے والا جاچکا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''ارے یار' یہ بخار وخار کیا اہمیت رکھتا ہے۔'' میں تھانے سے باہر نکل آیا۔ ''تم تھانے ہی

میں رکو۔ میں ابھی ان ڈاکوؤں کو آہنی زیور پہنا کر تھانے لا رہا ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں' میں بالکل فٹ ہوں۔''

اے ایس آئی نے بحث مناسب نہ سمجھی اور واپس تھانے کی عمارت کی طرف چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں محلہ بخشے والا میں موجود تھا لیکن اس وقت تک بساط لپٹ چکی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جب حوالدار چار سپاہیوں کو لے کر جائے واردات پر پہنچا اس وقت تک ڈاکو اپنا کام کر کے وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکے تھے۔

میں جب مذکورہ مکان پر پہنچا تو ایک روح فرسا خبر میری منتظر تھی۔ ڈاکو اپنا کام تو کر ہی گئے تھے لیکن جاتے جاتے ساتھ اس گھر کی ایک جوان لڑکی کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ صفیہ نامی مذکورہ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور عید کے بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ ڈاکوؤں کی تعداد دو بتائی گئی جو صفیہ کے کپڑے' زیورات اور خود اسے بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ دونوں گھوڑوں پر وہاں پہنچے تھے جنہیں انہوں نے مکان کے عقب میں باندھ رکھا تھا۔ صفیہ کے گھر کا ایک دروازہ عقبی جانب بھی کھلتا تھا۔ ڈاکوؤں نے راہِ فرار اختیار بہ الفاظ دیگر واپسی کے لیے وہی دروازہ استعمال کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس گھر سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے کیونکہ جس وقت محلے کے افراد گھر کے بیرونی دروازے پر جمع ڈاکوؤں سے نمٹنے کی سبیلیں سوچ رہے تھے' ڈاکو نہایت خاموشی سے پچھلی جانب سے گھوڑوں پر سوار ہوکر وہاں سے نکل گئے تھے۔

گھر کے اندر ایک کہرام بپا تھا۔ صفیہ کی والدہ کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہورہی تھی۔ اس گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے۔ مغویہ صفیہ' اس کی والدہ زینت بی بی اور والد قادر بخش۔ صفیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ عید کے بعد اس کی شادی طے تھی۔ صفیہ کی شادی ملک ارشد نامی ایک نوجوان سے ہونا تھی جو باغبان پورہ کا رہائشی تھا اور کپڑے کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔

حوالدار صوبے خان اپنی ناکامی پر خاصا جھنجلایا ہوا تھا حالانکہ یہ اس کی ناکامی نہیں تھی۔ اگر اس کی موجودگی میں ڈاکو لڑکی کو اٹھا کر فرار ہوتے تو اسے قصوروار ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ صوبے خان خواہ مخواہ اس واقعے کا بہت زیادہ اثر لے رہا تھا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اور اس کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے بعد میں نے دو سپاہیوں کو واپس تھانے بھیج دیا پھر میں نے سب سے پہلے موقع واردات کا تنقیدی جائزہ لیا۔

وہ دو کمروں پر مشتمل ایک عام سا مکان تھا۔ دونوں کمرے مکان کے پچھلے حصے میں واقع

تھے۔ ان کے آگے صحن تھا اور پھر بیرونی دروازہ تھا۔ دو کمروں میں سے ایک کا دروازہ مکان کے عقبی جانب بھی کھلتا تھا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ڈاکو اسی دروازے سے فرار ہوئے تھے۔ مغویہ کے والد قادر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ صفیہ اسی کمرے میں تھی جس کا دروازہ گھر کے پچھواڑے کھلتا تھا۔

موقع واردات کا تفصیلی نقشہ تیار کرنے کے بعد میں وہاں پر موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ اس کارروائی میں رات کے تقریباً دس بج گئے۔ ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ دونوں کمروں کے آگے ایک وسیع برآمدہ تھا اور باورچی خانہ و باتھ روم وغیرہ بھی صحن ہی میں بنے ہوئے تھے۔ صحن میں جامن یا غالباً آم کا ایک پیڑ بھی استادہ تھا جس کے نیچے دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔

سب سے پہلے میں نے قادر بخش کے پڑوسی فضل دین کا بیان نوٹ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھانے آ کر اس واردات کی اطلاع دی تھی۔ فضل دین کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک دکان دار تھا۔ محلے کے بازار میں اس کا کریانہ اسٹور تھا۔

میں نے اس کے ضروری کوائف نوٹ کرنے کے بعد پوچھا ''فضل دین! تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہارے پڑوس میں دو ڈاکو گھسے ہوئے ہیں۔''

''جناب ملک صاحب!'' وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی دکان بند کر کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے قادر بخش کے گھر کے عقب میں دو گھوڑے بندھے ہوئے دیکھے تو مجھے حیرت ہوئی۔ جب میں اپنی گلی میں داخل ہوا تو دو ڈھاٹا پوش افراد کو قادر بخش کے دروازے پر دیکھ کر چونک اٹھا پھر اس سے پہلے کہ میں ان کے قریب پہنچتا' وہ دونوں گھر کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ غالباً انہوں نے پہلے دستک دی ہوگی پھر جیسے ہی دروازہ کھلا ہوگا' وہ دھڑا دھڑ کر اندر داخل ہو گئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد تم فوراً تھانے چلے آئے' ہمیں اطلاع دینے۔''

''نہیں جناب' میں فوراً تھانے نہیں آیا تھا بلکہ میں نے پہلے اپنے طور پر تصدیق کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

فضل دین نے بتایا۔ ''ملک صاحب! میں ان دونوں کو دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگر ان کے چہروں پر ڈھاٹے نہ لگے ہوتے تو شاید میرا اس طرف دھیان بھی نہ جاتا لیکن وہ جس حلیے

اور پُر اسرار انداز میں قادر بخش کے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے' اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور.....''

فضل دین کا بیان طولانی ہونے لگا تو میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر تم نے کس طرح تصدیق کی؟''

''میں نے فوراً اپنی بیوی کو اس بارے میں بتایا۔'' فضل دین نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا۔ ''رضیہ بیگم نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر میرے شک کی تائید کرتے ہوئے بولی۔ ''تم جاؤ اور پتا کر کے آؤ کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں نے رضیہ سے کہا کہ وہ جائے اور زینت سے معلوم کرے لیکن اس نے بتایا کہ زینت سے آج کل اس کی بول چال بند ہے۔ اپنے گھر میں بس ہم دونوں ہی جی ہیں۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں گھر سے نکلا اور قادر بخش کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے قدرے تیز آواز میں دروازہ بجایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قادر بخش کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کون ہے؟'' انداز رازدارانہ تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ میں ہوں قادر..... فضل دین۔ تمہارا پڑوسی۔''

''ہاں فضل دین' کیا بات ہے؟'' قادر بخش نے دروازہ کھولے بغیر استفسار کیا۔

میرے شک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اصولی طور پر میری دستک کے جواب میں قادر کو دروازہ کھول دینا چاہیے تھا جیسا کہ پہلے ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ اندر ہی سے سوال جواب کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''قادر بخش! یار دروازہ تو کھولو' میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اندر خاموشی رہی۔ چند لمحوں بعد قادر کی آواز آئی ''فضل دین' آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل صبح تمہاری دکان سے ہوتا ہوا جاؤں گا پھر جتنی جی چاہے' باتیں کر لینا۔ اب تو میں سونے جا رہا ہوں۔''

قادر کا گریز میرے تجسس کو بھڑکا رہا تھا۔ میں نے کہا ''یار' تم خیریت سے تو ہو نا۔''

''ہاں' میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہارے گھر میں دو اجنبی افراد کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔'' میں نے دانستہ ڈھاٹا پوش افراد کے بجائے اجنبی افراد کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ''تم خیر' خیریت سے تو ہو نا؟''

چند لمحوں تک اندر خاموشی رہی جیسے قادر جواب دینے سے پہلے سوچ رہا ہو۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ''یار فضل دین! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ جن دو اجنبی افراد کو تم نے دیکھا ہے' وہ میرے مہمان ہیں۔ کھیالی سے آئے ہیں۔ تم میرے بارے میں پریشان نہ ہو۔ میں بالکل خیریت سے ہوں..... اور ہاں' صبح ہماری ملاقات تمہاری دکان پر ہوگی۔''

اس کے بعد گھر کے اندر مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بغور سنا۔ وہ ایک سے زیادہ افراد کے چلنے کی آواز تھی..... کم از کم دو افراد۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے شک میں اضافہ ہوتا گیا۔ یقیناً اس وقت دروازے کے پیچھے قادر بخش کے ساتھ اور بھی کوئی موجود تھا اور اسی کی ہدایت کے مطابق قادر نے میرے سوالوں کے جواب دیے تھے۔''

فضل دین نے اپنی بات ختم کر کے خاموشی اختیار کی تو میں نے پوچھا۔ ''اس کے بعد تم نے کیا کیا؟''

وہ بولا۔ ''میں نے گھر جا کر اپنی بیوی کو ساری صورتِ حال بتائی پھر اسی کے مشورے پر میں اس پراسرار واقعے کی اطلاع دینے تھانے چلا گیا تھا۔''

''یعنی تم نے ان ڈھاٹا پوش افراد کو قادر بخش کے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر یقین کر لیا کہ وہ ڈاکو ہی تھے؟''

''یقین کرنے یا نہ کرنے کا کیا سوال جناب۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''اب تو ساری حقیقت سامنے آ چکی ہے۔ وہ ڈاکو لڑکی سمیت اس کے کپڑے اور زیورات اڑا کر لے جا چکے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فضل دین! تم نے تھانے آنے کے بجائے کسی اور محلے دار کو اس واقعے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟''

''اس وقت جو میری سمجھ میں آیا' میں نے کر دیا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''کیا میں نے تھانے میں اس واقعے کی اطلاع پہنچا کے کوئی جرم کیا ہے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا پھر دو چار مزید سوال کرنے کے بعد فضل الدین کو فارغ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے باور کرا دیا۔ ''فضل الدین' ابھی تو تمہارا کچا بیان ہوا ہے۔ کل تم کسی وقت تھانے آ کر اپنا بیان ریکارڈ کرا دینا۔''

وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! آپ جیسا کہیں گے' میں ویسا ہی کروں گا۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور مغویہ کے والد قادر بخش کو کمرے میں بلا لیا۔

ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ جب موقع کے گواہوں کے بیانات نوٹ کیے جاتے ہیں تو ایک وقت میں صرف ایک فرد ہی سے سوال جواب کیے جاتے ہیں۔ اس رات میں نے کوئی نصف درجن افراد سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن سب سے زیادہ اہمیت تین افراد کے بیانات کی تھی یعنی فضل دین' قادر بخش اور مغویہ کی والدہ زینت بی بی۔ میں ان ہی کا ذکر کروں گا۔

میں اس وقت اسی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں سے صفیہ کو اغوا کیا گیا تھا۔ قادر بخش کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی تاہم اپنی بیوی کی بہ نسبت اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''قادر بخش! مجھے اس افسوس ناک واقعے سے دلی رنج ہوا ہے۔ میں جلد از جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

''قادر بخش! وہ دونوں ڈھاٹا پوش کون تھے؟'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا' وہ کون تھے۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''دیکھنے اور پہچاننے کا کیا سوال جناب۔ انہوں نے جس طرح اپنے چہروں کو گہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھا تھا اس سے ان کی شناخت کرنا ناممکن تھا۔ ہاں' البتہ ایک بات میں آپ کو بتاتا چلوں' ان میں سے ایک کا قد غیر معمولی بڑا اور دوسرے کا غیر معمولی چھوٹا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ اگر ایک سات فٹ کا تھا تو دوسرا ساڑھے چار فٹ کا ہوگا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کی دستک کے جواب میں دروازہ تم نے کھولا تھا؟''

''نہیں جناب' میں اس وقت باتھ روم میں تھا۔'' قادر بخش نے جواب دیا۔ ''دروازہ میری بیوی زینت نے کھولا تھا۔ وہ زینت کو دھکا دیتے ہوئے گھر کے اندر گھس آئے تھے اور اندر آتے ہی دروازے کو بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی۔ میں جب باتھ روم سے باہر نکلا تو وہ دونوں بندوقوں کے سائے میں صفیہ اور زینت کو کور کیے ہوئے تھے..... اسی کمرے میں۔'' قادر نے اس کمرے کے در و دیوار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔ ''پھر انہوں نے مجھ پر بندوق تانتے ہوئے لائن حاضر کر دیا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔''اس کے بعد انہوں نے بندوقوں کے زور پر صفیہ کے تمام قیمتی کپڑے اور زیورات ہم سے حاصل کر لیے۔ انہوں نے خاص طور پر صفیہ کی شادی کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس گھر میں کافی ''مال'' ہوگا۔ ہم یہی سمجھے کہ وہ محض ڈاکو ہیں اور زیوارت ونقدی لے کر ہماری جاں بخش دیں گے مگر وہ تو جاتے وقت ہماری اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کو بھی اٹھا لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد تو صفیہ مایوں بیٹھنے والی تھی۔ ہم لڑکے والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

میں نے پوچھا۔''وہ نقدی کتنی لے کر گئے تھے؟''

''پانچ ہزار روپے۔'' قادر بخش نے جواب دیا۔

''واضح رہے کہ اس زمانے میں پانچ ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے اس وقت سونا پچاس پچپن روپے تولہ مل جاتا تھا اور چار روپے کا ایک من آٹا آتا تھا۔''

میں نے پوچھا۔''قادر بخش! اتنی بڑی رقم تم نے گھر میں کیوں رکھی ہوئی تھی۔''

وہ بولا۔''میری ایک ہی تو بیٹی ہے ملک صاحب۔ میں اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا۔ صفیہ ہماری بیٹی بھی تھی اور بیٹا بھی۔ ہم اپنا ہر شوق' ہر چاؤ پورا کرنا چاہتے تھے مگر اب تو.....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں سے باقاعدہ آنسو گرنے لگے تھے۔ میں نے چند لمحات کے توقف سے سوال کیا۔''قادر بخش! تمہارا پڑوسی فضل دین جب تمہارے دروازے پر آیا تھا تو تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟''

''کیسے کھولتا دروازہ!'' وہ بے چارگی سے بولا۔''ایک ڈاکو نے بندوق کی نال میری پیٹھ پر ٹھونک رکھی تھی۔ اس لمبو نے۔ میں وہی کچھ کرتا رہا جس کے لیے وہ ہدایات دے رہا تھا۔''

گویا فضل دین کا اندازہ درست تھا۔ میں نے پوچھا۔''قادر بخش تمہارا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟''

''جناب' میں لکڑی کے کام کا ماہر ہوں۔ فرنیچر اور دوسری سجاوٹ کی چیزیں بناتا ہوں۔ دوسرا کمرہ نہایت ہی عمدہ اور دیدہ زیب قسم کے فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ یہ میں نے صفیہ کو دینے کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا تھا مگر اب تو صفیہ ہی نہیں رہی۔ وہ ظالم لے گئے میری بچی کو۔''

اس کی آواز رندھ گئی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''فکر نہ کرو قادر بخش۔ میں جلد از

جلد تمہاری بیٹی بازیاب کرلوں گا۔ تم ان دونوں ڈاکوؤں کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی مجھے بتاؤ۔ ہر وہ بات جس سے ان کا سراغ لگایا جا سکے۔''

''مجھے جو کچھ معلوم تھا' وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے جناب۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولا۔ ''اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔''

میں نے پوچھا۔''قادر بخش' تمہاری کسی سے دشمنی تو نہیں ہے؟''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔''

''میرا مطلب ہے' یہ کام کسی دشمن کا بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''میرا تو کوئی دشمن نہیں ہے جناب۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''میں نے نہ تو کسی سے دوستی پال رکھی ہے اور نہ ہی دشمنی۔ کام سے وقت ہی نہیں ملتا۔ آج تک کسی سے میری تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی' لڑائی جھگڑا تو دور کی بات ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔''اگر تمہاری کسی سے دشمنی نہیں تو پھر یہ دونوں افراد کون ہو سکتے ہیں۔ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ تم نے بیٹی کی شادی کے لیے قیمتی جوڑے اور زیورات تیار کروا رکھے تھے۔ یقیناً وہ تمہارے حالات سے واقف ہوں گے۔''

''جناب' یہ بات کوئی ڈھکی چھپی تو ہے نہیں کہ عیدالفطر کے بعد صفیہ کی شادی ہونے والی ہے۔'' قادر بخش نے پرخیال لہجے میں کہا۔''آج کل تو ویسے ہی بہت چوریاں ہو رہی ہیں۔ چند روز قبل نوشہرہ روڈ پر بھی شادی والے ایک گھر میں ڈکیتی ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے گوندلاں والا میں بھی.....''

''قادر بخش!'' میں نے مغویہ کے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''ایسی وارداتوں میں ڈاکو صرف قیمتی سامان' زیورات اور نقدی وغیرہ لے کر جاتے ہیں' لڑکیوں کو اغوا نہیں کرتے۔''

وہ بے بسی سے سر ہلانے لگا۔''پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔''قادر بخش! میں نے سنا ہے' ارشد ملک نامی ایک نوجوان سے مغویہ کی شادی ہونے والی تھی جو باغبان پورہ میں رہتا ہے اور کپڑے کی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' اس نے تصدیقی لہجے میں کہا۔''ارشد میری بڑی سالی کا لڑکا ہے۔ یعنی صفیہ کا خالہ زاد ہے۔''

میں نے پوچھا۔''مغویہ کا ارشد سے رشتہ طے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''تقریباً چھ ماہ ہوگئے ہیں۔'' قادر بخش نے جواب دیا۔

''گویا یہ رشتہ دونوں گھروں کی رضامندی سے طے ہوا تھا؟'' میں نے عام سے لہجے میں کہا لیکن انداز سوالیہ تھا۔ وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ جلدی سے بولا۔

''جی بالکل' اس رشتے میں دونوں طرف کی مرضی شامل تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا لڑکا اور لڑکی بھی راضی تھے اس رشتے کے لیے؟''

''جی ہاں' وہ دونوں بھی اس رشتے سے خوش تھے۔''

''کیا تم نے باقاعدہ صفیہ سے اس کی مرضی معلوم کی تھی؟''

''پتہ نہیں' آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں یہ باتیں ایک خاص مقصد کے تحت کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے' تمہارے جوابات سے مجھے اس کیس کو سمجھنے میں کوئی مدد مل سکے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ جلد از جلد تمہاری بیٹی کو برآمد کرلیا جائے؟''

''میں ایسا کیوں نہیں چاہوں گا۔'' وہ بے تابی سے بولا۔ ''میرا سب کچھ تو صفیہ ہی ہے۔ آپ جیسے بھی ممکن ہو' اسے ڈھونڈ نکالیں..... اور آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ صفیہ کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی ہم نے یہ رشتہ طے کیا تھا۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ایک نئے زاویے سے سوال کیا۔ ''قادر بخش! یہ رشتہ طے ہونے سے پہلے کیا تمہاری بیٹی کے لیے کوئی اور بھی رشتہ آیا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب جس گھر میں بیری ہوتی ہے' وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ جس گھر میں جوان لڑکی ہو' وہاں رشتہ آنا تو معمولی بات ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا۔ ''لیکن آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''دیکھو قادر بخش۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اس واردات کو محض ڈکیتی سمجھنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

''پھر ڈکیتی کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے؟''

''مجھے یہ ڈکیتی سے زیادہ ایک اغوا کی واردات نظر آ رہی ہے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میرا تو سر چکرا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری صفیہ کا ایسا کون دشمن تھا جس نے اسے اغوا کرلیا۔''

میں نے کہا۔ ''صفیہ کا ارشد سے رشتہ طے ہونے سے پہلے صفیہ کے لیے کس کا رشتہ آیا

تھا؟'' میری سوچ گھوم پھر کر ایک ہی نکتے پر آ رہی تھی۔

قادر بخش نے بتایا۔ ''کوئی ڈیڑھ سال پہلے ساجی کا رشتہ آیا تھا۔ میری صفیہ کے لیے لیکن ہم نے اسے صاف منع کر دیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ ساجی کون ذات شریف ہے؟''

''اس کا اصل نام تو سجاول ہے لیکن ساجی مشہور ہوگیا ہے۔''

''تم لوگوں کے انکار پر ساجی نے کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟''

''اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بس ہم نے کورا جواب دیا اور ساجی کی ماں ٹھنڈی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہی۔''

میں نے کہا۔ ''قادر بخش! ساجی کے رشتے سے انکار کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''عجیب لفنگا سا لڑکا ہے۔ آوارہ اور بدمعاش۔ میں اپنی ہیرے جیسی بیٹی کے لیے لچے لفنگے لڑکے کا رشتہ کیسے قبول کرسکتا تھا۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں.....''

''اس کی آواز بھرا گئی اور وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھوں پر اترنے والی نمی کو صاف کرنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا سجاول عرف ساجی یہیں بخشے والا میں رہتا ہے؟''

''پہلے کبھی رہتا تھا' اب تو.....''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے جلدی سے استفسار کیا۔ ''اب وہ کہاں رہتا ہے؟''

''ڈسٹرکٹ جیل میں۔''

''اوہ!'' بے ساختہ میرے منہ سے گہری سانس خارج ہوگئی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ''وہ کس کیس میں جیل گیا ہے؟''

''دفعہ تین سو دو..... قتلِ عمد۔''

میں نے چونک کر قادر بخش کو دیکھا۔ ''ساجی نے کس کو قتل کر دیا تھا؟''

''تھا کوئی بدنصیب راہ گیر۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''بری صحبت نے یہ رنگ تو دکھانا ہی تھا۔ آوارہ اور اوباش لوگوں سے اس کا میل ملاپ تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد ماں بیٹے کو کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا' مرحوم عبدالغنی اپنے پیچھے پچیس ایکڑ اراضی چھوڑ گیا ہے۔ اسی کی

آمدنی پر پل رہے ہیں چار افراد..... ساجی کی ماں ناصرہ اور اس کی تین لڑکیاں..... ساجی تو گیا اب عمر بھر کے لیے جیل کی دیواروں کے پیچھے۔ اسے عمر قید ہوئی ہے۔"

قادر بخش نے خاصے معلومات افزا انکشافات کیے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "ساجی کو جیل گئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"کم و بیش ایک سال۔"

"اور ڈیڑھ سال پہلے اس کا رشتہ آیا تھا؟"

"جی ہاں' لگ بھگ اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔"

میں جس زاویے پر سوچ رہا تھا' مجھے اس میں ذرا تبدیلی کرنا پڑی۔ میرا خیال تھا کہ کسی شخص نے دیدہ دانستہ صفیہ کو اغوا کیا تھا اور وہ شخص صفیہ کا کوئی طلب گار ہی ہو سکتا تھا لیکن قادر بخش کے بقول صفیہ کا واحد طالب اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے سانس لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں مختلف سوالات گردش کر رہے تھے اور میرے سامنے بیٹھا ہوا قادر بخش الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

شاید ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ میں نے موقع واردات پر پہنچتے ہی لوگوں سے معلوم کر لیا تھا کہ ڈھاٹا پوش ڈاکو صفیہ کو اغوا کر کے کس جانب گئے تھے۔ اگرچہ بندوق بردار ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ تاہم انہوں نے سمت کی نشاندہی کر دی تھی۔ میں نے اسی وقت تین افراد پر مشتمل پولیس اہل کاروں کی ایک پارٹی مذکورہ سمت میں روانہ کر دی تھی لیکن آدھے گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد وہ ناکام و نامراد لوٹ آئے تھے۔ ویسے بھی ڈاکوؤں کو بچنے والا سے نکلے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ان کا ہاتھ آنا تقریباً ناممکنات میں تھا۔ میں قادر بخش سے کام کی کوئی بات نہیں اگلوا سکا۔ وہ ڈھاٹا پوش ڈاکوؤں سے واقف نہیں تھا' کسی سے اس کی ایسی دشمنی نہیں تھی کہ وہ اس دشمنی کو نکالنے کے لیے اس کی جوان بیٹی کو اغوا کر لیتا۔ ایک موہوم سا امکان سجاول عرف ساجی کے حوالے سے پیدا ہوا تھا لیکن اس کے پسِ زندان ہونے کے بارے میں سن کر یہ امکان بھی دم توڑ گیا تھا۔

اس وقت ایک عورت نے کمرے کے اندر آ کر قادر بخش کو مخاطب کیا۔ "قادر' زینت کو ہوش آ گیا ہے اور وہ تمہیں بلا رہی ہے۔"

اس واقعے کے بعد محلے کی کئی عورتیں گھر میں آ گئی تھیں اور بار بار بے ہوش ہوتی زینت کو انہوں نے سنبھال رکھا تھا۔ قادر اٹھ کر جانے لگا تو میں نے کہا۔ "قادر بخش! میں زینت کا بیان

بھی لینا چاہتا ہوں۔"

"میں دیکھ کر آتا ہوں جی' اس کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے' اس وقت تم لوگوں پر ایک بالائے ناگہانی ٹوٹ پڑی ہے لیکن تمہاری بیوی کا بیان بھی بہت ضروری ہے۔ مجھے امید ہے' تم مجھ سے پورا پورا تعاون کرو گے تاکہ قانون کے تقاضے پورے ہو سکیں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں تنقیدی نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے اس کی تفصیلی تلاشی بھی لینا چاہیے لیکن سردست میں نے اس خیال کو پسِ پشت ڈال دیا کیونکہ اسی وقت قادر بخش اپنی بیوی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

زینت بی بی کا رنگ ہلدی کے مانند ہو رہا تھا اور وہ برسوں کی بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس کے لگ بھگ لگایا۔ میں نے پہلے تو اس سنگین واقعے پر گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کیا پھر قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں مغویہ کی ماں سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

قادر بخش نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا' وہ جلدی سے بولی۔ "قادر بخشا' تم تھانے دار صاحب کو وہ بات کیوں نہیں بتاتے جو میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں۔ ہائے' کوئی میری بات کیوں نہیں سمجھتا۔ میری بچی کو ڈھونڈ نکالو' نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

زینت کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے قادر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بیوی کون سی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ قادر بخش۔"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "شاید اس کا دماغ قابو میں نہیں رہا۔ بیٹی کی جدائی نے اس کے ذہن پر گہرا اثر کیا ہے۔"

"ہاں' میرے ذہن پر گہرا اثر ہوا ہے۔" زینت بی بی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "دل پر بھی شدید اثر ہوا ہے لیکن میرا دماغ ابھی تک قابو میں ہے قادر بخشا۔ تم میری بات کا یقین کر لو۔ وہ مجھے وہی ڈیڑھ گز کا (ڈیڑھ گز کا) لگا تھا۔ بالکل وہی خطرناک آنکھیں تھیں اور ایک آنکھ پر گہرے زخم کا نشان بھی تھا۔ میں صرف اس کی آنکھیں ہی تو دیکھ پائی تھی۔"

زینت کی بات ختم ہوئی تو میں نے براہِ راست اسی سے استفسار کیا۔ "بی بی تم مجھ بتاؤ۔ یہ "ڈیڑھ گز" کا کیا چکر ہے؟"

"تھانے دار صاحب! میں تو ایک ایک سے کہتی پھر رہی ہوں پر کوئی میری بات کا یقین ہی نہیں کرتا۔ میں نے قادر بخش کے بھی ترلے ڈالے ہیں پر مجال ہے جو اس نے میری بات پر کان بھی دھرے ہوں۔"

وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنی ہی ہانکے جا رہی تھی۔ میں نے وضاحت طلب نظر سے قادر بخش کی طرف دیکھا' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "جناب! ڈیڑھ گز اسے اس کی مراد سجاول عرف ساجی سے ہے۔ اس کا قد بھی کم و بیش ساڑھے چار فٹ ہی ہے۔ زینت کا خیال ہے کہ ان دو ڈاکوؤں میں ایک ساجی ہی تھا۔" پھر وہ زینت کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "بھلیے لوکے' کوئی عقل کو ہاتھ مارو۔ تمہاری تو مت ہی ماری گئی ہے۔"

"میری مت ابھی سلامت ہے۔' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "سارے پاگل ہو گئے ہیں۔ کوئی میری بات کا یقین ہی نہیں کرتا۔ ہائے وے میریا ربا! میں کس پاسے جاواں۔ یہ کون سا نیا سیاپا پڑ گیا ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتے ہوئے آہ وزاری کرنے لگی۔ اس کے انداز میں جنون کی آمیزش تھی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "زینت بی بی! میں تمہاری بات سنوں گا اور پوری تفصیل سے سنوں گا۔ تم مجھے بتاؤ' کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے حیرت آمیز نظر سے میری جانب دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ سچ کہہ رہے ہیں نا تھانے دار صاحب!"

"ہاں' بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ تم نے کیا دیکھا تھا۔"

"وہ غیر یقینی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "پتہ نہیں' آپ بھی میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں لیکن میں سوہنے رب کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ ان دو ڈھاٹا پوش ڈاکوؤں میں ایک پکا پکا ساجی تھا۔ وہی قد کاٹھ اور آنکھ پر زخم کا نشان۔"

میں نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے اس کی بات کا یقین آ گیا ہو پھر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ "زینت بی بی' مجھے پتہ چلا ہے کہ ساجی کسی قتل کیس میں ایک سال پہلے جیل چلا گیا تھا!"

"وہ جیل میں گیا تھا یا جہنم میں' اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ چھوٹے قد کا ڈاکو مجھے بالکل ساجی ہی لگا تھا۔"

"کیا اس نے ایسا کوئی اشارہ بھی دیا تھا جس سے تمہارے شک کو تقویت ملتی ہو؟"

"نہیں' اشارہ تو کوئی نہیں دیا تھا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں اس بارے میں تحقیقات کرواؤں گا کہ ساجی کون سی جیل میں ہے۔ تم....."

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا جناب کہ وہ ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔" قادر بخش نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"قادر بخش!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر بیٹھو۔ میں تنہائی میں زینت بی بی سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

قادر بخش بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں زینت کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو زینت بی بی۔" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تو تمہارا خیال یہ ہے کہ پستہ قامت ڈاکو ساجی ہو سکتا ہے۔"

"جی ہاں' مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "جب صفیہ کے لیے ساجی کا رشتہ آیا تھا تو تم لوگوں نے انکار کیوں کیا تھا؟"

یہ سوال میں قادر بخش سے بھی کر چکا تھا لیکن میں زینت کا جواب بھی سننا چاہتا تھا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "ساجی ہماری صفیہ کے قابل نہیں تھا۔ یہ تو بالکل حور کے پہلو میں لنگور والی بات تھی۔ سجاول ایک بگڑا ہوا آوارہ لڑکا تھا۔ میں اپنی مثال آپ صفیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کیسے دے دیتی۔"

میں نے قادر بخش سے کیا ہوا سوال دہرایا۔ "آپ لوگوں کے انکار پر ساجی نے کیا رویہ اختیار کیا تھا؟"

"اس نے براہِ راست ہم سے تو کوئی بات نہیں کی۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن اِدھر اُدھر کہتا پھرتا تھا کہ رشتے سے انکار کر کے ہم نے اچھا نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ ہم کو بھگتنا پڑیگا۔"

"یعنی اس نے دھمکی دی تھی!"

"واضح دھمکی تو نہیں دی تھی لیکن اسے دھمکی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور پھر تقریباً چھ ماہ بعد یعنی آج سے ایک سال قبل وہ قتل کے جرم میں جیل

چلا گیا اور اسے سزائے موت سنا دی گئی۔"

"ہاں' ایسا ہی ہوا تھا۔"

میں نے اس کے جوابات پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے کے بجائے نرم لہجے میں کہا۔ "اور آج تم نے اسی ڈھاٹا پوش ساجی کو دیکھا ہے؟"

"میں نے ساجی کو واضح طور پر نہیں دیکھا۔" وہ الجھ گئی۔

"لیکن تمہارا خیال ہے کہ وہ ساجی ہی ہے۔" میں نے اسے سہارا دیا۔

"ہاں' مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔"

"تم نے بتایا ہے کہ ساجی کی آنکھ پر کسی گہرے زخم کا نشان بھی ہے؟"

"ہاں' اس کی بائیں آنکھ پر کسی تیز دھار آلے کے زخم کا نشان بھی ہے۔"

"کیا ساجی' صفیہ کو پسند کرتا تھا؟" میں نے اچانک پوچھا۔

وہ چونک اٹھی پھر بولی۔ "آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے۔ کیا قادر بخش نے ایسی کوئی بات کی ہے؟"

میں نے اس کی لوز گیند پر ایک زبردست شاٹ کھیلا۔ "قادر بخش نہ بھی بتائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات تو پورا محلہ جانتا ہے۔ ساجی کا گھر بھی تو اسی محلے میں ہے نا۔"

میرا تیر نشانے پر لگا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "مجھے پتا ہے' اس کمینے نے یہ بات محلے میں خاصی عام کر رکھی ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے' اس نے جھوٹی بات اڑائی ہوئی ہے؟"

"نن..... ہاں۔" وہ لکنت آمیز لہجے میں بولی۔ "دلوں کا حال تو سوہنا رب ہی جانتا ہے نا تھانے دار صاحب۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس نے کوئی بات کہتے کہتے زبان پر روک لی تھی۔ میں نے کہا۔

"زینت بی بی! دلوں کا حال تو بے شک خدا ہی جانتا ہے لیکن جو حال انسانوں کو معلوم ہو' اس کی قانون سے پردہ پوشی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر تم مجھے سے تعاون نہیں کرو گی تو پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ تم مجھ سے بھلائی کی امید نہ رکھنا۔"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگی پھر بولی۔ "ایسا تو نہ کہیں تھانے دار صاحب!"

"اگر تم جھوٹ بولو گی اور سچ کو چھپانے کی کوشش کرو گی تو مجبوراً میں بھی تمہاری مدد سے ہاتھ اٹھا لوں گا۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

وہ بولی۔ "میں شرمندہ ہوں تھانے دار صاحب۔ اب میں آپ سے غلط بیانی نہیں کروں گی۔ آپ جلد از جلد میری صفیہ کو ڈھونڈ نکالیں۔"

"اس کا مطلب ہے ساجی تمہاری بیٹی صفیہ کو چاہتا تھا؟"

"وہ صفیہ کو پسند کرتا تھا اسی لیے تو اس نے اپنی ماں کے توسط سے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔"

میں نے کہا۔ "پسند کرنا اور محبت کرنا میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ صفیہ سے محبت کا دعوے دار تھا؟"

"ہاں' وہ ایسی باتیں کرتا تو تھا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "اب کسی کی زبان تو نہیں روکی جا سکتی تھی نا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

"برا ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں بعض اوقات حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے بڑے ناپسندیدہ اور تکلیف دہ سوالات بھی کرنا پڑتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "آپ شاید ساجی کو شکل سے نہیں جانتے اس لیے ایسے انداز میں سوچ رہے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"اگر میں ساجی کا صورت آشنا ہوتا تو کیا ہوتا؟"

"پھر آپ ایسا سوال نہ کرتے۔" وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "ساجی ایک کم رو اور فٹے منہ شکل صورت کا شخص ہے۔ اس کا اور صفیہ کا کوئی جوڑ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو چہرے ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا ہے۔ صفیہ جیسی نرم و نازک لڑکی کو خواب میں بھی دیکھے تو کئی راتوں کو سو نہ سکے۔"

میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی زینت بی بی۔" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے کہا۔ "وہ ڈاکو جس وقت صفیہ کو گھوڑے پر ڈال کر لے جا رہے تھے' اس وقت صفیہ نے کسی قسم کی مزاحمت کیوں نہیں کی۔ مجھے ایک گواہ ایسا نہیں ملا جس نے صفیہ کے چیخنے چلانے کی آواز سنی ہو۔ یہ ہے نا اچنبھے کی بات!"

"اس میں حیرت یا اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "صفیہ نے کسی قسم کی مزاحمت اس لیے نہیں کی کہ انہوں نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے کہا۔ "ان ظالموں نے صفیہ کو ایک کپڑا سنگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔"

"اوہ۔" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اور آپ دونوں میاں بیوی نے کوئی واویلا نہیں مچایا۔ آپ چاہتے تو محلے والے جمع ہو سکتے تھے۔ شاید ڈاکوؤں کے فرار کو ناکام بنا دیا جاتا۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے مگر آپ نہیں جانتے' اس وقت ہم کن سنگین حالات سے گزر رہے تھے۔" زینت بی بی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس ٹھگنے نے میری صفیہ کو گھوڑے پر ڈال کر بندوق اس کی کمر سے لگا دی تھی اور جاتے ہوئے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نکالی تو پھر ہمیں صفیہ کی لاش ہی ملے گی۔ ہم اپنے ہاتھوں سے جیتے جی صفیہ کو موت کے منہ میں تو نہیں دھکیل سکتے تھے نا۔"

"ہوں۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "زینت بی بی! ایک لمحے کو ہم فرض کرتے ہیں کہ وہ پستہ قامت ڈاکو ساجی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

وہ پرسوچ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اک بات خاص طور پر محسوس کی تھی' اب اس کے رویے سے جنون کا عنصر غائب ہو گیا تھا۔ اس نے اس بات پر زور نہیں دیا تھا کہ وہ واقعی ساجی ہی تھا اور ساجی کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ساجی کے بارے میں اس کا دعویٰ اس کی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ ایک شخص عمر قید کی سزا سن کر جیل پہنچ گیا تھا۔ اس واردات میں اس کے ملوث ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔ زینت بی بی چونکہ ایک ماں تھی اور اسے ساجی کی یہ دھمکی یاد تھی کہ انہیں کوئی خطرناک نتیجہ بھگتنا پڑے گا اس لیے گھوم پھر کر اس کا خیال ساجی ہی کی طرف چلا جاتا تھا۔ بہرحال' اس مرحلے پر ابھی کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی۔

میں نے زینت بی بی کو کسی گہری سوچ میں غلطاں دیکھا تو کہا۔ "بی بی' میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آیا یہ واردات کسی پرانی دشمنی کے نتیجے میں تو نہیں کی گئی؟"

میں نے یہ سوال کچھ دیر پہلے قادر بخش سے بھی کیا تھا جس کا اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔ زینت بی بی نے بھی اس کے جواب کی تصدیق کی اور بتایا کہ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

میں نے مزید دو چار سوالات کرنے کے بعد اسے فارغ کر دیا اور قادر بخش کو کمرے کے اندر بلا لیا۔ وہ میرے پاس آیا تو میں نے کہا۔ "قادر بخش! میں تمہارے گھر اور خصوصاً اس کمرے کی تفصیلی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ تمہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو میں سرچ وارنٹ بھی عدالت سے

حاصل کر سکتا ہوں۔"

"نہیں جناب' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "میرے گھر کی تلاشی کے لیے آپ کو خانہ تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا۔"

"ہاں ہاں' کہو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "جناب ڈکیتی ہمارے گھر میں ہوئی ہے۔ وہ بدبخت' نامراد ڈاکو کو میرے جگر کے ٹکڑے کو اغوا کر کے لے گئے لیکن آپ ان کو تلاش کرنے اور میری بچی کو واپس لانے کے بجائے ہمارے ہی گھر کی تلاشی لے رہے ہیں یہ تو سراسر ناانصافی ہوگی۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا اللہ مجھے معاف کرے۔ میں ناانصافی کو بہت بڑا ظلم سمجھتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "دراصل بات یہ ہے قادر بخش کہ بعض اوقات بہت معمولی سی چیز بہت مشکل اور بے چیدہ کیس کو حل کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ممکن ہے ایسی ہی کوئی اہم چیز ہمیں اس گھر سے بھی مل جائے اور جہاں تک ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے یا انہیں تلاش کرنے کا تعلق ہے تو میں نے تمہارے سامنے ہی اس سلسلے میں ایک پولیس پارٹی روانہ کی تھی جو ناکام واپس لوٹ آئی۔ جانتے ہو کیوں؟"

میں نے ایک لمحے کو رک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا' وہ خاموش نظر سے مجھے تکتا رہا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ اب تک ہمیں ان ڈاکوؤں کو چھاپنے کے لیے کوئی نکتہ یا سراغ نہیں ملا۔ آپ دونوں میاں بیوی نے بھی میرے سوالوں کے جواب میں کوئی مفید یا کام کی بات نہیں بتائی۔ پولیس والے بھی انسان ہوتے ہیں' کوئی جادوگر نہیں۔ ہم آپ لوگوں کے تعاون ہی سے کوئی کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ جب تک ہمیں ڈاکوؤں کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملے گا اس وقت تک ہم نہ تو ان تک پہنچ سکیں گے اور نہ ہی صفیہ کو بازیاب کرا سکیں گے۔ اس لیے آپ جذبات میں آنے کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں اور ہمیں بھی مثبت انداز میں کام کرنے دیں۔"

"میں نے آپ کو اشارہ دیا تو ہے۔" باہر سے زینت بی بی کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔ "میں تمہارے فراہم کردہ خطوط پر بھی غور کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

پھر ہم نے زینت بی بی اور قادر بخش کی اجازت سے پورے گھر کی تلاشی لی مگر کوئی اہم چیز ہمارے ہاتھ نہ لگ سکی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ان کے گھر سے باہر آ گئے۔ حوالدار نے تھانے والے

راستے پر قدم بڑھائے تو میں نے کہا۔

''صوبے خان!'' ابھی ایک چھوٹا سا کام باقی ہے۔''

''وہ کیا ملک صاحب؟''

صوبے خان کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ زینت بی بی نے پستہ قامت ڈاکو کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے مختصراً اسے بتایا تو وہ بولا۔

''بالکل جناب' ذرا ساجی کو بھی چیک کر لیتے ہیں۔''

''ساجی کو چیک کر لیتے ہیں؟'' میں چلتے چلتے رک گیا۔

''آپ نے اس کا نام ساجی ہی بتایا ہے نا۔ سجاول عرف ساجی۔'' حوالدار نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں' یہی نام بتایا ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''ساجی کو چیک کرنے کے لیے پہلے تم جیل جانا چاہو گے یا ڈاکوؤں کے پیچھے؟''

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے بولے۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ساجی کے گھر والوں سے ذرا ملاقات شلاقات کر لیتے ہیں۔''

''ہاں' یہ ضروری ہے۔''

ساجی کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بھی بختے والا ہی میں دو گلیاں چھوڑ کر رہتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا گھر وہاں پر تھا۔ وہ خود تو ایک سال پہلے عمر قید کی سزا پا کر جیل جا چکا تھا۔

دستک کے جواب میں ایک نو دس سالہ بچی نے دروازہ کھولا۔ اس وقت تقریباً آدھی رات ہو چکی تھی۔ دستک پر جتنی جلدی دروازہ کھولا گیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے مکین ابھی تک جاگ رہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں بیوہ ناصرہ اپنی تین بچیوں کے ساتھ رہتی تھی۔

''باہر کون ہے پتر؟'' گھر کے اندر سے کسی عورت نے دروازے میں کھڑی لڑکی سے استفسار کیا۔

''اماں! باہر دو شپائی کھڑے ہیں۔'' اس لڑکی نے سرتاپا ہمارا جائزہ لیتے ہوئے اپنی اماں کو اطلاع دی۔

دو کا لفظ اس نے اس لیے استعمال کیا تھا کہ ہم اس وقت صرف دو ہی تھے یعنی میں اور

حوالدر صوبے خان۔ دیگر سپاہیوں کو میں نے واپس تھانے بھیج دیا تھا۔

''ہائے وے میریا ربا' یہ کیا کہہ رہی ہے۔'' وہ عورت بیرونی دروازے کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ''اوتری نہ ہووے تے۔''

لڑکی نے بیزاری سے کہا۔ ''اماں' میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپے باہر آ کے دیکھ لے۔ پلیس ہمارے دروازے پر کھڑی ہے۔''

ہمیں دروازے میں استادہ لڑکی سے کوئی سوال و جواب نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دبلی پتلی عورت کی جھلک دکھائی دی۔ میں اس کے حلیے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ خاصی تیز و طرار عورت ہوگی۔ لگائی بجھائی کرنے کی ماہر۔ اس نے آتے ہی تیز لہجے میں سوال کیا۔

''کیا بات ہے جی' آپ کو کس سے ملنا ہے۔ میرے شوہر کو تو فوت ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں اور تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہارے اکلوتے بیٹے سجاول عرف ساجی سے ملنے آیا ہوں۔''

''ہن تے اودا کھیڑا چھڈ دیو پلیس والیو۔'' وہ تیز آواز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''بی بی مجھے اس علاقے میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کیا تم ناصرہ ہی ہو؟''

''ہاں' میں ناصرہ ہی ہوں۔ مرحوم عبدالغنی کی بیوہ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نئے آئے ہو اس لیے آپ کو ساجی کے بارے میں شاید پتہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے چن ورگے پتر کا بڑا دکھ ہے۔ میں سڑ کے سوا ہو گئی ہوں۔''

اولاد چاہے کیسی بھی ہو' وہ اپنی ماں کے لئے چن ورگی (چاند کے مانند) ہی ہوتی ہے۔ میں نے ناصرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارا بیٹا ایک سال پہلے قتل شتل کے جرم میں جیل چلا گیا تھا؟''

''بس جی اس کی قسمت ہی خراب تھی۔''

وہ اپنے ہونہار سپوت کے جرم کو اس بدقسمتی سے تعبیر کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل وہ جیل سے باہر آیا ہوا ہے۔ کیا وہ تم سے ملنے یہاں آیا تھا؟''

''آپ کو یہ بات یقیناً اسی پھاپا کٹنی نے بتائی ہوگی۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کس کا ذکر کر رہی ہو؟''

''میں زینت کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ لفظ زینت کو چبا کر بولی۔ ''مجھے پتہ چلا ہے' وہ کچھ دیر پہلے بڑے واضح الفاظ میں کہہ رہی تھی کہ جو ڈاکو اس کی صفیہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں' ان میں ایک میرا ساجی بھی تھا۔ وہی ہے میری اور میرے بیٹے کی دشمن۔ اس کی بیٹی تھی ہی اس قابل کہ ڈاکو لٹیرے اٹھا کر لے جاتے۔ اچھا ہوا ہم صاف بچ گئے ورنہ پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنساتی وہ ہمیں۔''

وہ دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر سے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زینت اور صفیہ کے لئے اپنے دل میں بہت عناد رکھتی تھی۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اس کے شہزادے کے رشتے کو مسترد کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساجی جیل سے باہر نہیں آیا؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ منہ بگاڑ کر عجیب سے لہجے میں بولی' سزائے تا حیات کا قیدی کس طرح جیل سے باہر آ سکتا ہے۔ زینت کو تو میرے بیٹے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ کسی حال میں اس کا پیچھا چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''بھلا کوئی شخص جیل میں سے آ کر ایک لڑکی کو اغوا کس طرح کر سکتا ہے۔ بس یہ بات میرے علم میں آئی تو میں اس کی تصدیق کے لئے آپ کے دروازے تک چلا آیا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے' آپ تو خاصے سمجھدار تھانے دار دکھائی دیتے ہیں۔'' وہ قدرے اپنائیت آمیز لہجے میں بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہم ابھی تک اس کے دروازے پر ہی کھڑے تھے' ندامت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''اوہ! میں بھی کتنی شدائی ہوں۔ آپ کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا۔ آپ اندر آ جائیں۔ بیٹھک میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

ہم اس کی پیشکش پر اس کے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ اپنی خوش اخلاقی کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے ہماری خاطر تواضع کے لیے بہت زور مارا لیکن میں نے دوٹوک انداز میں منع کر دیا۔

وہ بولی۔ ''میرا ساجی تو بہت بیبا پتر تھا۔ زینت کی لڑکی نے پہلے اپنی اداؤں سے اسے اپنا دیوانہ بنایا۔ جب ہم اس کا رشتہ لے کر گئے تو صاف انکار کر دیا۔ ساجی نے اس انکار کا بہت گہرا اثر لیا اور برے لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ پھر ایک روز اس بری صحبت نے اسے جیل کی

سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''اب دیکھ لیں' کیسی کیسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ لو بتاؤ بھلا! اگر ساجی کسی طرح جیل سے باہر آتا تو وہ سیدھا اپنی ماں کے کلیجے سے لگنے آتا یا اس منہ کالی کی حور پری کو اغوا کر کے لے جاتا۔ ان لوگوں کو تو کسی طرح چین نہیں ہے۔ ساجی باہر تھا تو اس کے دل و جگر پر اذیت ناک تیر برساتے رہے' اب وہ جیل میں ہے تو بھی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کسی طرح اس کی جان چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ خدا خود ان سے پوچھے گا۔''

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک ناصرہ کے گھر میں بیٹھے لیکن اس پوچھ تاچھ میں ایک بھی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے متذکرہ دو ڈاکوؤں کو تلاش کرنے میں مدد مل سکتی۔ زینت بی بی نے ساجی اور پستہ قامت ڈاکو کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا' وہ بعید از قیاس نظر آتے تھے اس لیے میں نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا اور حوالدار صوبے خان کے ساتھ تھانے آ گیا۔

جب میں اپنے کوارٹر میں بستر پر آ کر لیٹا تو مجھے یاد آیا' یعنی پوری شدت سے احساس ہوا کہ مجھے تو آج دن بھر بخار رہا تھا۔ فرائض کی بجا آوری میں' میں اپنی بیماری کو مطلق فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب رگ پٹھوں کو آرام دہ بستر کی آغوش میں پہنچتے ہی ایک ایک تکلیف یاد آنے لگی۔

وہ رات میں نے بڑی تکلیف میں گزاری۔ اگلے روز روزہ بھی رکھ لیا حالانکہ میں جانتا تھا' وہ پورا دن بہت مصروفیت میں گزرنے والا تھا لیکن بہر حال روزہ چھوڑنے کی میری عادت نہیں۔ الحمدللہ' اس معاملے میں مجھ پر اللہ کا بڑا کرم تھا۔ اس روزے ہی کی فضیلت اور رحمت تھی کہ وہ دن میں نے خاصا چاق و چوبند گزارہ۔

میں نے تھانے پہنچتے ہی گزشتہ رات والی واردات کی تفصیلی رپورٹ تیاری کی اور اسے ایس پی علاقہ کو بھجوا دیا۔

اگلے روز میں نے فوری طور پر بابا مراد بخش کو تھانے بلا لیا۔ مراد بابا کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ ''ساٹھا پاٹھا'' کی ایک زندہ مثال تھا۔ وہ اس عمر میں بھی عینک لگائے بغیر قرآن پاک کی تلاوت بہ آسانی کر سکتا تھا۔ پولیس کے محکمے میں بابا مراد بخش کی حیثیت ایک ماہر کھوجی کی تھی۔ مجھے امید تھی کہ ڈاکوؤں کا کھرا ابھی تک ضائع نہیں ہوگا۔ میں نے پوری بات مراد کو بتائی تو وہ بولا۔

''ملک صاحب! کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے کامیابی بھی ہو جائے گی۔''

میں کھوجی کے ساتھ دوبارہ محلہ بختے والا پہنچ گیا۔ ہمارے ساتھ اس وقت دو کانسٹیبل بھی تھے۔ میں اور مراد بابا گھوڑوں پر سوار تھے جب کہ کانسٹیبل کے پاس سائیکلیں تھیں۔ اس زمانے میں تانگے' ریڑھے' گھوڑے اور سائیکل وغیرہ پر ہی سواری کی جاتی تھی۔ جیپ اور موبائل گاڑیوں جیسی سہولتیں پولیس کو میسر نہیں تھیں۔

ہم قادر بخش کے گھر کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ تھوڑی دیر بعد قادر بخش بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''ملک صاحب! میری بچی کا کوئی سراغ ملا؟''

میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بیٹی کی تلاش ہی میں سرگرداں ہوں۔ دعا کرو' مجھے کامیابی مل جائے۔''

''آمین! اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں مراد نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ کافی دیر تک زمین کا بغور معائنہ کرتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! ڈاکوؤں کے گھوڑوں کا کھرا ابھی پوری طرح مٹا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم ان کا سراغ لگانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔'' اس نے پھر قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''گزشتہ رات کے بعد سے یہاں کسی اور نے گھوڑے وغیرہ تو نہیں باندھے۔''

قادر بخش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جناب! یہاں تو کبھی کسی نے گھوڑے نہیں باندھے اور رات کے بعد سے تو خاص طور پر اس طرف کوئی چوپایہ آیا ہی نہیں۔''

''پھر جو نشانات میری تجربہ کار نگاہ دیکھ رہی ہے' وہ یقیناً انہی ڈاکوؤں کے گھوڑے کے سموں کے ہیں۔'' مراد نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''بس تو بابا' پھر تم اپنا کام شروع کر دو۔''

''سرکار! میں تو کافی دیر پہلے اپنا کام شروع کر چکا ہوں۔''

بابا مراد اس وقت اپنے گھوڑے سے نیچے اتر چکا تھا۔ میں گھوڑے پر ہی سوار تھا اور مراد والے گھوڑے کی لگام بھی میں نے ہی تھام رکھی تھی۔ اس وقت صبح کے 10 دس بج چکے تھے۔ آسمان پر اگرچہ بادل موجود تھے لیکن چاروں جانب چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بابا مراد ماہرانہ نظر سے زمین کا معائنہ کرتے ہوئے محلہ بختے والا سے باہر نکل آیا۔ دونوں سائیکل بردار کانسٹیبل ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

ہم چاروں کا مختصر سا قافلہ شیخوپورہ موڑ تک پہنچ گیا۔ یہاں آ کر بابا مراد نے واضح طور پر اعلان کیا۔ ''ملک صاحب! کھرا بہت صاف مل رہا ہے۔ گھوڑوں کے قدموں کے نشانات سڑک کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔''

میں نے سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یعنی نشانات کا رخ لاہور کی جانب ہے؟''

''فی الحال تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔'' وہ بغور سڑک کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔

ہم بابا مراد کی راہ نمائی میں تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے تو وہ اچانک ایک جگہ رک گیا۔ ''ملک صاحب!'' اس نے زمین کو دیکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''اب ہمیں یہاں سے اپنا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب ہے مراد بابا؟''

''ملک صاحب! یہاں سے آپ کے ڈاکوؤں نے اپنا روٹ تبدیل کیا ہے۔'' بابا مراد نے کہا۔ ''اس لیے ہمیں بھی اپنے کھوج کی سمت بدلنا ہوگی۔''

جس مقام پر مراد بابا کھڑا تھا وہاں سے مین روڈ سے ایک ذیلی کچی سڑک نکلتی تھی جو کچا ایمن آباد روڈ کہلاتی تھی۔ میں نے مذکورہ سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا' کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ ڈاکو یہاں سے اس سڑک پر مڑ گئے تھے؟''

''جی' مجھے یقین ہے کہ وہ اسی سڑک پر مڑے تھے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''گھوڑوں کا کھرا بڑی واضح راہ نمائی کر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بس تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ تم آگے آگے اور ہم تمہارے پیچھے پیچھے۔''

وہاں سے ایک مرتبہ پھر بابا مراد نے زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور ہم اس کی تقلید کرتے ہوئے ریلوے پھاٹک تک جا پہنچے پھر ریلوے لائن کو کراس کرنے کے بعد ہم کنھیا لال باغ میں داخل ہو گئے۔ وہ خاصا گنجان باغ تھا۔ آم کے پیڑ پھل سے لدے ہوئے تھے۔

باغ کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم جیسے ہی باہر نکلے' اچانک دھوپ غائب ہو گئی۔ آسمان پر بادل پہلے سے موجود تھے لیکن اب جو آسمان کی طرف دیکھا تو اس کا موڈ خاصا خراب نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب تب میں بارش شروع ہو جائے گی۔

بابا مراد نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب اگر بارش ہو گئی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ڈاکوؤں کے گھوڑوں کا کھرا مٹ جائے گا اور ہماری ساری محنت پر پانی

پھر جائے گا۔"

"ہاں' کہتے تو ٹھیک ہی ہو۔" مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔

بابا مراد نے کہا "چلیں جہاں تک ممکن ہے' سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سیدھا راستہ نہر کی طرف جاتا ہے۔"

"راستہ تو سیدھا ہی ہے لیکن اگر کھرا مٹ گیا تو....." میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت بوندا باندی شروع ہوگئی۔ بابا مراد نے کہا۔ "لو جی' ہوگیا کام۔"

ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ بوندا باندی ہلکی ہی رہی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کھرا اور زیادہ واضح ہوگیا۔ اس طرح ہمارا فاصلہ زیادہ تیزی سے طے ہونے لگا لیکن اس معاون اور سازگار فضا نے زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہ دیا اور اچانک تیز بارش ہونے لگی۔

وہاں آس پاس پناہ کی کوئی جائے بھی نہیں تھی۔ اگر ہم نہر کا پل پار کر لیتے تو آگے موضع پیلی والا میں ہم بارش سے بچنے کا انتظام کر سکتے تھے۔ نہر اپر چناب کے پل تک پہنچتے پہنچتے ہم بارش میں شرابور ہو چکے تھے۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ پچھلے دو دن سے میری طبیعت خاصی خراب چلی آ رہی تھی اور گزشتہ دن تو مجھے اچھا خاصا بخار بھی رہا تھا لیکن اس وقت ایسے حالات کا سامنا تھا کہ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا سوائے اپنے گھوڑے اور سائیکلیں دوڑاتے ہوئے ہم پیلی والا پہنچ جاتے۔

انگریز بہادر کے دور کا تعمیر شدہ خوب صورت پل پار کر کے جیسے ہی ہم پیلی والا کی جانب بڑھے' ہمیں نہر کے کنارے چند افراد نظر آئے۔ وہ ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ موسم برسات کی ایک شان دار بارش میں بھیگنا تو حیرت کی بات نہیں تھی لیکن وہ جس انداز میں جمع تھے' اس نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا پھر تھوڑی دیر بعد ہی ساری صورت حال ہم پر واضح ہوگئی۔

نہر کے کنارے جھاڑیوں میں کسی شخص کی لاش پڑی تھی۔ ہمیں نزدیک آتے دیکھ کر وہ دیہاتی ایک طرف ہٹ گئے۔ اس دوران میں بارش بھی دوبارہ بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہم اس وقت سرکاری وردی میں تھے سوائے بابا مراد کے۔ اس نے تہ بند کے اوپر کلیوں والا کرتا پہن رکھا تھا۔

مذکورہ لاش کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ لاش ایک غیر معمولی دراز قامت شخص کی تھی۔ ایک

لمحے کے لیے میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے گزشتہ رات کی باتیں یاد آنے لگیں جب قادر بخش نے بتایا تھا کہ دونوں ڈاکوؤں میں ایک بہت لمبا تھا۔ کم و بیش اس کا قد سات فٹ تھا۔ یہ لاش مذکورہ ڈاکو پر فٹ بیٹھتی تھی کیونکہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ڈھاٹا موجود تھا۔

وہ لاش ایک گڑھے کے کنارے جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ وہاں اونچی گھاس اگی ہوئی تھی اور زمین خاصی گیلی ہو رہی تھی۔ لاش کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی موت سر میں لگنے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ اگر یہ ان دو ڈاکوؤں میں سے ایک تھا تو اس کا مطلب تھا کہ ہم بالکل درست کھرا نکالتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ گویا پستہ قامت ڈاکو نے اپنے دراز قد ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور خود صفیہ کو لے کر رفو چکر ہوگیا تھا لیکن دراز قد ڈاکو کا گھوڑا کہاں گیا۔

میرا ذہن اس وقت مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس وقت تک بارش رک چکی تھی اور میرا خیال ہے' اس لاش کی دریافت کی خبر بھی پیلی والا پہنچ چکی تھی کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔

میں نے وہاں پر موجود تمام افراد سے فرداً فرداً اس دراز قد شخص کے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن کسی نے بھی اسے پہچاننے کی ہامی نہیں بھری۔ وہ سب کے لیے اجنبی تھا اور اس سے پہلے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

موقع کی کارروائی مکمل کرنے میں مجھے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ غنیمت یہ ہوئی کہ بارش اس دوران میں تھمی رہی۔ میں نے ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد پیلی والا سے ایک ریڑھا منگوایا اور مذکورہ شخص کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع اسپتال بھیج دیا۔ دونوں کانسٹیبل لاش کے ساتھ ہی گئے تھے۔

"اب کیا ارادہ ہے ملک صاحب؟" بابا مراد نے پوچھا۔

"ہوں۔" میں نے پرسوچ انداز میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ "میرا مطلب ہے جناب' واپس چلنا ہے یا آگے چلیں۔"

"آگے کہاں؟"

"پیلی والا سے آگے ہندو چک ہے۔" وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور اس کے آگے ایمن آباد....."

"لیکن کھرا واقعی مٹ چکا ہے۔" بابا مراد نے کہا۔ "اب تو پوچھ پاچھ کر ہی گزارہ چلایا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ ''جب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ پیلی والا کے اندر جا کر بھی معلوم کر ہی لیں۔ ہوسکتا ہے' وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔''

''چلیں ایسا بھی کر لیتے ہیں۔''

پیلی والا بہت چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم مختلف لوگوں سے کافی دیر تک پوچھ گچھ کرتے رہے۔ دونوں ڈاکوؤں کا حوالہ دے کر اور دوسرے انداز سے بھی لیکن کوشش کے باوجود بھی ہمیں کوئی مفید بات معلوم نہ ہوسکی۔

ہم گاؤں سے باہر نکلے تو میں نے محسوس کیا کہ ایک شخص ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''کیا بات ہے' تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! پتہ نہیں یہ بات آپ کے کام کی ہے بھی یا نہیں۔''

''اس کا فیصلہ ہم خود کر لیں گے۔'' میں نے کہا ''تم کہو' جو کہنا چاہتے ہو۔''

وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ''میں آج صبح کوٹلی گنڈیاں والی سے آ رہا تھا تو میں نے نہر کے کنارے ایک تنہا گھوڑے کو دیکھا تھا۔''

''اچھا۔'' میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے اور تنہا گھوڑے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

وہ بولا۔ ''جناب! میرا نام فضل کریم ہے۔ میں پیلی والا ہی کا رہنے والا ہوں۔ ادھر کوٹلی گنڈیاں والی میں میری بہن رہتی ہے۔ میں ایک روز پہلے اسی کے پاس گیا ہوا تھا۔ واپسی پر مجھے وہ گھوڑا نظر آیا تھا۔ تنہا گھوڑے سے میری مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ سوار نہیں تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ گھوڑا کسی ایک جگہ رکا ہوا تھا یا چل رہا تھا؟''

''جناب وہ آہستہ قدموں سے چل رہا تھا۔''

''اس کا رخ کس جانب تھا؟''

''وہ کوٹلی گنڈیاں والی کی طرف جا رہا تھا۔''

''ہوں۔'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''تم نے اس گھوڑے کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور کوئی غیر معمولی بات جانتے ہو؟''

وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسے فارغ کر دیا۔ بابا مراد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ کا اس گھوڑے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''زیادہ امکان تو اسی بات کا ہے کہ وہ گھوڑا اس لمبو ڈاکو کا ہوسکتا ہے جس کی لاش تھوڑی دیر پہلے ہم ضلع اسپتال بھجوا چکے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' بابا مراد بولا۔ ''یہاں سے نہر کے کنارے کنارے یا تو ہم کوٹلی گنڈیاں والی کی طرف جا سکتے ہیں یا پھر دوسری سمت کھیالی کی جانب۔ اگر وہ گھوڑا واقعی اس مقتول ڈاکو کا ہے تو اس نے کوٹلی گنڈیاں والی کا رخ کیوں کیا' یہ بات قابلِ غور ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے بابا مراد میری جانب دیکھنے لگا۔

میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں' تم کس زاویے سے سوچ رہے ہو۔ اگرچہ تمہاری بات میں وزن ہے لیکن میں مکمل طور پر تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا اگر گھوڑے نے کوٹلی گنڈیاں والی کا رخ کیا ہے تو اس کا تعلق اسی گاؤں سے ہوسکتا ہے؟''

''منطقی طور پر بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔''

''ہاں' بظاہر یہی ظاہر ہوتا ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن اس بات کے بھی قوی امکانات ہیں کہ جانور کا منہ جس طرف اٹھا وہ اسی طرف چل دیا۔''

''لیکن وہ کھیالی کی طرف بھی تو جا سکتا تھا؟'' بابا مراد اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ ''اس نے کوٹلی گنڈیاں والی ہی کا رخ کیوں کیا؟''

میں نے کہا۔ ''اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دراز قد ڈاکو کی لاش جس مقام پر پائی گئی ہے وہ نہر کے پل سے اس جانب واقع ہے جس طرف سے نہر آ رہی ہے۔ یعنی نہر کی بالائی جانب..... اور اسی سمت میں موضع کوٹلی گنڈیاں والی ہے۔ نہر کا بہاؤ کوٹلی گنڈیاں والی سے کھیالی کی جانب ہے اور اس طرف جانے کے لیے گھوڑے کو پہلے سڑک عبور کرنا پڑتی یعنی پل کی دوسری طرف جانا پڑتا۔''

''میں آپ کے دلائل کو رد نہیں کروں گا۔'' مراد بابا نے کہا۔ ''لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہے۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میرا خیال ہے' ہمیں کوٹلی گنڈیاں والی کا بھی ایک چکر لگا لینا چاہیے۔''

''چلو تم کہتے ہو تو یہ بھی کر لیتے ہیں۔''

ہم اپنے اپنے گھوڑوں کو چلاتے ہوئے کوٹلی گنڈیاں والی کی طرف بڑھنے لگے نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم اپنے مطلوبہ گاؤں پہنچ گئے۔ پیلی والا کے خود یک پائی جانے والی دراز قد ڈاکو کی لاش کی خبر ابھی تک کوٹلی گنڈیاں والی تک نہیں پہنچی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہمیں مذکورہ گھوڑے کا سراغ مل گیا۔ پوچھ گچھ پر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ گھوڑا اس وقت سرور علی کی بھینسوں کے ساتھ اس کے باڑے میں بندھا ہوا ہے۔

سرور علی ایک عام سا دیہاتی تھا۔ کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کر رہا تھا۔ ہم سیدھے اس کے پاس پہنچ گئے۔ سرور علی کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے گھوڑے کو لاوارث سمجھ کر اپنے باڑے میں باندھ دیا تھا۔

''جناب' میں نے یہ گھوڑا کہیں سے چوری نہیں کیا۔'' وہ خاصا سہما ہوا تھا۔ ''بس نہر کے کنارے مل گیا اور میں اسے ساتھ لے آیا۔ آپ سب سے پوچھ سکتے ہیں' میں نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا کہ جس کا گھوڑا ہو وہ آ کر لے جائے۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں' ہمیں معلوم ہو چکا ہے تم نے جو اعلان کر رکھا ہے' اسی لیے تو ہم سیدھے تم تک پہنچے ہیں۔''

''جناب! اگر یہ گھوڑا آپ کا ہے تو آپ لے جائیں۔'' وہ ڈرے سہمے انداز میں بولا۔ ''میں نے اس کا اچار نہیں ڈالنا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ گھوڑا ہمارا تو نہیں ہے لیکن ہم اسے ساتھ ضرور لے جائیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی جناب۔ میں قانون سے متھا تو نہیں لگا سکتا۔''

وہ خاصا سیدھا سادہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوچا' اس سے کچھ معلوم کرنا چاہیے۔ میں نے کہا۔ ''سرور علی! تم مجھے خاصے سمجھ دار اور ایمان دار دکھائی دیتے ہو۔ میں جو کچھ پوچھوں اس کا سچ سچ جواب دینا۔''

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''جناب! اگر میں جھوٹ بولوں تو اسی وقت زمین میں دھنس جاؤں۔ آپ پچھیں جی۔ میں آپ کو ایک ایک بات سچ سچ بتاؤں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم اس گاؤں میں کب سے رہ رہے ہو؟''

''سرکار' یہیں کا جم پل ہوں۔''

''یہاں کے تمام لوگوں سے واقف بھی ہو گے؟''

''ایک ایک بچے سے واقف ہوں مائی باپ۔''

میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''سرور علی! ذرا سوچ کر بتاؤ۔ اس گاؤں میں کوئی ایسا شخص بھی رہتا ہے جو قد بت میں پورا پہاڑ نظر آتا ہو یعنی پورا سات فٹ کا؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سرکار' فٹوں کا حساب تو میں لگا نہیں سکتا لیکن اس گاؤں کے سب سے اچھے لمبے آدمی کو ضرور جانتا ہوں۔ ملک سردار علی یہاں کے سب سے دراز قد آدمی ہی جناب۔''

''کیا وہ اس وقت گاؤں میں موجود ہیں؟''

''جی ہاں' ہونا تو چاہیے۔'' وہ پر وثوق لہجے میں بولا۔ ''وہ سامنے ان کا ڈیرا ہے۔''

ہم سرور علی کی رہنمائی میں ملک سردار کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ملک سردار وہاں کا ایک آسودہ حال زمیندار تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اس سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک معقول آدمی تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ یہی کوئی دو انچ اوپر ہو گا۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں ہماری آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔

ہم نے اسے مختصراً تمام حالات بتا دیے۔ اس نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس گاؤں میں تو پچھلے تیس سال سے ایسا کوئی شخص نہیں پایا گیا جیسا حلیہ آپ نے بتایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اس پستہ قامت ڈاکو کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اتنے چھوٹے قد کا کوئی آدمی بھی میں نے آج تک یہاں نہیں دیکھا۔'' ملک سردار نے بتایا۔ ''آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں کا ہر آدمی دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آپ نے جن دو ڈاکوؤں کے قد بت اور حلیے کا ذکر کیا ہے ویسے آدمیوں کا اس گاؤں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔''

میں نے کہا۔ ''دراز قد ڈاکو کی لاش تو میں نے ضلع اسپتال پہنچا دی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنے پستہ قامت ساتھی کی گولی سے ہلاک ہوا ہے۔ اب مجھے اسی ڈاکو کی تلاش ہے۔''

''آپ چاہیں تو اس گاؤں کے گھر گھر کی تلاشی لے لیں۔'' ملک سردار نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر یہاں ایسا کوئی واقعہ ہوا ہوتا تو مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔ پھر آپ تو بتا رہے ہیں۔ وہ ڈاکو بخشے والا سے ایک نوجوان لڑکی کو بھی اغوا کر کے لائے ہیں۔''

''یہ اغوا اور ڈکیتی کی واردات ہے۔'' میں نے کہا۔

ملک سردار نے کہا۔ ''ویسے تو مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا مطلوبہ ڈاکو کسی نوجوان لڑکی کو

اغوا کر کے ہمارے گاؤں تک نہیں پہنچا پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے معلومات کروالیتا ہوں۔"

پھر اس نے ایک ملازم صورت شخص کو آواز دی۔ "اوئے فیکے' ذرا نس کے جا اور چاچا برکت کو بلا لا۔"

فیکے کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ملک صاحب! یہ اپنا چاچا برکت ہے نا' اسے آپ گاؤں کی دائی اماں سمجھ لیں۔ ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد کی خبر رکھتا ہے۔ بڑا چلتا پرزہ ہے جناب۔ اپنے گاؤں کی کیا بلکہ اسے تو آس پاس کے گاؤں کی بھی تازہ ترین خبریں معلوم ہوتی ہیں۔"

"پھر تو یہ بہت کام کا بندہ ہے سردار صاحب۔"

ہم باتیں کر رہی رہے تھے کہ فیکا چاچا برکت کو لے کر آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی برکت چونکا لیکن گھبرایا بالکل نہیں۔ وہ سیدھا ملک سردار کے پاس پہنچا اور کہا۔ "جی ملک صاحب! آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔"

"برکت ایک صحت مند اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ملک سردار علی نے مختصراً اسے بتایا کہ ہم کس سلسلے میں وہاں گئے تھے۔ وہ پوری توجہ سے ملک سردار کی بات سنتا رہا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہمارے گاؤں میں ایسا کوئی گھڑ سوار ڈاکو نہیں پہنچا جس کے ساتھ کوئی نوجوان لڑکی بھی ہو۔ ویسے میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" وہ اب مجھ سے مخاطب تھا۔ "آپ جب پیلی والا کے پاس موقع کی کارروائی میں مصروف تھے تو میں بھی اس وقت وہیں تھا۔ آپ اطمینان رکھیں تھانے دار صاحب' ہمارے گاؤں کا کوئی آدمی ڈاکوؤں سے کوئی تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے بھی اس ڈاکو کی لاش جھاڑیوں میں پڑی دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ قطعی اجنبی تھا۔ البتہ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی کہ سرور علی کو جو لاوارث گھوڑا ملا تھا وہ گھوڑا اسی ڈاکو کا تھا جس کی لاش آپ نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی تھی۔"

میں نے کہا۔ "چاچا برکت! مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"حکم کرو سرکار' ہم نے تو ہمیشہ تعاون کیا ہے۔" برکت کے بجائے ملک سردار علی نے کہا۔

"پھر آپ تو ہماری ہی برادری کے ہیں۔ آپ سے تعاون کر کے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ جناب کا۔" میں نے ملک سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خوش دلی سے بولا۔ "ملک صاحب! آپ حکم کریں' ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں..... اور ہاں یہ "شکریہ" وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ وہ پستہ قامت ڈاکو یہیں کہیں آس پاس کے کسی گاؤں میں پناہ لے گا بس اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"ہوں۔" ملک سردار نے ایک گہرا ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ "اس کے حلیے کے بارے میں کچھ بتائیں گے جناب؟"

میں نے پہلے صفیہ کا حلیہ بتایا جو مجھے مغویہ کے باپ قادر بخش سے تفصیلاً معلوم ہو چکا تھا پھر پستہ قامت ڈاکو کے بارے میں صرف اتنا ہی بتا سکا کہ اس کی بائیں آنکھ پر کسی گہرے زخم کا نشان ہے۔ یہ بات مجھے زینت بی بی کی زبانی معلوم ہوئی تھی ازاں بعد قادر بخش نے اس کی تصدیق بھی کی تھی۔

پوری بات سننے کے بعد سردار علی نے چاچا برکت کی طرف دیکھا اور سوالیہ لہجے میں دریافت کیا۔ "چاچا' سمجھ گئے ہو نا؟"

"بڑی چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں آلے دوالے کے پنڈوں پر بھی نظر رکھوں گا۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی انہیں ہر گاڑی گاؤں میں ڈھونڈنے کے انتظامات تو کروں گا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کا تعاون بھی شامل حال رہا تو مجھے امید ہے' بہت جلد کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔"

"انشاءاللہ۔" ملک سردار نے تیقن سے کہا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔"

"او ملک صاحب' کچھ دیر تو اور بیٹھیں۔" ملک سردار بھی اٹھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو آپ کی خاطر تواضع بھی کرنا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے ملک جی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں روزے سے ہوں۔ خاطر تواضع ادھار رہی۔"

"اوہ اچھا اچھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "چلیں پھر روزہ کھول کر چلے جائیں۔"

"نہیں' ابھی تھانے میں بہت زیادہ مصروفیت ہے۔" میں نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انشاءاللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

ملک سردار نے ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ہم رک نہیں سکتے تھے اس لیے اس نے ہتھیار پھینک دیے۔ البتہ اس نے اصرار کر کے چوسا آموں کا ایک تھیلا ہمیں تھما دیا۔ ''میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ لیتے جائیں ملک صاحب۔ آپ پہلی بار آئے ہیں۔ میں آپ کی کوئی خدمت شدمت نہیں کر سکا۔ آپ کو خالی ہاتھ رخصت کرتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے مذکورہ آموں کا وہ تھیلا اپنے گھوڑے پر بار کر لیا پھر ہم واپس تھانے آ گئے۔ جب ہم تھانے پہنچے اس وقت عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں اب تک کی کارگزاری کی رپورٹ تیار کرنے لگا۔ دوسری صبح میں خود ایس پی صاحب سے جا کر ملا اور اس سلسلے میں ان سے خصوصی تعاون کی اپیل کی۔ انہوں نے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا۔

اسی روز میں نے سادہ لباس پولیس اہلکاروں کی مختلف ٹولیاں ترتیب دیں۔ ہر ٹولی میں تین اہلکار شامل تھے۔ آپ اسے ایک مختصر پولیس پارٹی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے انہیں تمام تفصیلات اچھی طرح سمجھانے کے بعد کھیالی' ہندو چک' ایمن آباد' پھجر والی اور آس پاس کے دیگر گاؤں کی طرف روانہ کر دیا۔ میں نے انہیں سارا طریقہ کار ذہن نشین کروا دیا تھا۔ انہیں پستہ قامت ڈاکو اور صفیہ کا کھوج لگانا تھا۔ نہایت ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دفتری کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز دراز قد ڈاکو کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ اس کی موت سر میں لگنے والی گولی سے واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سنسنی خیز خبر بھی آئی تھی۔ مذکورہ ڈاکو کی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کا نام اللہ رکھا عرف رکھو بدمعاش تھا۔ وہ کھوکھر کا رہنے والا تھا اور گزشتہ چار سال سے جیل میں تھا۔ وہ متعدد جرائم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ سب سے اہم انکشاف یہ ہوا تھا کہ چند روز قبل وہ جیل سے فرار ہوا تھا۔

یہ انکشاف ہوتے ہی کہ رکھو ایک مفرور قیدی تھا' میرے ذہن میں تیز روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ اس وقت مغویہ کی والدہ زینت بی بی کی' جنون کی کیفیت میں کہی ہوئی ایک ایک بات مجھے یاد آنے لگی۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ پستہ قامت ڈاکو اسے ساجی جیسا لگا تھا اس وقت میں نے زینت کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی پھر ازاں بعد ساجی کی ماں ناصرہ نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ ساجی ڈسٹرکٹ جیل ہی میں بند تھا اس لیے بھی میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ساجی کے جیل سے فرار کے امکان کو زیادہ

اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب رکھو کے بارے میں حقیقت جان لینے کے بعد میرا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یقیناً ساجی بھی جیل سے فرار ہو چکا ہوگا۔ اب اس کی تصدیق بہت ضروری ہو گئی تھی۔

میں نے قادر بخش کو دراز قد ڈاکو رکھو کی لاش دکھائی تھی۔ اس نے تصدیق کی تھی کہ وہی شخص اس کے گھر میں ڈاکا ڈالنے آیا تھا اور اپنے ہمراہ اس کی بیٹی کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسی روز میں نے اپنے ذرائع سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ساجی جیل سے فرار ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ چند روز قبل ڈسٹرکٹ جیل سے تین افراد فرار ہوئے تھے جن میں سجاول عرف ساجی' اللہ رکھا عرف رکھو اور یونس عرف یونا شامل تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق یہ سب کچھ جیل کے عملے کی ملی بھگت سے ہوا تھا۔ رکھو اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ساجی کو ہم پوری سرگرمی سے تلاش کر رہے تھے اور یونا سے ہمیں کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ یونا کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ وہ قلعہ دیدار سنگھ کا رہنے والا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا اور صفیہ وغیرہ کو تلاش کرنے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ میں نے سوچا اس سلسلے میں یونس عرف یونا کو بھی چیک کرنا چاہیے۔

یونا کا ایڈریس میں اپنے ذرائع سے معلوم کر چکا تھا۔ دوسرے روز میں قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا حالانکہ اس بات کی قوی امید نہیں تھی کہ ساجی صفیہ کو لے کر قلعہ دیدار سنگھ پہنچا ہوگا کیونکہ اس نے رکھو کے ساتھ جو روٹ اختیار کیا تھا وہ ایمن آباد کی طرف جاتا تھا لیکن پھر بھی چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ سجاول عرف ساجی جیل سے فرار ہو چکا تھا' میں اسی منطقی نتیجے پر پہنچا تھا کہ صفیہ کو زینت کے یقین آمیز خدشے کے مطابق ساجی ہی نے اغوا کیا تھا۔

قلعہ دیدار سنگھ میں یہ خبر تو پہنچ چکی تھی کہ یونا جیل توڑ کر فرار ہو گیا ہے لیکن اس نے اپنے علاقے کا رخ نہیں کیا تھا۔ باخبر ذرائع کے مطابق میں نے تسلی کر لی کہ یونا قلعہ دیدار سنگھ نہیں پہنچا تھا۔

ویسے بھی مجھے یونا سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بس ایک ضمنی امکان کی خاطر میں اسے چیک کرنے گیا تھا تاہم قلعہ دیدار سنگھ کے متعلقہ تھانے کے انچارج کو پوری صورتِ حال بتانے کے بعد میں نے تعاون کی درخواست کی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ جیسے ہی یونا کی کوئی خبر ملی یا اس کے حوالے سے ساجی وغیرہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا' وہ فوراً مجھے اطلاع دے گا۔

آئندہ تین روز خاموشی سے گزر گئے۔

چوتھے روز چاچا برکت تھانے آیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اہم اطلاع لایا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''پہلے تو میں آپ کو ملک سردار صاحب کا سلام پہنچا دوں۔'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''وہ آپ کو بہت یاد کر رہے تھے۔''

''بھئی وعلیکم السلام۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چاچا برکت سے پوچھا۔ ''بیٹھو اور اطمینان سے بتاؤ' تم کیا اہم اطلاع لائے ہو؟''

وہ زیر لب مسکرایا اور بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ''جناب' میں ایک پرتقصیر بندہ ہوں۔ نماز روزے سے بہت دور۔ اتنی گرمی میں پینڈا کر کے آیا ہوں۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلایا اور چاچا برکت کے لیے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لانے کا حکم دے دیا۔ اگرچہ برکت کا یہ انداز مجھے قدرے ناگوار گزرا تھا تاہم اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس سے نرمی کا برتاؤ کروں۔

ایک کے بعد دوسرا پانی کا گلاس حلق سے اتارنے کے بعد برکت نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور بولا۔ ''ملک صاحب! موضع ہندو چک کے بارے میں' میں آپ کو ایک خاص خبر دینے کے لیے آیا ہوں۔''

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم شروع ہو جاؤ۔''

برکت نے بتایا۔ ''میں نے اپنے ذرائع سے پتہ چلایا ہے کہ کچھ روز پہلے ہندو چک کے ایک ڈیرے پر کوئی ڈھاٹا پوش گھڑ سوار آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ انہوں نے وہاں رات گزاری تھی۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ برکت چاچا واقعی بہت اہم خبر لایا تھا۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''پھر..... کیا وہ اب بھی وہیں پر موجود ہیں؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ وہ دوسری صبح وہاں سے چلے گئے تھے۔'' ایک لمحے کو خاموش ہو کر اس نے اضافہ کیا۔ ''اس بارے میں دو رائے پائی جاتی ہیں۔ ایک خیال کے مطابق دوسرے روز صبح وہ گھڑ سوار اکیلا ہی وہاں سے رخصت ہوا تھا اور دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ نوجوان لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہوئی تھی۔''

''یہ دونوں خیال یا آرا کس کی ہیں؟''

برکت نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔ ایک لمحے کو تامل کرنے کے بعد اس نے بتایا۔ ''یہ دونوں خیالات میں نے خود قائم کیے ہیں۔ اپنی تفتیش کے بعد۔ میں خود ہندو چک گیا تھا۔''

''پھر تم کس نتیجے پر پہنچے۔'' میں نے سادے سے لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب ہے' تمہیں اپنا کون سا خیال ٹھیک لگا؟''

وہ بولا۔ ''میں اس ڈیرے پر موجود شخص سے بھی ملا تھا۔ اس کا نام خوشی محمد ہے۔ خوشی محمد کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ان دونوں نے وہاں رات گزاری تھی اور وہ گھڑ سوار خوشی محمد کا دیرینہ شناسا تھا جبکہ خوشی محمد کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ نوجوان لڑکی اس کی بیوی تھی یعنی گھڑ سوار کی بیوی۔ ایک رات ڈیرے پر گزارنے کے بعد وہ دوسری صبح واپس چلے گئے تھے۔''

''کہاں واپس چلے گئے تھے؟''

برکت نے بتایا۔ ''خوشی محمد کے مطابق انہیں بختے والا جانا تھا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میں آپ کو وہی بتا رہا ہوں جو خوشی محمد سے مجھے پتہ چلا ہے۔'' برکت چاچا نے ایک ایک بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''گھڑ سوار نے خوشی محمد کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے میکے ایمن آباد سے لے کر آ رہا تھا اور اب اپنے گھر بختے والا جانا چاہتا تھا۔''

''یہ تو بالکل الٹا چکر ہی ہو گیا۔'' میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں' مجھے بھی کوئی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔'' برکت بولا۔ ''یا تو خوشی محمد غلط بیانی سے کام لے رہا ہے یا پھر گھڑ سوار ہی نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ آپ خود خوشی محمد سے مل کر معلومات حاصل کر لیں۔''

''خوشی محمد کے پاس تو میں ابھی اور اسی وقت جاؤں گا۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا پھر برکت سے پوچھا۔ ''اور تمہارے دوسرے خیال کی وجہ کیا ہے یعنی یہ کہ وہ گھڑ سوار دوسری صبح اکیلا ہی وہاں سے رخصت ہوا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! چونکہ کسی بھی شخص نے صفیہ نامی اس نوجوان لڑکی کو گھڑ سوار کے ساتھ جاتے ہوئے نہیں دیکھا اس لیے میں نے خیال کیا شاید وہ اکیلا ہی گیا ہو۔''

''تم بعض اوقات بہت الجھی ہوئی باتیں کرنے لگتے ہو برکت علی۔'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ان پڑھ ہوں نا سرکار اس لیے۔ آپ کی طرح پڑھا لکھا ہوتا تو ڈھنگ سے بات کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا۔ بس گزارہ چلائیں جناب۔ مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ ملک سردار علی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو یہ اطلاع دے کر فوراً واپس آ جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''میری طرف سے ملک صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا اور انہیں میرا سلام بھی کہنا۔''

''ٹھیک ہے جناب! اب میں جاؤں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر کے بعد اے ایس آئی اسلم باجوہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے برکت کے جانے کے بعد اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم فوری طور پر ہندو چک روانہ ہو جائیں۔ وہاں پر پہلے ہی ہمارے تین اہلکار سادہ لباس میں موجود تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کی طرف سے ابھی تک کوئی مفید اطلاع تھانے نہیں پہنچی تھی۔

پوری بات سننے کے بعد اسلم باجوہ نے کہا۔ ''ملک صاحب! ہندو چک ہم کس طرح جائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''تھانے میں گھوڑے تو موجود ہوں گے نا؟''

''صرف ایک ہے۔'' اس نے جواب دیا

''اوہ!'' میں کچھ سوچنے لگا۔

اے ایس آئی نے کہا۔ ''ملک صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو تانگے وغیرہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اس وقت مجھے خیال ظاہر کرنے کی فرصت نہیں ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''بس تم جلد از جلد ہندو چک پہنچنے کا انتظام کرو۔ گھوڑے' سائیکلیں' تانگا یا ریڑھا' کچھ بھی دیکھ لو۔ مغویہ صفیہ اور ساجی ڈاکو کا ایک موہوم سا سراغ ملا ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں وہاں پہنچنا چاہیے۔''

کچھ دیر بعد اے ایس آئی ایک تانگا پکڑ لایا۔ تانگا بان کا نام دلاور تھا اور اس کے تانگے

میں ایک صحت مند گھوڑا جتا ہوا تھا۔ میں نے دلاور کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہندو چک آنے اور جانے کے کتنے پیسے لو گے؟''

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے قدرے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو احمق۔ میں نے ایسی کون سی عجیب بات کہہ دی ہے؟''

وہ لکنت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ''اب ..... ابھی ..... آ ..... آ ..... آپ نے کرائے کے بارے میں ہی پوچھا ہے نا۔''

''ہاں ہاں' تم اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''مائی باپ حیران اس بات پر ہو رہا ہوں کہ آج پہلی مرتبہ کسی پولیس والے نے مجھ غریب سے کرائے کے بارے میں پوچھا ہے ورنہ تو آپ لوگ دھڑلے سے تانگے میں سوار ہوتے ہو اور جہاں جانا ہو وہاں کا نام بتا کر حکم چلاتے ہو۔ بس حکم چلاتے ہو۔''

اس کی معصومانہ بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''دلاور! پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

''آپ کو دیکھ کر تو یہی لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کسی شخص کے انفرادی فعل کی وجہ سے پورے ڈیپارٹمنٹ کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔''

''اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں۔'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ میں نے اجازت دے دی تو اس نے کہا۔ ''جناب' یہاں تو پورا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ آپ پہلے آدمی مجھے نظر آئے ہیں جو تھانے دار ہونے کے باوجود بھی مجھ سے کرائے کی بابت پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے دلاور سے بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کہا۔ ''ہاں بھئی' میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔''

میں نے ہندو چک آنے جانے کا کرایہ پانچ روپے ٹھہرا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دلاور کو بتا دیا تھا کہ وہاں کچھ دیر بھی لگ سکتی ہے۔ وہ تو خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ بولا۔ ''جناب! پانچ روپے میں تو میں پورے پانچ دن بھی آپ کی خدمت میں رہ سکتا ہوں۔''

ہم ہندو چک پہنچے تو اس وقت دس بج چکے تھے۔ اس روز برکت چاچا صبح ہی صبح تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ چونکہ آج اسے گاؤں میں بہت زیادہ کام تھا اس لیے ملک سردار علی نے جلد ہی اسے واپس آنے کو بھی کہا تھا۔

خوشی محمد کے ڈیرے تک پہنچنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ ڈیرا گاؤں سے ذرا ہٹ کر باہر بنا ہوا تھا۔ دراصل وہ ڈیرا چوہدری حق نواز کا تھا اور خوشی محمد چوہدری کا ملازم تھا جو ڈیرے پر رہتے ہوئے کاشتکاری کے مختلف امور کی نگرانی کرتا تھا۔

خوشی محمد اس وقت ڈیرے میں موجود تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال ہوگی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی گھبرا گیا اور ڈیرے کے اندرونی حصے کی جانب جانے لگا۔ میں نے اسے تیز آواز میں پکارا۔

''اوئے رک جاؤ۔''

وہ رک گیا اور سراسیمہ نظر سے ہمیں دیکھنے لگا۔ اس وقت ہم باقاعدہ وردی میں تھے۔ میں نے کڑک کر پوچھا۔ ''تم ہی خوشی محمد ہو؟''

''جی' میں ہی خوشی محمد ہوں۔'' وہ منمنایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے خوشی محمد' تم نے کیا جرم کیا ہے؟''

''سرکار' میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔''

''پھر ہم پر نظر پڑتے ہی تم اندر کی جانب کیوں کھسک رہے تھے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارا انداز ایسا تھا جیسے تم ہم سے ڈر کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیوں؟''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''سچ سچ بتا دوں۔''

''ہاں ہاں' بتاؤ۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''سرکار!'' خوشی محمد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دراصل میں آپ کی وردی دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ سنا ہے پولیس والے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔''

''یہ تم نے کس سے سن لیا خوشی محمد۔'' میں نے کہا۔ ''پولیس کا کام تو خطرناک لوگوں کو گرفتار کر کے جیلوں تک پہنچانا ہے۔''

وہ بولا۔ ''جناب' میں تو یہی جانتا تھا کہ پولیس والوں سے ڈرنا چاہیئے۔''

میں نے کہا۔ ''خوشی محمد! چوروں اچکوں اور بدمعاشوں کو واقعی ہم سے ڈرنا چاہیے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو' شریف آدمیوں کو ہماری وردی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا پھر بولا۔ ''جناب! میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

''یہ بھی پتہ چل جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ذرا ہمارے بیٹھنے کا تو

انتظام کرو۔''

وہ پیپل کے ایک درخت کے نیچے چارپائیاں بچھانے لگا۔ میں طائرانہ نگاہ سے ڈیرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ وسیع و عریض صحن والا ایک ڈیرا تھا جس میں جا بجا درخت لگے ہوئے تھے۔ ڈیرے کے پچھلے حصے میں تین نیچی چھتوں والے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ڈیرے کی مغربی دیوار کے ساتھ چارا کترنے والا ٹوکا نصب تھا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ اینٹوں کی پختہ کھرلیوں پر چند مویشی بندھے ہوئے تھے۔

خوشی محمد چارپائیاں بچھا چکا تو میں نے کہا۔ ''خوشی محمد' بیٹھیں گے تو ہم بعد میں اطمینان کے ساتھ۔ پہلے ذرا میں ان کمروں کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔'' پھر میں نے ڈیرے کے پچھے حصے میں بنے ہوئے کمروں کی جانب اشارہ کیا جن میں سے دو کے دروازے بند تھے۔

میری بات سن کر خوشی محمد کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ نظر چراتے ہوئے بولا۔ ''آپ ان کمروں میں کیا چیک کرنا چاہتے ہیں؟''

''بس معمول کی کارروائی سمجھ لو۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کون سا جرم کیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے ان کمروں کی جانب قدم بڑھا دیے۔ سب سے پہلے میں نے اس کمرے میں جھانکا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ درمیانے سائز کا ایک عام سا کمرہ تھا۔ اندر تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر ڈبی دار کھیس بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ ایک طرف دیوار میں طاق سا بنا ہوا تھا جس میں تیل کی بوتل' ایک عدد کنگھا اور ایک چھوٹے سائز کا آئینہ بھی نظر آ رہا تھا۔

میں نے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لیا پھر چارپائیوں کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں مجھے جست کا ایک ٹرنک رکھا نظر آیا۔ میں نے خوشی محمد سے کہا۔ ''اسے کھول کر دکھاؤ۔''

خوشی محمد نے ٹرنک کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''سرکار! آپ کو کس چیز کی تلاش ہے؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جستی ٹرنک کے اندر کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض چیز موجود نہیں تھی۔ چند جوڑی کپڑے کے علاوہ ایک دھاری دار رومال اور دو بنیانیں تھیں۔

میں اس کمرے سے باہر نکل کر بند دروازوں والے کمروں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا پھر خوشی محمد سے پوچھا۔ ''ذرا یہ کمرے تو کھول کر دکھاؤ خوشی محمد۔''

''ان کمروں میں کوئی خاص چیز نہیں ہے جناب۔'' خوشی محمد نے کہا۔ ''فضول سا سامان ہوا ہے ان کے اندر۔''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں وہی فضول سامان دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے خوشی محمد نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک گزرا ہو پھر اپنی ڈب میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر وہ مقفل کمرے کھول کر ہمیں دکھانے لگا۔

ایک کمرے کے اندر خشک چارے کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف زرعی آلات' خالی بوریاں' ٹوٹی ہوئی دو چارپائیاں وغیرہ پڑی تھیں ان دونوں نیم تاریک کمروں میں سیلن کی وجہ سے خاصی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں کمروں کے سامان کا تنقیدی جائزہ لیا پھر خوشی محمد سے کہا۔ ''تم اب ان کمروں کو دوبارہ بند کر دو اور ہمارے پاس پیپل کے نیچے آ جاؤ۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی میں پیپل کے نیچے بچھی چارپائیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اے ایس آئی اسلم باجوہ میرے ساتھ ہی تھا۔ خوشی محمد نے دونوں کمروں کو دوبارہ مقفل کرنے کے بعد چابیوں کا گچھا اپنے تہ بند کی ڈب میں رکھا اور ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خوشی محمد! اب میں تم سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم ان کے ٹھیک ٹھیک جواب دو گے؟''

وہ بولا۔ ''جناب! میں نے اب تک ایک بھی جھوٹ نہیں بولا اور آئندہ بھی نہیں بولوں گا۔ آپ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اگر تم جھوٹ نہیں بولو گے تو اپنے حق میں اچھا ہی کرو گے ورنہ تم جانتے نہیں کہ دروغ گوئی کرنے والوں کے ساتھ ہم کیسا سلوک کرتے ہیں پھر تمہارا چوہدری حق نواز بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔''

''آپ چوہدری صاحب کو بھی جانتے ہیں؟'' وہ چونکا۔

''میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم چوہدری کے پاس کب سے ملازم ہو؟''

''جناب' دس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم یہاں اکیلے ہی رہتے ہو۔ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟''

''میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔'' خوشی محمد نے بتایا۔ ''اس لیے بچوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس جی چھڑا چھانٹ ہوں۔ اللہ کا شکر ہے' روزی روٹی کا مسئلہ چوہدری صاحب حل کر دیتے ہیں۔ باقی مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''چند روز قبل تمہارے پاس دو مہمان آئے تھے؟'' اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے واضح طور پر اس کا چہرہ متغیر نظر آیا۔

وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''مہم..... مہمان.....!''

میں نے سرزنش آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے وعدہ کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولو گے۔''

''جی..... جی مہمان آئے تھے میرے پاس۔''

میں نے کہا۔ دو مہمان!''

''جی' وہ دو ہی تھے۔''

''ایک مرد اور ایک عورت۔''

''جی بالکل۔''

''کون تھے وہ لوگ۔'' میں نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے' ان کے نام کیا تھے اور وہ کہاں سے آئے تھے؟''

خوشی محمد نے بتایا۔ ''وہ میرا ایک پرانا دوست سجاول تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔''

خوشی محمد کے منہ سے سجاول کا نام سن کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یعنی زینت کا شبہ صد فی صد درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''تمہارے دوست سجاول یعنی ساجی کی بیوی کا نام کیا تھا؟''

میں نے دانستہ سجاول کے ساتھ ساجی کا لفظ بھی استعمال کیا تھا تاکہ خوشی محمد کے چہرے پر اس لفظ کا ردِعمل دیکھ سکوں۔۔ خوشی محمد کے رویے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اسی سجاول کا ذکر کر رہا تھا جو عرف عام میں ساجی کہلاتا تھا۔ اس سے شک یقین میں بدل گیا۔

خوشی محمد نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''اپنی بیوی کا نام اس نے زرینہ بتایا تھا۔''

یہاں ذرا سا تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ ساجی نے جس لڑکی کو اغوا کیا تھا اس کا نام صفیہ تھا۔ میں

نے سوچا' ممکن ہے ساجی ہی نے خوشی محمد کو صفیہ کا نام زرینہ بتایا ہو۔ میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اور دوسرے روز صبح ہی صبح وہ دونوں ڈیرے سے چلے گئے تھے؟''

''جی وہ دونوں چلے گئے تھے۔''

''سوچ لو' کہیں تمہیں غلطی تو نہیں لگ رہی۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ دونوں ہی دوسری صبح رخصت ہو گئے تھے؟''

وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے قدرے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''جی جناب وہ دونوں ہی چلے گئے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے ان سے پوچھا تھا' وہ کہاں سے آئے تھے اور کس طرف جا رہے تھے؟''

''جناب وہ ایمن آباد سے آئے تھے اور محلہ بخشے والا جا رہے تھے۔ ایمن آباد میں ساجی کی سسرال ہے۔ اس کی بیوی بیمار تھی جسے وہ اپنے گھر لے کر جا رہا تھا۔''

''کیا بیماری تھی اس کی بیوی کو؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''ساجی نے بتایا تھا کہ زرینہ کو بے ہوشی کے دورے پڑتے ہیں۔ یہاں بھی وہ پوری رات بے ہوش ہی رہی تھی۔''

مجھے یاد آ گیا کہ ساجی نے ایک مخصوص رومال سنگھا کر صفیہ کو اغوا کیا تھا۔ اس کی بے ہوشی کو راز میں رکھنے کے لیے ساجی نے خوشی محمد کو صفیہ کی بیماری کی فرضی کہانی سنائی ہوگی لیکن خوشی محمد بے چارے کے پاس اس کی بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ساجی نے خوشی محمد کو ایک اور چکر بھی دیا تھا۔ اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی سسرال یعنی ایمن آباد سے آ رہا تھا حالانکہ وہ محلہ بخشے والا سے صفیہ کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور سسرال وغیرہ کا سوال۔ ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے خوشی محمد سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری زرینہ سے کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''جناب' میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ زرینہ (صفیہ) پوری رات بے ہوش ہی رہی تھی۔''

مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ساجی چند روز قبل ڈسٹرکٹ جیل سے فرار ہوا تھا اور ایک سال پہلے وہ عمر قید کی سزا پا کر جیل گیا تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے خوشی محمد

سے سوال کیا۔

''خوشی محمد' ساجی سے تمہاری دوستی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں جی۔'' وہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بولا۔

''آخری مرتبہ تم ساجی سے کب ملے تھے؟''

''چند روز پہلے۔''

''میرا مطلب ہے' اس ملاقات سے پہلے؟''

''وہ دو سال کے بعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔'' خوشی محمد نے جواب دیا۔ ''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس دوران میں اس نے شادی بھی کر لی تھی۔ ساجی نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان کی شادی کو دو تین ماہ ہوئے تھے۔''

''گزشتہ دو سالوں میں تمہاری ساجی سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔''

''کوئی خاص وجہ نہیں جناب۔''

''اور دوستی کے پہلے تین سال تم اکثر ملا کرتے تھے؟''

''اکثر تو نہیں جناب' بس کبھی کبھار وہی مجھ سے ملنے آ جاتا تھا۔'' خوشی محمد نے جواب دیا۔ ''میں تو بس ایک دو مرتبہ ہی بخشے والا اس کے گھر گیا تھا۔''

''تمہاری ساجی سے کس طرح دوستی ہوئی تھی؟''

''ایمن آباد کے ایک میلے میں ہماری دوستی ہوئی تھی؟''

''گزشتہ دو سال میں تم نے ایک بار بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہارا دوست کس حال میں ہے؟'' میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''بس جی مصروفیت کے باعث میں اس کی خبر نہیں لے سکا۔''

اگر خوشی محمد نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ ساجی کے تازہ ترین حالات سے آگاہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''خوشی محمد شاید تم نہیں جانتے کہ تمہارا دوست ساجی ہمیں ایک سنگین معاملے میں مطلوب ہے۔''

''جی' کیسا سنگین معاملہ؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ساجی نے چند روز قبل محلہ بخشے والا کے ایک گھر میں ڈکیتی ڈالی ہے' پانچ ہزار روپے نقد' قیمتی ملبوسات اور طلائی زیورات کے علاوہ اس نے گھر سے ایک نوجوان لڑکی کو بھی اغوا کر لیا ہے۔'' ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے کہا۔ ''اور فرار ہوتے ہوئے اپنے ایک ساتھ

رکھو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھا تو رہا ہوں۔ ذرا غور سے سنو۔ ساجی کے ساتھ اس کی بیوی زرینہ نہیں بلکہ مغویہ صفیہ تھی جسے اس نے نیند آور دوا والا رومال سنگھا کر اغوا کیا تھا اور..... تمہارے اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ اس واردات سے پہلے بھی وہ بہت سے چاند چڑھا چکا ہے۔"

پھر میں نے تفصیلاً خوشی محمد کو ساجی کے جیل جانے اور جیل توڑ کر فرار ہونے کی داستان سنائی۔ وہ غیر یقینی انداز میں میری طرف دیکھتا رہا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آخر میں میں نے کہا۔

"میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ میرے مخبر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک رات تمہارے ڈیرے پر ٹھہرا تھا۔"

"وہ میرے ڈیرے پر ٹھہرا ضرور تھا لیکن آپ نے اس کے بارے میں جو باتیں بتائی ہیں میں ان سے مطلق آگاہ نہیں تھا۔" خوشی محمد کی آواز اس کے حلق میں اٹک رہی تھی۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے چوٹ لگائی۔ "خوشی محمد! تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے وہ دونوں دوسری صبح واپس چلے گئے تھے۔ ساجی نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ بچے والا جا رہے ہیں۔ یہی کہا ہے نا تم نے؟"

"جی وہ دونوں ہی چلے گئے تھے۔" اس نے دوبارہ تصدیق کی۔

میں نے سنناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن خوشی محمد! مجھے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ساجی صبح اکیلا ہی یہاں سے گیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کسی نے غلط بتایا ہوگا جی۔ وہ دونوں ہی صبح چلے گئے تھے۔"

"اگر بعد میں تمہاری بات جھوٹی ثابت ہوئی تو یاد رکھنا' میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "صرف یہی بات نہیں بلکہ تمہارے بیان کا کوئی بھی حصہ اگر ناقص ثابت ہوا تو میں تمہیں سخت سے سخت سزا دوں گا۔"

یہ وارننگ میں نے محض اس لیے دی تھی کہ اگر وہ کوئی بات چھپا رہا تھا تو اسے اگل دے۔

ویسے اس کے بیان سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ چاچا برکت نے ساجی کے اکیلے وہاں سے رخصت ہونے کا جو خیال ظاہر کیا تھا وہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔

ہم کچھ دیر مزید وہاں بیٹھ کر اٹھ آئے۔ خوشی محمد سے کام کی اور کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس کے ساتھ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں اے ایس آئی اسلم باجوہ کے ساتھ دلاور کے تانگے میں بیٹھ کر واپس تھانے آ گیا۔

ہندو چک کا دورہ "کامیاب یا ناکامیاب" رہا تھا۔ کامیاب ان معنوں میں کہ اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ ساجی ہی نے صفیہ کو اغوا کیا تھا اور ایک رات ہندو چک میں گزار کر وہ آگے بڑھ گیا..... اور ناکامیاب اس حوالے سے کہ یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ آگے کس طرح بڑھا تھا۔

ویسے ساجی نے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے خوشی محمد کو زبردست چکر دیا تھا۔ اس نے خوشی محمد کو بتایا تھا کہ وہ ایمن آباد کی طرف جا رہا تھا..... اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہندو چک سے نکل کر ایمن آباد ہی کی طرف گیا ہوگا۔ ایسا سوچتے ہوئے بار بار میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ خوشی محمد نے بتایا تھا کہ زرینہ (صفیہ) پوری رات بے ہوش رہی تھی۔ ایسی صورت میں دن کی روشنی میں اسے گھوڑے پر سوار کر کے سفر کرنا بڑا معنی خیز ہو جاتا۔ کیا ساجی نے واقعی ایسا کیا تھا؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں سر ابھارتا تھا لیکن اس کا جواب سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ایک بات میں جانتا تھا۔ ساجی ایک مفرور قیدی تھا اور جیل سے فرار کے بعد بھی اس نے اپنے جرائم کی فہرست میں لمبا چوڑا اضافہ کیا تھا۔ ان حالات میں اسے رات کے اندھیرے ہی میں چھپ کر سفر کرنا چاہیئے تھا۔

میں نے خوشی محمد سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آیا اس نے ساجی کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی دیکھا تھا یا اس کے پاس سامان وغیرہ کون کون سا تھا۔ خوشی محمد نے بتایا تھا کہ ساجی کے پاس ہتھیار کے نام پر صرف ایک رائفل تھی اور سامان کی ایک پوٹلی بھی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ رکھو والی رائفل اس نے راستے میں کہیں پھینک دی ہوگی اور جس پوٹلی کا خوشی محمد نے ذکر کیا تھا اس میں یقیناً پانچ ہزار کی نقدی اور صفیہ کے زیورات ہوں گے۔"

ایک بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے جن تین سادہ پوش پولیس اہلکاروں کی پارٹی ہندو چک کی نگرانی کے لیے بھیج رکھی تھی' ان سے اس روز کہیں ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اس روز ایمن آباد میں منعقد ایک میلا

دیکھنے چلے گئے تھے۔ اس غیر ذمے داری اور فرائض سے کوتاہی کی بنا پر میں نے ان تینوں کے ساتھ بہت سخت سلوک کیا تھا۔ میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو جتنی زیادہ رعایتیں دیتا تھا' اتنی ہی زیادہ سختی بھی کرتا تھا۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جیل سے فرار ہونے والے مجرموں کی تلاش بڑے زور و شور سے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ ان تینوں میں سے اللہ رکھا عرف رکھو موت کے گھاٹ اتر چکا تھا جب کہ باقی دو تا حال مفرور تھے۔ یونا میرے کیس کا حصہ نہیں تھا اس لیے میری تمام تر توجہ ساجی پر مبذول تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ساجی نے بچنے والا کارخ نہیں کرنا تھا کیونکہ وہ وہاں اتنا بڑا ''کارنامہ'' سرانجام دے گیا تھا کہ اس طرف منہ کرنا گویا خود کو چوہے دان میں پھنسانے والی بات تھی۔ مل دراصل قادر بخش کے گھر میں ہونے والی ڈکیتی کی واردات اور صفیہ کے اغوا کے سلسلے میں سرتوڑ تفتیش کر رہا تھا۔ اگر سجاول عرف ساجی میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر یہ کیس پوری طرح حل ہو جاتا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ ایمن آباد کی طرف ہی گیا ہوگا۔ اگر اس نے وہاں قیام نہ کیا تو پھر آگے کامونکی کی جانب نکل گیا ہوگا یا پھر واہنڈو میں بھی وہ پناہ لے سکتا تھا۔

حکومتی سطح پر ساجی کی تلاش کا کام تو جاری ہی تھا لیکن میں اپنے طور پر بھی اسے ڈھونڈ نکالنے کی اپنی سی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں' میں نے تمام سادہ لباس پولیس پارٹیوں کو واپس بلا لیا تھا۔ اس کے بعد چار چار سادہ لباس اہل کاروں پر مشتمل تین پولیس پارٹیاں تیار کر کے انہیں ایمن آباد' کامونکی اور واہنڈو میں پھیلا دیا۔ میں نے ان پارٹیوں کو لیڈ کرنیوالے اے ایس آئی حضرات کو خصوصی ہدایات جاری کی تھیں اور کچھ زیادہ اختیارات بھی تفویض کیے تھے۔ مجھے قوی امید تھی کہ جلد ہی کوئی مفید اطلاع مجھ تک ضرور پہنچے گی۔

جن سادہ لباس پولیس اہل کاروں نے ہندو چک میں ڈیوٹی کے دوران میں غیر ذمے دارانہ طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا' ان کو میں نے عرف عام میں کھڈے لین لگا دیا تھا۔ اب کچھ عرصے میں ان سے کوئی بھی اہم کام لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

سجاول عرف ساجی کی تلاش بڑی شد و مد سے جاری تھی۔ اس دوران میں' میں تھانے کے روزمرہ کے معمولات بھی نمٹا رہا تھا۔ قادر بخش ہر دوسرے تیسرے دن تھانے کا چکر لگا جاتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے بہت پریشان تھا۔ میں اسے ہر بار تسلی دیتا کہ بہت جلد اس کی بیٹی کو ڈھونڈ لیا جائے گا۔

یہ کوئی پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ اس وقت عید الفطر کو گزرے ہوئے بھی کافی روز ہو گئے تھے۔ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ واہنڈو کی ایک بااثر سیاسی شخصیت کی حویلی میں ساجی کی جھلک دیکھی گئی ہے۔ وہ میرے لیے ایک نہایت ہی اہم اطلاع تھی۔ میں نے صوبے خان حوالدار اور دو ہوشیار قسم کے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ساجی کی گرفتاری کی پوری تیاری کے ساتھ واہنڈو کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت ہم سادہ لباس میں تھے۔ میرے لیے یہ امر باعثِ مسرت تھا کہ حکومتی سطح پر کی جانے والی کوششوں سے پہلے ہی میں نے ساجی کو ڈھونڈ نکالا تھا۔

مجھے واہنڈو میں ساجی کی موجودگی کی جو اطلاع دی گئی تھی' وہ مبنی بر صداقت تھی۔ وہ خبیث انسان واقعی رانا ظفر اقبال کی حویلی میں موجود تھا۔ رانا ظفر اقبال واہنڈو کی ایک بااثر سیاسی شخصیت تھا اور پورے علاقے میں اس کا خاصا رعب و دبدبہ تھا۔

ہم ظفر اقبال کے مہمانوں کی حیثیت سے اس کی حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ ہماری کامیاب اداکاری کے باعث ہم پر ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کیا گیا۔ اس میں میری محنت کا بھی حصہ تھا۔ واہنڈو روانہ ہونے سے پہلے میں نے رانا ظفر اقبال اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لی تھی۔ ہماری اصلیت اس وقت کھل کر سامنے آئی جب میرے اشارے پر صوبے خان ساجی کو ہتھکڑی لگا چکا تھا۔ ساجی کو پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ پر زخم کا گہرا نشان اور بقول زینت بی بی ساجی کی فٹے منہ صورت اس کو پہچاننے کے لیے کافی تھی۔

ساجی کی گرفتاری کے موقع پر رانا ظفر اقبال نے مزاحمت کی کوشش کی تو میں نے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔

''رانا صاحب! آپ ذرا ٹھنڈے ہو کر بیٹھے رہیں اور کارِ سرکار میں مداخلت کی کوشش نہ کریں ورنہ میں آپ سے بھی سختی برتنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں اور میری ہی حویلی پر یعنی رانا ظفر اقبال کو دھمکی؟''

''یہ دھمکی نہیں بلکہ میری جانب سے آپ کو پہلی اور آخری نصیحت ہے۔'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد میں ڈائریکٹ کارروائی کروں گا۔''

''میرے خلاف کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''آپ نے اغوا اور ڈکیتی کے ایک مجرم اور مفرور قیدی کو پناہ دے رکھی ہے۔'' میں نے

کہا۔ ''کیا یہ کم سنگین جرم ہے۔ ابھی تو آپ کی حویلی سے میں نے صفیہ کو بھی برآمد کرنا ہے۔''

''آپ کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے ملک صاحب۔''

''مجھے صرف خدا کی طاقت کا اندازہ ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جوابدیا۔ ''باقی تمام طاقتیں آنی جانی ہیں رانا جی' اور ایک بات کان کھول کر سن لیں میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں یہ اطلاع دے کر اور ایس پی صاحب کے مشورے سے یہاں آیا ہوں اس لیے زیادہ اکڑ فوں دکھانے کی کوشش نہ کریں ورنہ آپ بھی خواہ مخواہ کسی لمبے چکر میں پھنس جائیں گے۔''

میں نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اور ایس پی صاحب کا تذکرہ دانستہ کیا تھا حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ میری یہ دھونس کام دکھا گئی۔ رانا ظفر اقبال دوستانہ رویے پر اتر آیا۔

''ملک صاحب! آپ تو خواہ مخواہ گرمی دکھانے لگے۔'' اس نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''آپ کا مطلوبہ بندہ آپ کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ آپ لے جائیں اسے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

اس نے اتنی تیزی سے کینچلی بدلی تھی کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ''صرف اس ایک بندے سے بات نہیں بنے گی رانا صاحب۔ میں صفیہ کی واپسی بھی چاہتا ہوں۔''

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا کیونکہ ساجی اکیلا ہی یہاں پہنچا تھا۔ صفیہ کے بارے میں اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

میں نے قہر آلود نظر سے ساجی کو گھورا۔ ''اوئے حرام کے تخم! تم نے اس بہن کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

وہ خاموشی سے زمین کو گھورنے لگا۔ حوالدار صوبے خان نے اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''بولتا کیوں نہیں سور کی اولاد۔ تم نے سنا نہیں' ملک صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟''

رانا ظفر اقبال نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! میرا خیال ہے' یہ تھانے دارانہ معاملات آپ اس کے ساتھ تھانے میں جا کر ہی نمٹائیں۔ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ میری حویلی میں یہ شور شرابا مناسب نہیں ہوگا۔''

اس کی بات بیک وقت مجھے معقول بھی لگی اور ناگوار بھی گزری۔ وہ اس حد تک تو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ تفتیش کے معاملات تھانے میں زیادہ بہتر انداز میں نمٹائے جا سکتے تھے لیکن یہ کہ وہ

ایک عزت دار آدمی تھا' اس سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔ میرے خیال میں لوگ اس کی عزت نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے تھے۔

مجھے جب یقین ہوگیا کہ صفیہ رانا ظفر اقبال کی حویلی میں موجود نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا تو ہم ساجی کو اپنے ساتھ لے کر واپس تھانے آ گئے۔ اصل مجرم ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اب اس سے مغویہ کے بارے میں معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ اگلے روز ہی اپنے سینئر افسروں کو ساجی کی گرفتاری کے بارے میں بتاؤں گا۔ دراصل میں اس رات ساجی سے وہ تمام باتیں اگلوانا چاہتا تھا جو میرے کیس سے متعلق تھیں۔

تھانے آ کر میں نے ساجی کو اپنے کمرے میں بلایا اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''دیکھو ساجی بدمعاش! میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔ اگر تم شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے سب کچھ سچ سچ بتا دو تو میں تمہارے ساتھ نرمی کا رویہ اپناؤں گا بہ صورت دیگر تم اپنے حشر کے بارے میں سوچ کر بھی کانپ اٹھو گے۔''

وہ ایک سکہ بند مجرم تھا اس لیے اتنی آسانی سے زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے مجبوراً اسے ایک خوف ناک صورت حوالدار کے حوالے کر دیا اور اسے ہدایت بھی کر دی کہ ہر قیمت پر ساجی کی زبان کھلوانا ہے اور اس کے لیے صرف دو گھنٹے میں اسے دے سکتا ہوں۔

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔'' حوالدار نے ساجی کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''دو گھنٹے تو اچھا خاصا وقت ہے۔ اتنے وقت میں تو اس کی زبان کیا' ایک ایک عضو چیخ چیخ کر اپنے جرم کا اعلان کرے گا۔''

اس کے بعد وہ حوالدار ساجی کو ٹرائل روم میں لے گیا۔ جسے عام طور پر ہم ڈرائنگ روم بھی کہتے ہیں۔ میں نے تھانے کے عملے کو خصوصی ہدایت کر دی تھی کہ ابھی علاقے میں یہ خبر نہ پھیلنے پائے کہ ہم نے ساجی کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساجی کو اپنے ساتھ لے جانے والے حوالدار کو بھی میں نے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس سے خصوصاً مغویہ صفیہ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

دو گھنٹے بعد مذکورہ حوالدار میرے پاس آیا اور بے بسی سے بولا۔ ''سر بندہ بڑا سخت جان ہے۔ ہر قسم کی سزا برداشت کر رہا ہے لیکن زبان کھولنے کا نام نہیں لیتا۔''

میں نے کہا۔ ''گویا تم اپنی ناکامی کا اعتراف کر رہے ہو؟''

''نہیں ملک صاحب۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے آدھا گھنٹا اور دے دیں۔ میں انشاء اللہ کوئی اسپیشل فارمولا آزما کر کام کی بات معلوم کر لوں گا۔ آپ مجھے ایک گھنٹہ اور دیں۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہیں آدھے گھنٹے کے بجائے مزید دو گھنٹے دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم عام فارمولا آزماؤ یا اسپیشل مجھے بس صفیہ کا پتہ درکار ہے۔''

''او کے سر۔'' وہ مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد جانے لگا تو میں نے کہا۔

''دیکھو حوالدار رستم خان! ساجی ایک مفرور قیدی ہے۔ اگر اس کے خلاف مزید کوئی جرم ثابت نہ بھی ہو تو اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ دوسری طرف تماشا یہ کہ اس نے جیل توڑ کر فرار ہونے کا سنگین جرم بھی کیا ہے۔ میں صرف اور صرف مفرور صفیہ کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہوں۔ مجھے صرف اس کا سراغ لگانا ہے۔ نقدی اور زیورات کی میری نظر میں زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ رکھو کا قتل بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ زیادہ سے زیادہ ساجی کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی لیکن اگر اس نے زبان نہ کھولی تو صفیہ کا معاملہ حل نہیں ہوگا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔''

''چنگی طراں سمجھ گیا جناب۔'' اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''اب آپ دیکھیں میرا کمال۔ میں نے پہلے خاصا ہولا ہاتھ رکھا تھا۔''

حوالدار کے جانے کے بعد میں اس کیس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سوچ بچار میں دو گھنٹے بیت گئے۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ جب حوالدار نے میرے کمرے میں آ کر یہ نوید سنائی کہ جناب بندہ بالکل تیار ہے' آپ اس سے جو چاہیں' پوچھ سکتے ہیں۔ تو میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا اور حوالدار سے پوچھا۔

''اتنی جلدی وہ کیسے مان گیا؟''

حوالدار حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''جناب اتنی جلدی نہیں بلکہ پورے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

گھڑی کو دیکھتے ہی مجھے وقت کا اندازہ تو ہو چکا تھا لیکن میں اپنی حیرت حوالدار سے چھپا نہیں پایا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''رستم خان! تم ساجی کو میرے کمرے میں لے آؤ۔''

وہ بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کو ٹرائل روم ہی میں چلنا ہوگا۔ ہمارے مہمان کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے خشمگیں نظر سے حوالدار کو دیکھا اور کہا۔ ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

الٹا حوالدار نے مجھ سے سوال کر دیا۔ ''ملک صاحب! آپ نے اس کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخیں نہیں سنی تھیں؟''

میں کوئی جواب دیے بغیر حوالدار کے ساتھ ٹرائل روم میں آ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنے گہرے انہماک کے ساتھ صفیہ اغوا کیس کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا۔ بہرحال میرے یقین نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ سچ ہے' بعض اوقات انسان اپنی سوچوں کے ساتھ اس قدر مشغول ہو جاتا ہے کہ عالمِ استغراق میں چلا جاتا ہے پھر اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہتی۔

ساجی سے میں نے صرف دس منٹ سوال و جواب کیے جس کا نتیجہ خاصا تکلیف دہ اور دل کو اداس کر دینے والا تھا۔ صفیہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ یہ انکشاف ہونے کے بعد میں آپے سے باہر ہو گیا تھا اور طیش کے عالم میں' میں نے ساجی کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔ بعد میں مجھے اپنے اس عمل پر پشیمانی بھی ہوئی۔ انسان کو جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال ان دنوں میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

انسان چاہے کتنا بھی اصول پرست اور سخت دل کیوں نہ ہو' وہ اپنے موجودہ حالات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب کا مالک شخص بھی کسی جذباتی مرحلے میں انتہائی کمزوری کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صفیہ کے حسرت ناک انجام نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے جذباتی حصار میں لے لیا تھا۔

ساجی نے جو روح فرسا انکشاف کیا اس کے مطابق جب وہ دونوں (ساجی + رکھو) صفیہ کا اغوا کر کے کچا ایمن آباد روڈ کے راستے ایمن آباد کی طرف جا رہے تھے تو نہر پر چناب تک پہنچتے پہنچتے ان کے درمیان عورت اور دولت نے زبردست پھوٹ ڈال دی تھی۔ رکھو کا مطالبہ تھا کہ صفیہ کو ساجی اپنے پاس رکھے اور نقدی و زیورات وغیرہ وہ اس کے حوالے کر دے لیکن ساجی کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں رکھو سے کہا تھا۔

''رکھو! صفیہ تو میرے ساتھ ہی جائے گی لیکن مال مسروقہ ہم دونوں آپس میں برابر تقسیم کریں گے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' رکھو نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ساجی! تم اپنے بیان سے پھر

رہے ہو۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ اپنی پسندیدہ لڑکی کو تم اپنے پاس رکھو گے اور وہاں سے جو کچھ بھی ہاتھ لگے گا' اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ اب تمہیں اس عہد کو نبھانا چاہیے۔"

ساجی نے کہا۔ "چلو اس بات کا فیصلہ بعد میں کریں گے کہ مالِ مسروقہ کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ فی الحال تو ہمیں سب سے پہلے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنا چاہیے۔"

رکھو نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔ "ساجی! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کر رہے ہو حالانکہ جیل میں تو تم نے بہت سے وعدے وعید کیے تھے۔"

"تمہیں مجھ سے بے اعتمادی کی کیا شکایت ہے۔" ساجی نے استفسار کیا۔

رکھو بولا۔ "ابھی تک تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ خفیہ ٹھکانا کہاں ہے جہاں ہم روپوش ہوں گے؟"

"تمہارا شکوہ بجا ہے دوست۔" ساجی نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ "دراصل وہ کوئی باقاعدہ خفیہ ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں نزدیک ہی ایک ڈیرے پر میرا ایک دوست رہتا ہے۔ یہ رات ہم اس کے پاس گزاریں گے بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"تم مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟"

"یاروں سے چکر کیسا۔"

"مجھے تمہاری باتوں سے کسی سازش کی بو آ رہی ہے۔" رکھو نے کہا۔ "تم اب بھی مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے رکھو۔" ساجی نے یقین دہانی کروانے والے انداز میں کہا۔ "تم اپنے دل کو میری طرف سے بالکل صاف رکھو۔"

وہ بے یقینی سے ساجی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو تمہارے ساتھ آ کر پچھتا رہا ہوں۔ یونا (یونس) اچھا خاصا مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ہم لائل پور (موجودہ فیصل آباد) جا کر خوب عیش کرتے۔"

"تم بلاوجہ الجھ رہے ہو۔" ساجی نے نرم لہجے میں کہا۔ "جب ساتھ چلے ہیں تو پھر عمر بھر کا ساتھ دو۔ یوں پیٹھ تو نہ دکھاؤ رکھو۔"

رکھو نے کہا۔ "بے ایمانی کی بات تو تم کر رہے ہو اور پھر میں نے تم سے عمر بھر کا ساتھ نبھانے کو بھی نہیں کہا تھا۔ ہم نے یہی طے کیا تھا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو ہم اپنی

اپنی راہ لیں گے۔"

"ہاں' یہی طے کیا تھا۔" ساجی نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "اور میں اس معاہدے پر کاربند رہوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ جب تک حالات سازگار ہو جائیں گے تو ہم اپنی اپنی راہ لیں گے۔"

"ہاں' یہی طے کیا تھا۔" ساجی نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "اور میں اس معاہدے پر کاربند ہوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ جب تک حالات ہمارے موافق نہیں ہو جاتے' ہم ایک دوست کے ڈیرے پر رہیں گے پھر جیسے تمہاری مرضی۔"

"تمہارے دوست کا ڈیرا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"بس تھوڑا آگے ہندو چوک میں۔"

"کیا اسے ہماری آمد کی اطلاع ہے؟"

"نہیں' میری تو گزشتہ دو سال سے اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔" ساجی نے کہا۔ "اور ہاں' یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اسے جیل اور ڈکیتی یا اغوا کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ وہ شریف آدمی ہے۔ خواہ مخواہ بدک جائے گا۔"

"تو پھر اس سے کیا کہا جائے گا۔" رکھو نے پرتشویش انداز میں کہا۔ "یہ تمہاری محبوبہ تو مسلسل بے ہوش ہے۔ اس کے بارے میں تمہارے دوست کو کیا بتایا جائے گا اور اگر یہ فوراً ہوش میں آ گئی تو....."

ساجی اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔ "تم خواہ مخواہ کی فکروں اور اندیشوں میں گھر رہے ہو۔ اول تو میں اس کی بے ہوشی کی کوئی شاندار کہانی فٹ کر دوں گا اور اگر اس نے ہوش میں آنے کے بعد کچھ چیخ و پکار کی تو میں اپنے دوست سے کہہ دوں گا کہ وہ دماغی مریضہ ہے۔ ہم اسے علاج کی غرض سے شہر لے کر جا رہے ہیں پھر ایک رات ہی کو تو بات ہے۔"

"ایک رات کی کیوں؟" رکھو نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو حالات سازگار ہونے تک وہیں روپوش رہنا ہوگا۔"

ساجی نے کہا۔ "مستقل روپوشی کے لیے میں نے کہیں اور انتظام کر رکھا ہے۔ تم خاموشی سے دیکھتے جاؤ..... آگے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" رکھو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا ساتھ دوں تو تم نقدی اور زیورات والی پوٹلی میرے حوالے کر دو۔ بہ صورت دیگر میں سمجھوں گا کہ تم

مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہو۔"

ساجی نے مجھے بتایا کہ وہ رکھو کے بارے میں بہت پہلے حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ کسی مناسب موقع پر اسے رکھو کا پتہ صاف کر دینا تھا۔ اب اسے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک انتہائی مناسب موقع تو ضائع کر دیا تھا جب وہ صفیہ کو اٹھا کر بھاگنے والا سے نکل رہے تھے تو وہ بہ آسانی ایک گولی چلا کر رکھو کا قصہ پاک کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ یہیں رکھو سے نجات حاصل کرے پھر فوری طور پر اس نے ارادہ بدل دیا کیونکہ اس طرح کھلی سڑک پر رکھو کی لاش سے پولیس کو یہ ضرور معلوم ہو جاتا کہ وہ کس سمت میں فرار ہوئے تھے۔

کسی انتہائی مناسب موقع کے انتظار میں ساجی نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے رکھو! اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو یہ پوٹلی تم اپنے پاس رکھ لو۔ سارے زیورات اور نقدی اسی میں ہیں۔"

رکھو نے مال مسروقہ کی وہ گٹھری بہ خوشی قبول کر لی اور کہا۔ "میں یہ اصول کی خاطر کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے بعد میں میں اس میں سے تمہیں بھی حصہ دوں۔ سچی بات یہ ہے کہ جب تم نے بے اصولی اور عہد شکنی کی بات کی تھی تو مجھے غصہ آ گیا تھا۔"

"چلو کوئی بات نہیں' اب غصہ تھوک دو۔"

رکھو نے باقاعدہ ایک جانب تھوک دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر نے اس کے حصے میں کیا لکھ چھوڑا ہے۔ اپر چناب کے پل سے گزرتے ہوئے رکھو نے کہا۔ "یار' میرا مثانہ پھٹنے کے قریب ہے۔ اگر تم مجھے ایک منٹ دو تو میں ذرا پیشاب کر لوں۔"

ساجی کے ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر بولا۔ "ہاں' ٹھیک ہے۔ تم نہر کے کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں میں اپنی حاجت رفع رک لو۔ میں تھوڑا انتظار کر لوں گا۔" وہ دل میں بہت مسرور تھا کہ قدرت نے اسے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔

پھر جیسے ہی رکھو مذکورہ جھاڑیوں میں جا کر بیٹھا' ساجی نے اس کی کھوپڑی میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا۔ وہ مردہ مچھلی کی طرح پٹ سے زمین بوس ہو گیا۔ ساجی نے پہلی فرصت میں زیورات اور نقدی والی پوٹلی اٹھائی۔ رکھو کی رائفل کو اس نے تیزی سے رواں دواں نہر اپر چناب میں پھینکا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندو چک کی طرف روانہ ہو گیا۔ رکھو والا گھوڑا اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

پھر ہندو چک کے ڈیرے پر جو واقعات پیش آئے' ان کے بارے میں خوشی محمد کو کچھ پتہ نہ

چل سکا۔ خوشی محمد کو ساجی نے یہی بتایا تھا کہ زرینہ (صفیہ) اس کی بیوی تھی جو کسی ذہنی مرض میں مبتلا تھی اور اس نے بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ خوشی محمد نے انہیں نویا ہتا جوڑا خیال کرتے ہوئے اندر کمرے میں سونے کی دعوت دی اور خود ڈیرے کے وسیع و عریض صحن میں چارپائی ڈال کر مویشیوں کے قریب سو رہا۔

ساجی کو جب یقین ہو گیا کہ خوشی محمد گہری نیند میں جا چکا ہے تو اس نے گہری بے ہوشی میں غرق صفیہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی لیکن جلدی ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک لاش کے لمس سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ گہری بے ہوشی نے صفیہ کی جان لے لی تھی۔

یہ انکشاف ہوتے ہی کہ صفیہ کی روح عالم بے ہوشی ہی میں قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے' ساجی یک دم پریشان ہو گیا۔ وہ ایک لاش کو اٹھا کر نگر نگر نہیں گھوم سکتا تھا۔ اس نے تو زندہ صفیہ کی تمنا کی تھی اور سیدھے راستے سے جب اس کی تمنا پوری نہیں ہوئی تو اس نے انتہائی غلط راستہ اختیار کرتے ہوئے اسے اغوا کر لیا تھا لیکن اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے بعد بھی اسے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

اس وقت رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ صفیہ کی لاش کو ایسے ہی چھوڑ کر وہاں سے جا نہیں سکتا تھا۔ اور اسے ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ رات خوشی محمد سے معلوم کر چکا تھا کہ ساتھ والے دونوں کمروں میں کیا ہے۔ خشک چارے والا کمرا اسے اپنے مقصد کے لیے خاصا موزوں نظر آیا تھا۔ وہ وہاں بہ آسانی صفیہ کی لاش کو چھپا سکتا تھا پھر جب موسم سرما میں کبھی اس چارے کو استعمال کیا جاتا اور صفیہ کی لاش برآمد ہوتی تو اس وقت تک وہ کہیں سے کہیں نکل چکا ہوتا۔

خوشی محمد کی گہری نیند سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ساجی نے اس کے لباس سے مطلوبہ کمرے کی چابی نکالی اور صفیہ کی لاش کو خشک چارے کے ڈھیرے میں دبا دیا۔ یہ سارا کام اس نے اتنی صفائی سے کیا تھا کہ پہلی نظر میں معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ بھی کی گئی ہے۔ پھر صبح ہونے سے پہلے وہ قیمتی پوٹلی کے ساتھ ڈیرے سے روانہ ہو چکا تھا۔ بالآخر وہ مختلف جگہوں پر عارضی پڑاؤ کرتے ہوئے واہنڈو میں رانا ظفر اقبال کی حویلی میں پہنچ گیا تھا۔ رانا ظفر اقبال کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ مفرور مجرموں کا پشت پناہ ہے اور انہیں تحفظ فراہم کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دوسرے روز میں ساجی کو ساتھ لے کر دوبارہ ہندو چک پہنچ گیا۔ خوشی محمد نے جب ساجی کو

ہتھکڑی لگی دیکھی تو خوف زدہ ہوگیا۔ میرے ساتھ آنے والے سپاہیوں نے تھوڑی ہی دیر میں خوشی محمد کی مدد سے صفیہ کی مدفن لاش برآمد کرلی۔ لاش میں گلنے سڑنے کا عمل جاری ہو چکا تھا اور بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ یہ ساری صورتِ حال دیکھ کر خوشی محمد بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

میں نے اس کو ایک زوردار جھانپڑ رسید کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''خوشی محمد! تم نے مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ تمہارے پاس ایک رات قیام کرنے کے بعد زرینہ (صفیہ) اور ساجی ایک ساتھ رخصت ہوگئے تھے؟''

وہ آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے معصومیت سے بولا۔ ''جناب! صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ دونوں ہی غائب تھے۔ ان کا گھوڑا بھی احاطے میں موجود نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر ہی چلے گئے ہیں۔ رب دی سوں۔ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ میری ناسمجھی تھی یا سمجھ کا پھیر کہ میں اپنی بات پوری طرح آپ پر واضح نہ کرسکا۔''

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ اس سے زیادہ میں اس کے ساتھ اور کیا کرسکتا تھا۔ ویسے ایک بات کا مجھے یقین آ گیا تھا کہ اس نے دیدہ و دانستہ مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ واقعی بہت بھولا تھا۔ وہ تو ساجی کی سنائی ہوئی کہانی پر بھی ایمان لے آیا تھا کہ صفیہ، ساجی کی منکوحہ تھی اور اس پر بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔

اب اس کیس میں میرے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ میں مغویہ صفیہ کو زندہ سلامت برآمد تو نہیں کر سکا تھا لیکن سجاول عرف ساجی کی گرفتار کر کے میں نے اپنے محکمے کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ دوسرے روز میں خود بہ نفسِ نفیس ساجی کو لے کر اپنے افسرانِ بالا کے پاس پہنچا اور انہیں اپنی تازہ ترین کار گزاری کے بارے میں بتایا۔ اس کارنامے پر مجھے خصوصی میڈل اور امتیازی ترقی سے نوازا گیا۔

خدا گواہ ہے، اس ترقی اور میڈل کی مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنا غم معصوم صفیہ کے رائگاں جانے کا ہوا تھا۔ کاش ہمارا معاشرہ ساجی جیسے نامرادوں سے پاک ہو جائے...... اے کاش!

❁❁❁

لنگڑی غیرت

میں کارِ سرکار کے سلسلے میں ملتان گیا ہوا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی خانیوال میں تھی تاہم ضلع ہیڈکوارٹر ملتان ہی میں تھا۔ آج کل تو خانیوال ضلع کا درجہ حاصل کر چکا ہے مگر اس زمانے میں یہ ضلع ملتان میں شمار ہوتا تھا۔ ضلعی تقسیم کے جدید نظام کے تحت ملتان کو ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس ڈویژن میں ضلع ملتان کے علاوہ خانیوال، ساہیوال، پاک پتن، وہاڑی اور لودھراں کے اضلاع شامل ہیں۔

ضلع ہیڈکوارٹر ملتان سے واپسی پر میں نے بذریعہ ٹرین سفر کا فیصلہ کیا۔ وہ موسمِ سرما کا ایک روشن اور چمکیلا دن تھا۔ نرم، گرم اور مہربان دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً وہ فروری کے اختتامی دن تھے۔ تاریخ مجھے یاد نہیں۔ جس وقت میں خانیوال ریلوے اسٹیشن پر اترا، سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر موجودہ چہل پہل سے میں نے اندازہ لگالیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے کوئی ٹرین روانہ ہوئی ہے یعنی جدھر سے میں آیا تھا اسی جانب۔ گویا مذکورہ ٹرین لاہور سے آئی تھی اور کراچی کی طرف گئی تھی۔ خانیوال کے پلیٹ فارم کو پاکستان کا طویل ترین پلیٹ فارم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

میں جس ٹرین سے اترا تھا اس کی آخری منزل پشاور تھی اور وہ کراچی سے آ رہی تھی۔ مقررہ ٹھہراؤ کے بعد ٹرین نے روانگی کا قصد کرنا تھا۔ اس دوران میں، میں پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے اسٹیشن کے خارجی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اچانک مجھے چونک کر رک جانا پڑا۔ ''پکڑو، پکڑو۔ جانے نہ پائے۔'' کی صداؤں نے مجھے ایک جانب متوجہ کردیا۔ وہ شاید کوئی جیب کترا تھا جو اپنی کامیاب کارروائی کے بعد فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور خلقِ خدا اس کے تعاقب میں تھی پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ ہجوم جیب کترے کو بھول کر ایک مسافر کی جانب توجہ دینے پر مجبور ہوگیا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ بھاگتا ہوا وہ مبینہ جیب کترا مذکورہ مسافر سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ مسافر جیب

کترے کی ٹکر کھانے کے بعد زمین بوس ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لکڑی کا صندو
ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا اور نہ صرف دور جا گرا تھا بلکہ اسی خوف ناک جھٹکے سے وہ کھل
گیا تھا۔

کھلے ہوئے صندوق کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ سیلوفین کی مختلف تھیلیوں میں "پیک
انسانی اعضا صندوق کے اندر سے جھانک رہے تھے۔ سب سے زیادہ بھیانک منظر اس تھیلی کا
جس میں ایک مردانہ سر پیک تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ تمام پیک شد
انسانی اعضا کسی ایک ہی بدنصیب انسان کے تھے۔ اس صندوق کے مالک مسافر کو وہاں موجو
لوگوں نے اچھی طرح قابو کر لیا تھا۔ جیب کترا تو ان کے ہتھے نہیں چڑھا تھا تاہم انہوں نے ا
سے کہیں زیادہ اہم بندے پر ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ جیب کترے کی قسمت اچھی تھی جو اس افراتف
سے فائدہ اٹھا کر نو دو گیارہ ہوگیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ اگرچہ اس وقت میں سادہ لباس میں
تاہم ریلوے اسٹیشن کا بیش تر عملہ مجھے جانتا تھا۔ اس دوران میں اسٹیشن پر موجود ایک کانسٹیبل بھ
موقع پر پہنچ گیا جس نے میرے حکم پر خطرناک صندوق کے مالک کو حراست میں لے لیا۔ پور
ریلوے اسٹیشن پر سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن چونکہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا
لیے اسٹیشن ماسٹر سے میری یاد اللہ تھی۔ اس واقعے کی اطلاع پاتے ہیں اسٹیشن ماسٹر بھی موقع پر پہ
گیا تھا۔

میں نے سب سے پہلے کھلے ہوئے چوبی صندوق کا جائزہ لیا۔ وہ ایک درمیانے سائز
پرانا سا صندوق تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ صندوق کی کنڈی میں تا
موجود تھا یعنی صندوق عموماً جس طرف سے کھولا جاتا ہے ادھر سے نہیں کھلا تھا بلکہ پشت کی جانب
سے کھل گیا تھا۔ میں نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ صندوق کے پچھلے قبضے کھل گئے تھے یعنی ٹوٹ
کر صندوق سے الگ ہوگئے تھے اور یہ سب کچھ شدید جھٹکے کے بعد پلیٹ فارم کے سنگی فرش سے
صندوق کے ٹکرانے کے باعث ہوا تھا۔ کچھ تو صندوق کے قبضے کمزور ہوں گے اور کچھ ٹکراؤ کی
شدت زیادہ تھی۔ ویسے صندوق کی ظاہری حالت بھی یہی کہانی سنا رہی تھی کہ وہ خاصی طویل عرصے
حامل تھا۔

میں نے ایک ریلوے قلی کو بھیج کر اپنے تھانے سے مزید دو کانسٹیبلو بلا لیے تھوڑی ہی دیر
بعد میں جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کر چکا تھا۔ اس دوران میں صندوق کے مالک کو ہتھکڑی پہنا دی گئی

تھی۔ میں نے موقع پر موجود دو چار افراد کے مختصر بیانات قلم بند کیے پھر اصل شخص کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میری ڈانٹ ڈپٹ اور ہلکی پھلکی "خاطر تواضع" کے بعد بھی وہ کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوا تو ایک کانسٹیبل نے مشورہ دیا۔

"ملک صاحب! اس گونگے کی اولاد کو تھانے لے چلیں۔ یہ ٹیڑھی انگلی والا کیس ہے جناب۔"

میں نے کہا۔ "واقعی مجھے بھی لگ رہا ہے کہ سیدھی انگلی سے بات نہیں بنے گی۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لو۔"

کانسٹیبل میرے حکم کے بموجب مذکورہ مسافر کی تلاشی لینے میں مصروف ہوگیا۔ میں موقع کی ضروری کارروائی نمٹانے لگا۔ دو منٹ کے اندر اندر کانسٹیبل نے اس شخص کے لباس کا دستی ایکسریز کر لیا۔ اس جامہ تلاشی سے نہایت ہی کم سامان برآمد ہوا۔ پینتالیس روپے کی نقدی اور ایک ریلوے ٹکٹ۔ وہ ٹکٹ لاہور سے ملتان تک کا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ شخص لاہور سے آیا تھا اور ملتان جا رہا تھا..... اور یہ بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ وہ اسی ٹرین سے اترا تھا جو میرے خانیوال پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

وہ جواب دینے کے بجائے خوف زدہ نظروں سے گردونواح کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ فرار کا ارادہ رکھتا ہو۔

ایک کانسٹیبل نے اس کی پنڈلی پر ٹھڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے باگڑ بلے' کیا تم گونگے ہونے کے ساتھ ساتھ بہرے بھی ہوگئے ہو۔ سنا نہیں تم نے' ملک صاحب تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں؟" اپنی بات ختم کرتے ہی کانسٹیبل نے اس کی گردن پر ایک جھانپڑ بھی رسید کر دیا۔

زیرِ حراست شخص کی حالت..... نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن جیسی ہو رہی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ ہم اس کی جان چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ فرار ہو سکتا ہے تو لکنت زدہ انداز میں بولا۔

"م..... میرا نام..... خدا بخش لنگاہ ہے۔"

"خدا بخش لنگاہ!" میں نے اس کی جیب سے برآمد ہونے والے ٹکٹ پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ "لاہور کے رہنے والے ہو یا ملتان کے؟"

وہ ایک مرتبہ پھر "ہمم' ہکم" ہو گیا۔

میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "کانسٹیبل کا اندازہ بالکل درست ہے خدا بخش لنگاہ۔ تم تھانے جا کر ہی زبان کھولو گے۔"

خدا بخش نے سراسیمہ نظر سے مجھے اور کانسٹیبلو کو باری باری دیکھا اور بولا۔ "مم...... میں لاہور کا رہنے والا ہوں نہ ملتان کا......"

"پھر کیا تم جاپان کے رہنے والے ہو؟" کانسٹیبل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یا انگلستان کے؟"

وہ متامل نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ "خدا بخش' تمہارے پاس سے جو ٹکٹ برآمد ہوا ہے اس کے مطابق تم لاہور سے ملتان تک سفر کرنے والے تھے پھر خانیوال کے ریلوے اسٹیشن پر کیوں اتر گئے؟"

"میں خانیوال ہی کا رہنے والا ہوں۔" خدا بخش نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "خانیوال میں کہاں رہتے ہو؟"

"میں خانیوال شہر میں نہیں رہتا۔"

"پھر؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

وہ بولا۔ "میں ادھر کبیر والا میں رہتا ہوں۔"

"کبیر والا میں کس جگہ؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "کبیر والا کوئی چھوٹی موٹی جگہ نہیں ہے۔ اللہ آباد' علی پور' بلاول پور' حسن پور' حشمت مرالی' رسول پور' سردار پور' شیر گڑھ...... کس علاقے سے تعلق ہے تمہارا؟"

میری فراہم کردہ معلومات پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ جلدی سے بولا۔

"جناب' میں شیر گڑھ کا وسنیک ہوں۔"

"لاہور کیا لینے گئے تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ خاموش رہا۔ اس کی نظر جھکی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "اگر تمہیں خانیوال کے اسٹیشن پر اترنا تھا تو پھر ملتان تک کا ٹکٹ کیوں لیا؟"

"مجھے تو ملتان ہی جانا تھا لیکن......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خوف زدہ نظر سے کھلے ہوئے چوبی صندوق کو گھورنے لگا۔

"جب تمہیں ملتان جانا تھا تو پھر خانیوال کیوں اترے؟" میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس صندوق میں کس کی ٹکڑے ٹکڑے لاش ہے؟ تم نے اس شخص کو کیوں قتل کیا اور اس کی لاش کو صندوق میں بند کر کے کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

میرے پے در پے سوالات سے وہ بوکھلا گیا۔ ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نہیں جانتا' یہ کون شخص ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

وہ ایک مرتبہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔ میں نے کہا۔ "خدا بخش لنگاہ! ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگوں پر اتنے بید برساؤں گا کہ تم خدا بخش لنگاہ سے خدا بخش لنگا (بہ معنی لنگڑا) بن جاؤ گے۔ سیدھی طرح شرافت سے سب کچھ بتا دو' تم نے کس شخص کو قتل کر کے صندوق میں ڈال رکھا ہے۔؟"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا جناب۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں نہیں جانتا' یہ کس شخص کی لاش کے ٹکڑے ہیں اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ اسے کس بدبخت نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں اس بدنصیب مقتول کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا آپ کو معلوم ہے۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب تو تم یہ بھی کہو گے کہ اس چوبی صندوق سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں' اس صندوق سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" خدا بخش لنگاہ نے تائیدی انداز میں کہا۔

"بہت خوب!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اس صندوق سے تمہارا کوئی تعلق نہیں جسے تم ٹرین سے لے کر نیچے اترے تھے اور بہ حفاظت اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے والے تھے کہ اتفاق سے ایک جیب کترے کی ٹکر سے یہ صندوق تمہارے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور اپنی کمزوری کے باعث کھل بھی گیا۔ ہے نا دلچسپ بات خدا بخش لنگاہ؟"

وہ گڑگڑایا۔ "میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' اس صندوق سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اگر اس صندوق سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تو پھر اس پاپ کو ساتھ ساتھ لیے کیوں پھر رہے تھے؟" میں نے خوں خوار لہجے میں دریافت کیا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے جواب دینے کے بجائے نگاہ نیچی کر لی۔

خدا بخش کے اس عمل میں مجھے کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو رہی تھی تاہم میرے ذہن اس غیر معمولی بات کی واضح تصویر نہیں تھی اور سر دست میں اسے کوئی معنی پہنانے سے بھی تھا۔ میں نے جھکی ہوئی نظر والے خدا بخش لنگاہ کا بغور جائزہ لیا۔

اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ صحت قابلِ رشک اور قد دراز۔ وہ عام سی صورت کا مالک ایک عام سا انسان تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو قاتلوں کے چہرے سے ہویدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے' وہ کوئی بہت ہی پہنچا ہوا قاتل ہو اور چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا فن جانتا ہو۔

میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''خدا بخش! یہاں پر ایسے کئی معتبر گواہ موجود ہیں جنہوں اس صندوق کو تمہارے پاس دیکھا ہے۔ تم اس صندوق کی ملکیت سے انکار نہیں کر سکتے..... اور ہی اس میں پائی جانے والی ٹکڑے ٹکڑے لاش سے لاتعلقی ظاہر کر سکتے ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''میں اس صندوق اور لاش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بے گناہ ہوں..... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''

کانسٹیبل نے ہتھکڑی کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''ملک صاحب! یہ کم بخت لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا۔ اس کا شافی علاج ہمارے تھانے کی حوالات میں کیا جا سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی یہی محسوس ہونے لگا ہے ہمارے ان مکالموں پر خدا بخش نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے گردن جھکائے کھڑا رہا۔

میں نے ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد صندوق سمیت اس نامعلوم شخص کی ٹکڑے ٹکڑے لاش کو مقامی سرکاری اسپتال بغرض پوسٹ مارٹم روانہ کر دیا اور خدا بخش لنگاہ کو تھانے لے آیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے خدا بخش کو ایک ہتھ کڑی حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سورما کی زبان کا آپریشن کرنا ہے حوالدار میر داد۔''

''ہو جائے گا ملک صاحب!'' حوالدار نے سر تا پا خدا بخش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو جاؤ۔ جناب' میں تنی منٹی (تین منٹ میں) اس کی زبان کھول دوں گا۔''

''تین منٹ نہیں' میں تمہیں پورا ایک گھنٹا دیتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

''ٹھیک ایک گھنٹے بعد تم اسے میرے کمرے میں لے آؤ گے۔ بالکل تیار حالت میں۔ سمجھ گئے ہو؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ گیا جناب۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''بالکل چاؤ کر کے لاؤں گا آپ کے پاس۔'' پھر وہ کھا جانے والی نظر سے خدا بخش کو گھورنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میر داد' اب تم اسے ٹرائل روم میں لے جاؤ۔''

''او کے سر۔'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا پھر خدا بخش کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے دہاڑا۔ ''چل اوئے سرکاری سانڈ! آگے لگ۔''

میں تھانے سے ملحقہ اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔ اس وقت تک عصر کی نماز کی اذان ہو چکی تھی۔ میں نے لباس تبدیل کر کے نماز ادا کی پھر وردی پہن کر تھانے چلا آیا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آ کر پوچھا۔

''ملک صاحب! چائے چلے گی؟''

اس وقت میں واقعی چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''بالکل چلے گی۔'' کانسٹیبل جانے کے لیے مڑا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا پھر کہا۔ ''چائے دو کپ لانا۔''

کانسٹیبل نے حیرت سے مجھے دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں ایک وقت میں صرف ایک کپ چائے پیتا تھا۔ دو کپ چائے کے آرڈر نے کانسٹیبل کو حیران کر دیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کسی قسم کی وضاحت ضروری نہ سمجھی اور کانسٹیبل کے وہاں سے رخصت ہوتے ہی حوالدار میر داد کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

میر داد کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے سے جوش اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں خاصی حد تک کامیاب رہا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا رپورٹ ہے میر داد؟''

''رپورٹ حوصلہ افزا ہے ملک صاحب!''

''گویا بندہ زبان کھولنے پر آمادہ ہے؟''

''جی جان سے آمادہ ہے جناب۔'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

''کچھ بتایا اس نے صندوق اور لاش کے بارے میں؟''

''اس سلسلے میں وہ مسلسل اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔''

میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''پھر کس سلسلے میں وہ جی جان سے زبان کھو آمادہ ہے؟''

''وہ کوئی اور ہی سلسلہ ہے جناب۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''خدا بخش لنگاہ کا اصرار ہے پوری تفصیل آپ ہی کو بتائے گا۔ مجھے صرف اس نے اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ ایک عادی اور پڑ چور ہے۔''

میرے ذہن میں مختلف سوالات سر اٹھانے لگے۔ میں نے حوالدار سے پوچھا۔ ''کیا بخش نے با آسانی تعاون کیا تھا یا تمہیں.....؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میر داد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''صاحب! کوئی بھی ملزم خالی پیٹ کچھ بکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا پھر ہمیں خود بھی ان ''خاطر داری'' کا خیال ہوتا ہے۔ بس جناب' ایک دو خاص خاص ''ڈشیں'' کھا کر ہی خدا بخش پیٹ بھر گیا تھا اور وہ تعاون کرنے پر آمادہ نظر آنے لگا تھا۔ اب باقی تفصیل آپ ہی اس پوچھ لیں۔ مجھے تو لگتا ہے' وہ کوئی نہایت ہی اہم انکشاف کرنے والا ہے۔''

حوالدار کا طویل مکالمہ ختم ہوا تو میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' اسے میرے پاس لے آؤ۔''

تھوڑی دیر بعد خدا بخش لنگاہ میرے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

میں نے خلاف روایت حوالدار کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ حوالدار نے سوالیہ نظر مجھے دیکھا مگر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں تنہائی خدا بخش سے پوچھ تاچھ کروں گا۔ جانے کیا بات تھی کہ خدا بخش میں مجھے کوئی غیر معمولی چیز رہی تھی' فی الحال میرا ذہن اس خاص بات کی وضاحت کرنے سے قاصر تھا۔ میں مسلسل اس میں غور و فکر کر رہا تھا۔

حوالدار کمرے سے چلا گیا تو میں نے خدا بخش سے کہا ''بیٹھ جاؤ۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں میں سے ایک کی جانب اشا بھی کر دیا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد خدا بخش مذکورہ کرسی پر ٹک گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز تھا جیسے وہ کرسی کو محض چھو رہا ہو۔ میں نے اس کی بے کیفی کو بھانپتے ہوئے قدرے تحکمانہ میں کہا۔

''آرام سے سیدھے ہو کر بیٹھو۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے پھیل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے لہجے میں پوشیدہ نرمی نے اسے شدید الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسی دوران میں کانسٹیبل چائے لے کر آ گیا۔ چائے کے برتنوں کی ٹرے میز پر رکھ کر کانسٹیبل جانے لگا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جب تک میں خدا بخش سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں' کوئی میرے کمرے میں نہ آئے۔''

''او کے سر!'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا۔

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں چائے دانی سے دونوں کپوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ اس عمل کے دوران میں' میں خدا بخش سے بھی مخاطب تھا۔

''خدا بخش! میرے سامنے چوروں' بدمعاشوں اور قاتلوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن میں نے تمہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہا ہے۔ جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟''

وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''میرے لیے یہ حیرت انگیز ہے۔''

میں بدستور اس کی طرف سے بیگانگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً تم میرے اس سلوک سے حیران ہو رہے ہو گے۔ تمہیں حیران ہونا بھی چاہیے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے چائے کا ایک کپ اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔ ''لو چائے پیو' پھر بات کرتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے خدا بخش کے چہرے پر نگاہ گاڑ دی۔ اس کے چہرے پر حیرت' پریشانی اور پشیمانی کے ملے جلے تاثرات خیمہ زن تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے حوالدار میر داد نے بتایا ہے کہ تم مجھے کوئی خاص بات بتانے والے ہو۔''

میں نے دانستہ اپنے لہجے کو نرم رکھا تھا تاکہ وہ اس رویے سے حوصلہ پا کر زیادہ سے زیادہ تعاون پر آمادہ ہو اور میرا کام آسان ہو جائے۔ میر داد نے مجھے بتایا تھا کہ خدا بخش اپنے عادی اور پیشہ ور چور ہونے کا اقرار کر چکا ہے مگر میں نے اس سلسلے میں خدا بخش سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

میری سوالیہ نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے خدا بخش نے نگاہ جھکا لی اور جذباتی لہجے میں بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ.....''

''کیا نہیں آ رہا تمہاری سمجھ میں؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں استفسار کیا۔

وہ نگاہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''حوالدار صاحب کا رویہ میرے ساتھ خاصا ظالمانہ تھا۔''

''ظالمانہ'' پر اس نے خصوصی زور دیا تھا۔ ''مگر آپ کا سلوک اس کے برخلاف ہے۔ یہی بات

میری سمجھ میں نہیں آ رہی جناب۔"

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "خدا بخش لنگاہ! میرے اس مشفقانہ رویے کی ایک خاص وجہ ہے۔ مجھے حوالدار نے بتایا ہے کہ تم تعاون کے لیے آمادہ ہو۔ میرا یہ سلوک تمہاری آمادگی کا انعام ہے لیکن اگر تم نے میرے سوالات کے جواب میں کوئی گڑبڑ کی تو پھر تم مجھے ایک سخت گیر تھانے دار پاؤ گے۔ ایک ایسا تھانے دار جو اپنے سوال کے درست جواب کے لیے تمہاری چمڑی بھی ادھیڑ سکتا ہے۔"

خدا بخش نے ایک جھرجھری لی اور تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "جناب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا مگر میں حلفیہ اور قسمیہ کہتا ہوں کہ نہ تو اس صندوق سے میرا تعلق ہے اور نہ ہی میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔"

"حالانکہ وہ صندوق تمہارے قبضے میں تھا۔" میں نے زہریلے انداز میں کہا۔

"یہ بڑی پیچیدہ کہانی ہے جناب۔"

"میں تمہاری پیچیدہ کہانی سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں ضرور آپ کو ساری تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔" وہ چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "میں ثابت کر دوں گا کہ میں اس معاملے میں بیگناہ ہوں۔"

"تمہاری بے گناہی کا فیصلہ تو میں خود کروں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی تمہاری کہانی سننے کے بعد۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بس ایک بات ذہن میں رکھنا۔ میری طرف سے یہ آخری مہربان رویہ ہوگا۔ تم چاہو تو اس سے فائدہ اٹھا کر خود کو بے قصور ثابت کر دو یا پھر دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے لیے قید و بند کی صعوبتیں سمیٹ لو۔ یاد رکھنا' جب تم پر سے میری مہربانی کا سایہ اٹھ جائے گا تو پھر تم ایک اذیت ناک زندگی کے حوالے کر دیے جاؤ گے۔"

"میری توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "میرے باپ دادا کی توبہ جو کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لوں۔ جناب' چاہے آپ مجھے جو بھی سزا دیں لیکن آپ سے میرا یہ وعدہ ہے کہ میں آپ کے سامنے ایک ایک بات سچ بولوں گا۔"

"بس تو پھر شروع ہو جاؤ۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔"

اس نے چائے کا آخری گھونٹ لینے کے بعد خالی پیالی کو میز پر رکھا اور خیالوں میں کھو گیا۔

اس کا انداز ایسا تھا جیسے بہت کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اسے سوچتا ہوا چھوڑ دیا اور اپنی پیالی کی چائے سے انصاف کرنے لگا۔ میری پیالی میں ابھی آدھی چائے باقی تھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ خدا بخش گرما گرم چائے پینے کا عادی تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ اپنے ذہن میں منتشر خیالات کو مجتمع کرتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی کتھا سنانے لگا۔ اس کے بیان کردہ حالات و واقعات اور حقائق کو مرتب کر کے میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ کا ذہن اس کیس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو جائے۔

خدا بخش لنگاہ موضع شیر گڑھ کا رہنے والا تھا جو کبیر والا کا ایک گاؤں تھا۔ خدا بخش شیر گڑھ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے قریبی رشتے داروں میں سے کوئی اس گاؤں میں نہیں رہتا تھا۔ خدا بخش شادی شدہ تھا مگر ابھی تک لاولد ہی تھا۔ اس کی بیوی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بانجھ عورت تھی۔ تاہم اس بارے میں متضاد آراء پائی جاتی تھیں۔ بعض لوگوں کے مطابق نقص خدا بخش لنگاہ میں تھا۔

خدا بخش نے اپنے گاؤں میں یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ وہ چلتا پھرتا کاروبار کرتا ہے۔ یعنی ایک شہر سے مختلف چیزیں خرید کر زیادہ قیمت پر دوسرے شہر میں بیچ دیتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے اکثر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ ہفتے دس دن میں وہ ایک چکر اپنے گاؤں شیر گڑھ کا بھی لگا لیتا تھا۔ بیوی کو خرچہ وغیرہ دے کے وہ دوبارہ گاؤں سے رخصت ہو جاتا تھا۔

خدا بخش لنگاہ کا یہ سفری بیوپار محض ڈھکوسلا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں سے جھوٹ بولتا تھا۔ در حقیقت وہ ایک عادی چور تھا اور اس کا طریقہ واردات بڑا انوکھا تھا۔ اس کی سرگرمیوں کا علاقہ لاہور سے ملتان تک تھا۔ وہ ٹرین میں لاہور سے ملتان اور ملتان سے لاہور تک سفر کرتا تھا۔ دوران سفر میں اس کے پاس کوئی سامان وغیرہ بالکل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ تو دوسروں کے سامان پر نظر رکھتا تھا۔ ادھر کوئی مسافر اپنے سامان کی جانب سے غفلت کا شکار ہوا' ادھر خدا بخش نے اس کا سامان پار کر لیا۔

خدا بخش کے شکار کے لیے دو جگہیں بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک لاہور کا ریلوے اسٹیشن اور دوسرا ملتان کا ریلوے اسٹیشن۔ مذکورہ اسٹیشنز پر جو مسافر اپنا سامان بھول جاتے تھے وہ خدا بخش اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔ خاص طور پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر وہ پوری گاڑی کا سروے کرتا اور جو بھی چیز لاوارث پڑی ملتی اسے اٹھا لیتا۔ ازیں علاوہ وہ ایک اور انداز میں بھی ہاتھ کا

ہنر دکھاتا تھا۔ لاہور اور ملتان کے درمیان اگر کوئی اکیلا مسافر اس سے یہ کہہ کر نیچے اترتا کہ میرے سامان کا خیال رکھنا۔ میں ذرا نیچے سے پانی لے آؤں ..... یا کھانے پینے کی کوئی چیز لے آؤں۔ خدا بخش اسے یقین دلاتا کہ وہ بے فکر ہو کر جائے۔ مذکورہ مسافر کے نیچے اترتے ہی باقی مسافروں سے نگاہ بچا کر خدا بخش اس کا سامان یا سامان میں سے کوئی اہم چیز اٹھا کر گاڑی سے اتر جاتا۔ اس کے پاس ملتان سے لاہور اور لاہور سے ملتان تک کا ٹکٹ ہوتا تھا اس لیے اسے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اس قسم کی دھوکا دہی اور چوری چکاری میں اکثر اسے کم قیمتی چیزیں ہی ہاتھ لگتی تھیں کبھار کوئی بیش قیمت چیز اس کے ہاتھ چڑھ جاتی تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔

خدا بخش لنگاہ اپنا یہ مخصوص ''کاروبار'' جاری رکھے ہوئے تھا کہ وقوعہ کے روز لاہور سے ملتان جاتے ہوئے ایک مسافر کا وہ چوبی صندوق اس کے ہاتھ لگ گیا اور وہ ملتان جانے کے بجائے خانیوال کے ریلوے اسٹیشن پر ہی اتر گیا تھا وہ یہی سمجھا تھا کہ مذکورہ صندوق میں کوئی قیمتی چیز یا چیزیں ہوں گی مگر شومئی قسمت کہ اس صندوق میں سے ایک مردانہ لاش کے پارچہ برآمد ہوئے تھے۔ اگر اتفاقیہ طور پر خانیوال کے پلیٹ فارم پر جیب کترے والا واقعہ پیش نہ آتا عین ممکن تھا صندوق کا راز فاش نہ ہوتا اور خدا بخش اسے اپنے ٹھکانے تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا مگر اس کا کیا کیجئے کہ یہ بھانڈا بیچ چوراہے کے ہی پھوٹا تھا۔

خدا بخش اپنی کوتاہیوں (چوری چکاری اور دھوکا دہی وغیرہ) کا اعتراف کرنے کے بعد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! جو سچ تھا وہ میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب آپ جو چاہیں' مجھے سزا دے دیں۔ میں اُف تک نہیں کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری سزا کے بارے میں تو میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔ پہلے تمہارے بیان کی تصدیق یا تردید ضروری ہے۔ اگر تمہارا بیان صد فی صد درست ثابت ہوا تو میں تمہارے ساتھ ممکنہ نرمی برتنے کی کوشش کروں گا۔ بصورتِ دیگر جو تمہارا حشر ہوگا اسے دنیا دیکھے گی' عبرت پکڑے گی۔''

''میں ہر آزمائش کے لیے تیار ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

اس کے انداز میں اعتماد کی جھلک تھی۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ صندوق سے برآمد ہونے والی لاش کے بارے میں واقعی لاعلم ہے اور یہ کہ اس شخص کے قتل میں بھی اس کا کوئی ہاتھ نہیں تاہم میں اپنے احساسات کی بنا پر اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کی گھسائی بہت ضروری تھی

لیے اس کے بیان کو میں کسوٹی پر رگڑ کر پرکھنا چاہتا تھا اور جب تک کوئی اطمینان بخش صورتِ حال سامنے نہ آتی' میں اسے حوالات میں رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے خدا بخش لنگاہ کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خدا بخش! اگر میں تمہارے بیان پر من وعن یقین کر بھی لوں پھر بھی بہت سے سوالات جواب طلب ہیں اور ان کے جواب تمہیں ہی دینا ہوں گے۔''

''آپ پوچھیں' میں آپ کے ہر سوال کا درست جواب دوں گا۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''خدا بخش! تم نے صندوق میں موجود کٹے ہوئے سر کو دیکھا تھا۔ کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو؟''

''نہیں جناب' میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بڑی وضاحت سے لاش کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا تھا۔''

''کیا تم مقتول کو پہچانتے ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں جناب۔''

''اس سے پہلے تم نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہو؟''

اس کا جواب نفی میں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ آج تم لاہور سے گاڑی میں بیٹھے تھے؟'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے کہا۔ ''کیا چوبی صندوق کا مالک مسافر بھی لاہور ہی سے ٹرین میں سوار ہوا تھا؟''

''نہیں' تھانے دار صاحب!'' خدا بخش اطمینان آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ''وہ شخص ساہی وال کے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا تھا۔''

''کیا وہ تمہارے قریب ہی بیٹھا تھا؟''

خدا بخش مجھے بتا چکا تھا کہ صندوق بردار شخص اکیلا ہی تھا اور وہ ایک بھرپور جوان تھا۔ میرے موجودہ سوال کا جواب دیتے ہوئے خدا بخش نے کہا۔ ''جی ہاں' وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔''

''تم ٹرین کے کس درجے میں سفر کر رہے تھے؟''

''تھرڈ کلاس میں۔'' اس کا جواب واضح تھا۔

اس زمانے میں ٹرینوں میں فرسٹ' سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کے درجے ہوتے تھے۔ آج کل

سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کو ختم کر کے اکانومی کا نام دے دیا گیا ہے۔ ائر کنڈیشنڈ کلاس ہنوز موجود ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''تم دونوں کے آس پاس کتنے افراد موجود تھے؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے۔'' ٹرین میں زیادہ رش تھا یا مساز معمول کے مطابق ہی تھے؟''

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آج رش خلاف معمول بہت کم تھا۔ میں تو آئے دن ٹرین میں سفر کرتا رہتا ہوں۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف ایک شخص سامنے والی سیٹ پر موجود تھا یعنی ہمارے کمپارٹمنٹ والے حصے میں۔''

میں نے سوال کیا۔ ''کیا تم دونوں کے درمیان کسی قسم کی گفتگو بھی ہوئی تھی؟''

''بہت کم۔'' خدا بخش نے مختصراً بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اس جوان شخص کا حلیہ بیان کرو۔''

خدا بخش نے مذکورہ شخص کا حلیہ بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے نوٹ کروا دیا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''تمہارے درمیان جتنی بھی اور جس بھی نوعیت کی بات چیت ہوئی تھی' اس کے بارے میں بتاؤ؟''

''بس ہم نے ایک دوسرے سے اتنا ہی پوچھا تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔'' خدا بخش نے بتایا۔ ''میں نے خود گفتگو کا آغاز کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ میں ملتان جا رہا ہوں۔ جواباً اس نے بتایا کہ وہ روہڑی جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

''کیا تم نے اس کا نام پوچھا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں' پوچھا تھا۔'' خدا بخش نے اثبات میں میں سر ہلایا۔ ''اور اسے اپنا نام بھی بتایا تھا..... یعنی غلط نام..... اللہ دتا!''

''اور اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟''

''لیاقت علی!''

''کیا تمہارے خیال میں اس نے اپنا نام درست بتایا ہوگا؟''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مبینہ لیاقت علی کے پاس چوبی صندوق کے علاوہ بھی کوئی سامان تھا؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے' اس کے پاس صندوق کے علاوہ ایک ہینڈ

بیگ بھی تھا۔''

''لیاقت علی نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ روہڑی جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر روہڑی تو بہت بعد میں آنے والا تھا۔ تم خانیوال کے اسٹیشن پر اتر گئے۔ لیاقت علی کے ساتھ تم نے کیا' کیا تھا؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔''

''پھر اس کا صندوق حاصل کرنے یعنی چرانے میں تم کس طرح کامیاب ہوئے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

خدا بخش لنگاہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ اس صندوق کو حاصل کرنے میں مجھے چنداں محنت نہیں کرنا پڑی بلکہ لیاقت علی نے خود مجھے موقع فراہم کر دیا تھا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت آمیز نظر سے اسے گھورا۔

خدا بخش نے بتایا۔ ''میں نے بتایا ہے نا' ہمارے والے حصے میں ہم دونوں کے علاوہ صرف ایک مسافر اور تھا اور وہ بھی ہڑپہ کے ریلوے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔ پھر ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ اس دوران میں ہمارے درمیان نہایت ہی مختصر بات چیت ہوتی رہی۔ لیاقت علی جب ساہیوال سے ٹرین میں سوار ہوا تھا تو اس نے چوبی صندوق کو نشست کے نیچے گھسا کر رکھ دیا تھا۔ اس سلسلے میں' میں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ دورانِ گفتگو لیاقت کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ روہڑی کسی شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے جا رہا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا کہ لکڑی کے اس صندوق میں قیمتی کپڑے اور دیگر بیش قیمت سامان تھا۔ اگرچہ اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی تھی تاہم میں نے اپنے مطلب کی باتیں اس سے اگلوا لی تھیں۔''

وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے اسے یاد دلایا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ لیاقت علی نے تمہیں خود وہ صندوق چرانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس بارے میں تفصیل سے مجھے آگاہ کرو۔''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میرا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ میں دورانِ سفر جس شخص کے سامان کو اڑانے کا ارادہ کر لیتا ہوں' اس سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دیتا ہوں۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں اس شخص پر اپنا اچھا تاثر قائم کروں۔ اس سلسلے میں' میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہوں۔ اخلاقیات کی باتیں' سیاست کی خرابیاں' حکومتی پالیسیوں پر تنقید' مہنگائی کا رونا وغیرہ وغیرہ۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مذکورہ شکار میری طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو جاتا ہے اور مجھے اپنا کام کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔''

میں نے کچھ بولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس نے میرا مقصد بھانپ لیا اور جلدی سے بولا۔ ''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے' میں خواہ مخواہ اس تفصیل میں پڑ گیا ہوں لیکن جناب' آپ یقین جانیں۔ یہ سب کچھ آپ کو بتانا بہت ضروری ہے۔ پھر ہی آپ میرا مفہوم یعنی مقصد سمجھ پائیں گے۔''

میں خاموش مگر سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بس جناب' مجھے ایک ہی بات کی فکر تھی اور وہ یہ کہ اس کی منزل مجھ سے بہت آگے تھی۔ مجھے ملتان کے اسٹیشن پر اتر جانا تھا اور لیاقت کو روہڑی تک جانا تھا۔ ملتان سے پہلے مزید دو اسٹیشن آنا تھے یعنی میاں چنوں اور خانیوال۔ ہڑپہ کے بعد چیچہ وطنی بھی گزر چکا تھا اور ابھی تک مجھے موقع نہیں ملا تھا جس کی میں تاک میں تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب سے لیاقت ٹرین میں سوار ہوا تھا' وہ اپنی سیٹ پر ہی جما بیٹھا تھا حالانکہ ساہیوال سے روانگی کے بعد ٹرین ہڑپہ اور چیچہ وطنی کے اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے رکی تھی مگر اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''پھر میری مراد بر آئی۔ چیچہ وطنی کے بعد میں چنوں کا اسٹیشن آیا۔ گاڑی رکنے ہی والی تھی کہ لیاقت علی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا' کہاں جا رہے ہو؟ وہ بولا' میں ذرا منہ دھونے نیچے جا رہا ہوں۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے کہا' منہ تو گاڑی کے باتھ روم میں بھی دھویا جا سکتا ہے۔ اس نے بتایا' گاڑی کے باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا۔ مجھے اس کے جواب پر حیرت ہوئی کیونکہ جب سے وہ ٹرین میں سوار ہوا تھا' ایک مرتبہ بھی وہ اٹھ کر باتھ روم تک نہیں گیا تھا۔ میں نے اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے پوچھا' تمہیں کیسے معلوم کہ باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا؟ وہ بولا' یہ معلوم کرنے کے لیے باتھ روم میں جانا ضروری نہیں۔ بھئی' یہ پاکستان ریلوے ہے۔ بس اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ہاں بھئی تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ درحقیقت مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ سیٹ سے اٹھ کر نیچے جانے والا تھا۔ میں اگرچہ اس کا صندوق پورے کا پورا حاصل نہیں کر سکتا تھا تاہم اسے کھول کر کچھ نہ کچھ پار کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا۔ میں آپ کو یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا کہ چھوٹے موٹے تالے کھولنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''تم نے جو پیشہ اپنا رکھا ہے' یہ اس کا تقاضا بھی ہے۔'' میں نے چوٹ کی۔

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''تو جناب! میں نے اپنی اندرونی خوشی کو

چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور لیاقت سے کہا' یار ذرا جلدی آ جانا۔ یہاں گاڑی زیادہ دیر نہیں رکتی۔ یہ بات میں نے اس کی تسلی کے لیے کہی تھی۔ وہ بے پروائی سے بولا۔ ''تم میرے سامان کا خیال رکھنا۔ بس باڑی اب رک ہی رہی ہے۔ میں منہ دھو کر آتا ہوں۔ بس سمجھو' یوں گیا اور یوں آیا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھانے دار صاحب! لیاقت نے اپنے قول کے نصف حصے پر عمل کیا۔ وہ یوں گیا تو مگر یوں آیا نہیں۔ میں نے اس دوران میں صندوق کا تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس کا بھرپور موقع مل سکا کیونکہ گاڑی رکتے ہی چند مسافر ہمارے والے حصے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اپنے سامان کے ساتھ مصروف ہوں۔ میں نے بھی کسی قسم کی پریشانی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے انہیں یہی تاثر دیا اور چپ چاپ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اسی دوران میں گاڑی چل پڑی اور میں تشویش ناک نظر سے باہر پلیٹ فارم کو تکنے لگا جہاں دور دور تک لیاقت کا نام و نشان نہیں تھا۔

پہلے پہل تو میں یہی سمجھا کہ وہ جلدی میں کسی دوسری بوگی میں چڑھ گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی اصل جگہ پر آ جائے گا۔ ایسا عموماً ہو جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کرنے والے اس بات سے واقف ہیں۔ جن اسٹیشنوں پر گاڑی مختصر مدت کے لیے رکتی ہے' وہاں پر ٹرین پکڑنا پڑتی ہے اور اس کوشش میں وہ بعض اوقات اپنی بوگی کے بجائے کسی دوسری بوگی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل ٹرین چھوٹ جانے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔

میں متلاشی نظر سے لیاقت علی کو دیکھ رہا تھا مگر جب وہ دس پندرہ منٹ تک بھی دکھائی نہیں دیا تو میرے سینے سے اطمینان کا سانس خارج ہوا۔ اب اس کا ایک ہی مطلب تھا..... یعنی وہ ٹرین میں سوار نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اس بات سے خوشی کا احساس ہوا۔ ٹرین کا اگلا اسٹیشن خانیوال تھا اور میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اس اسٹیشن پر اتر کر دنیا کے ہنگامے میں گم ہو جاؤں گا۔''

''اور پھر تم نے ایسا ہی کیا؟'' وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے لقمہ دیا۔

''میں اور کیا کرتا؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''یقیناً تم یہی کرتے جو تم نے کیا۔ تمہارے لیے وہ کسی سنہری موقع سے کم نہیں تھا۔ تم نے اپنی دانست میں میدان مار لیا تھا مگر تقدیر تمہارا مذاق اڑانے پر تلی بیٹھی تھی۔ تم لیاقت علی کے صندوق کو پار کرتے کرتے خود آر ہو گئے۔''

وہ کچھ نہیں بولا' ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''خدا بخش لنگاہ! یہ آر پار کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ بڑا نازک ہے یہ۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ذرا سی غفلت اور بے احتیاطی سارا کا رکھ دیتی۔ بنے بنائے کھیل کا سواستیاناس ہو جاتا ہے۔ شاید وہ شعر تمہارے ہی لیے ہے کہ آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔''

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''بس جناب' ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ شاید میرے میں یہی لکھا تھا۔''

میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔ ''خدا بخش' ایک بات بتاؤ۔ اگر تم خانیوال پلیٹ فارم پر پکڑے نہ جاتے اور بہ خیر و عافیت صندوق کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو پھر تمہارا ردِ عمل کیا ہوتا؟''

''میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں جناب! وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھ بولا۔

میں نے کہا۔ ''خدا بخش! تمہیں تو یہی امید تھی کہ اس صندوق میں قیمتی اشیاء وغیرہ لیکن جب اس میں سے کسی مردانہ لاش کے ٹکڑے برآمد ہوتے تو تم کیا کرتے؟''

وہ دو گھڑی سوچنے کے بعد بولا۔ ''سچ سچ بتاؤں' جناب!''

''تم سچ بولنے کا وعدہ کر چکے ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''اس لیے اگر تم نے دروغ گوئی سے کام لینا چاہا تو سمجھ لینا تمہاری شامت شروع۔ میں جس قدر نرمی سے پیش ہوں' اتنی ہی زیادہ شدت سے سختی بھی کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں ایسی سزا میں مبتلا کر سکتا ہ زندگی تمہارے لیے موت سے بدتر ہو جائے۔ تم ہر پل' ہر گھڑی مرنے کی خواہش کرنے لگو

میں نے اس قسم کی باتیں محض اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے کہی تھیں اور میں کہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ خدا بخش نے ایک جھرجھری لی اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''سچی بات تو یہ ہے جناب کہ میں خاموشی سے اس صندوق کو کسی ویران جگہ پر چھوڑ پھر اس واقعے کو ذہن سے فراموش کر دیتا۔''

میں نے کہا۔ ''اس صورت میں تم قانون کی نظر میں خطاوار ٹھہرتے کیونکہ اخفائے ذات خود جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔''

''جناب' میرا چھوٹا سا دماغ اتنی گہری بات نہیں سوچ سکتا۔''

''دماغ تو تمہارا چھوٹا نہیں ہے خدا بخش۔'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

''سرگرمیوں میں ملوث ہو' ان کے لیے انسان کا شاطر دماغ ہونا ضروری ہے۔''

اس نے ندامت آمیز انداز میں گردن جھکا لی۔

میں نے کہا۔ ''خدا بخش! تم نے بتایا تھا کہ لیاقت نامی اس شخص کے پاس اس چوبی صندوق کے علاوہ ایک دستی تھیلا بھی تھا۔ وہ تمہارے پاس سے برآمد نہیں ہوا۔ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

میں نے یہ سوال خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ اس تھیلے کی برآمدات کی مدد سے لیاقت علی نام اس شخص کا کچھ سراغ مل سکتا تھا۔ خدا بخش کے بیان سے اس بات کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ شاید اسنے وہ تھیلا کہیں پھینک دیا ہو۔ اس نے مذکورہ تھیلے کی تلاشی لی ہو اور کام کی کوئی چیز نہ پا کر تھیلے کو کچرے کے کسی ڈھیر پر پھینک دیا ہو جیسا کہ وہ بتا چکا تھا۔ اگر صندوق بروقت پکڑ میں نہ آتا تو بعد ازاں کسی بھی قسم کی صورتِ حال سے بچنے کے لیے وہ صندوق کو ویران علاقے میں چھوڑنے کا عزم رکھتا تھا۔

خدا بخش نے میری توقع کے برعکس جواب دیا۔ ''جناب' لیاقت علی کا وہ تھیلا میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ جب وہ میاں چنوں کے ریلوے اسٹیشن پر منہ دھونے نیچے اترا تو تھیلا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک گہرا سانس خارج ہوا۔ ''پھر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا نہیں ہو سکتا جناب؟''

میں بے خیالی میں وہ جملہ بول گیا تھا۔ خدا بخش اس کے سیاق و سباق سے واقف نہیں تھا اس لیے الجھ گیا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلتے ہوئے کہا۔

''خدا بخش! اس تھیلے میں یقیناً ایسی کچھ اشیا ضرور ہو سکتی تھیں جن سے لیاقت علی کی شناخت ممکن ہو جاتی۔ اب تو اس کا سراغ لگانا ہمارے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ جس طرح تم لیاقت کو چونا لگانے کی تاک میں تھے بالکل اسی طرح وہ بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ صندوق سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے صندوق پر نگاہ نہ لگائی ہوتی تو ممکن ہے' وہ صندوق خانیوال سے بہت آگے کہیں پہنچ جاتا۔''

''ہاں جناب' یہ تو ہونا ہی تھا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے خدا بخش لنگاہ۔ یہ قتل اسی لیاقت نامی شخص نے ہوگا؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے جناب!''

''میں نے لگتا کی بات نہیں کی ہے بے وقوف!'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارا خیال جاننا چاہا ہے۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال بھی یہی ہے جناب کہ قاتل لیاقت علی کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں ہوسکتا۔ ویسے ایک بات ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ ایک بات کیا ہے؟''

وہ بولا۔ اگر میرا خیال درست ہے کہ قتل واقعی لیاقت علی نے کیا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بندہ بڑا جی دار ہے ورنہ ایک کئی پھٹی لاش کے ساتھ اطمینان بخش سفر کرنا بہت مشکل کام ہے جناب! اس کے لیے شیر کا سا دل چاہیے اور چیتے کا سا حوصلہ۔''

''اس مکروہ عمل کے لیے نہ تو شیر جیسا دل درکار ہوتا ہے اور نہ ہی چیتے کا حوصلہ'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بس انسان کا شقی القلب ہونا ہی کافی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''اور جہاں تک لیاقت علی کے مطمئن ہونے کا سوال ہے تو میں اس سلسلے میں ایک دوسرے رخ سے سوچ رہا ہوں۔''

خدا بخش لنگاہ ہمہ تن گوش ہوگیا پھر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

میں نے اس کی بے قراری کو کم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ لیاقت علی اس صندوق کی حقیقت سے واقف ہی نہ ہو۔''

''میں سمجھا نہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔

''ممکن ہے اسے یہ صندوق اسی طرح بند دیا گیا ہو اور قاتل کوئی اور ہی شخص ہو۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''لیاقت علی کو یہی بتایا گیا ہو کہ اس میں شادی سے متعلق کپڑے اور دوسرا سامان ہے۔ لیاقت کو بے خبری میں اس صندوق کو روہڑی تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ وہ نادانستگی میں کسی جرائم پیشہ شخص کا آلہ کار بن گیا ہو!''

''میں نے اس پہلو سے تو سوچا بھی نہیں تھا۔'' خدا بخش کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اور اگر واقعی مبینہ لیاقت علی اس صندوق کے اندر بند خوف ناک حقیقت سے واقف نہیں تھا تو پھر وہ اس صندوق کی تلاش میں جانے کہاں کہاں مارا پھر رہا ہوگا۔ ممکن ہے اس

نے میاں چنوں ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر کو بھی اس واقعے کی اطلاع دی ہو۔''

میں اپنی رو میں بولے چلا جارہا تھا۔ اس دوران میں خدا بخش نے بڑی پتے کی بات کی۔

''تھانے دار صاحب! اگر لیاقت علی نے میاں چنوں کے اسٹیشن ماسٹر سے سامان کے بارے میں بات کی ہوتی تو پھر میں خانیوال کے اسٹیشن پر اتنی آسانی سے صندوق نکال لینے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔''

میں چونک پڑا۔ ''یہ تو تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔ میاں چنوں سے خانیوال تک پہنچنے میں ٹرین کو اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے جبکہ اسٹیشن ماسٹر آف میاں چنوں دو تین منٹ کے اندر اسٹیشن ماسٹر آف خانیوال کو اطلاع کرسکتا تھا۔''

''پھر ایک بات اور بھی ہے۔'' خدا بخش لنگاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خانیوال اسٹیشن پر رک کر کافی دیر انتظار بھی کیا تھا۔ ٹرین کے رخصت ہونے کے بعد ہی میں نے اسٹیشن کی عمارت سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس قسم کی کوئی بات ہوتی تو پلیٹ فارم پر کھلبلی مچ جاتی۔''

اس کی بات سن کر میں چونکا۔ میں نے پوچھا۔ ''خانیوال کے پلیٹ فارم پر رکنا تمہارے لیے سراسر خطرناک تھا۔ تم نے یہ خطرہ کیوں مول لیا؟''

''اگرچہ اس میں خطرہ تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''مگر میں نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ میں نے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔''

خدا بخش لنگاہ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار اور موقع شناس ثابت ہورہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے اس سلسلے میں کس قسم کی احتیاط برتی تھی؟''

وہ بولا۔ ''میں پلیٹ فارم کے ایک ویران گوشے کی جانب نکل گیا تھا۔ ادھر..... جس طرف بتی گودام بنا ہوا ہے۔ اسی طرف ایک سنگی بینچ پر بیٹھ کر میں صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ لکڑی کے صندوق کو میں نے خود سے تھوڑے فاصلے پر رکھ دیا تھا تاکہ کسی قسم کی ہنگامی صورت میں، میں اپنی حفاظت میں کوئی بہتر فیصلہ کرسکوں۔''

''تم بہت کائیاں ہو خدا بخش لنگاہ۔''

اس نے میرے اس جملے کو اپنی تعریف سمجھا، جلدی سے بولا۔ ''بس کیا کریں جناب۔ اس دھندے میں آنکھیں اور کان کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔''

''اور زبان بند!'' میں نے اسے گھورا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر آپ

جیسے تھانے دار زبان کھلوانے کا ہنر جانتے ہیں۔"

میں اپنی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے خیالوں میں کھو گیا۔

خدا بخش لنگاہ کے بیان کے مطابق مبینہ لیاقت علی ساہیوال کے اسٹیشن سے گاڑی پر سوا ہوا تھا اور میاں چنوں کے اسٹیشن پر چوبی صندوق کو ٹرین میں چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔ اگر خدا بخش نے اپنے بیان میں دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا اور کسی بھی موقع پر مجھے چکما دینے کی کوشش نہیں کی تھی تو پھر اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ لیاقت علی کے صندوق میں بند ٹکڑے کٹی لاش جس بھی بدنصیب شخص کی تھی، وہ ساہیوال سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگا لیا تھا کہ خدا بخش مجھے چکر نہیں دے رہا تھا۔

میں نے صندوق میں موجود لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے سے قبل سرکاری فوٹو گرافر کو بلا کر اس کی تصاویر بنوالی تھیں، خصوصاً مقتول کے سر کی تصویر۔ گردن سے کٹا ہوا سر کسی روسی مجسمہ ساز کا شاہکار دکھائی دیتا تھا۔ ایک بات تسلی بخش تھی کہ مقتول کے چہرے کے خال و خط بڑے واضح تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی تصویر بالکل صاف آتی۔ میں انہی خیالوں میں مگن تھا کہ خدا بخش کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"تھانے دار صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔"

میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خدا بخش! اجازت وغیرہ کا خیال تو تم اپنے دل سے نکال دو۔ اب تم ہمارے مہمان ہو۔"

"جناب! میں نے آپ کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے ہر بات سولہ آنے ٹھیک ٹھیک بتا دی ہے۔ اب تو مجھے جانے دیں۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "خدا بخش، تمہارا تعاون قابلِ قدر ہے مگر تمہارے بیان کی تصدیق ابھی باقی ہے۔ تم اس وقت تک ہمارے مہمان رہو گے جب تک میں اپنی تسلی نہیں کر لیتا۔"

"اس میں جانے کتنا وقت لگ جائے؟" وہ اداس لہجے میں بولا۔ "پولیس کے کام تو ویسے بھی بہت سست رفتاری سے آگے بڑھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا بخش! میں عام پولیس والوں سے بہت مختلف ہوں۔ میں کارِ سرکار میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تم دیکھ لینا، تفتیش کی گاڑی کتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہے۔"

"مگر پھر بھی مجھے آپ کے پاس کتنی مدت تک رہنا ہو گا۔" خدا بخش نے بیزاری سے

پوچھا۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "ٹھہراؤ کی مدت کے لیے میں سردست تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ جانے دو پھر اس دوران میں مجھے تم سے ایک ضروری کام کی تصدیق بھی کروانا ہے۔"

"کون سا ضروری کام؟"

"تم نے لیاقت علی کا جو حلیہ مجھے نوٹ کروایا ہے، میں اس حلیے کے مطابق سرکاری مصور سے ایک خاکہ بنواؤں گا..... بلکہ اس سلسلے میں کئی قلمی خاکے تیار کیے جائیں گے۔ جس خاکے (اسکیچ) کو تم او کے کرو گے، میں اس کو اپنی تفتیش کے لیے استعمال کروں گا۔ لیاقت علی کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔ جب تک وہ ہمارے ہتھے نہیں چڑھتا، ہم کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

وہ بولا۔ "مقتول کے بارے میں بھی تو آپ کو تفتیش کرنا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "میں اس نکتے کو بھولا نہیں ہوں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور مقتول کی تصویر آنے کے بعد میں مقتول کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے سلسلے میں سرگرم ہو جاؤں گا۔"

خدا بخش نے پوچھا۔ "تھانے دار صاحب! جب آپ کا مصور لیاقت علی کا خاکہ تیار کر لے گا تو پھر آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں گے نا؟"

"میں نے کہا نا، تمہیں ایک خاص وقت تک میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں جانے کی اس قدر جلدی کیوں ہو رہی ہے۔ کہیں دل میں کچھ....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خدا بخش لنگاہ کو گھورا۔ وہ میری نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس معاملے میں میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ یعنی قتل کے معاملے میں۔ میں صرف چوبی صندوق کو چرانے کا قصوروار ہوں۔ آپ خوامخواہ مجھ پر شک نہ کریں۔"

"تمہاری بے تابی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے خدا بخش۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر تم واقعی اس سلسلے میں قصوروار نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھرپور تعاون کرو اور خاموش ہو کر بیٹھ رہو۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "میں نے مصور کو بلا بھیجا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئے گا پھر ہم مبینہ لیاقت علی کا خاکہ بنتے ہوئے دیکھیں گے۔ ٹھیک ہے!"

خدا بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر خدا بخش کو اس کے ساتھ بھیج دیا اور کہا۔ ''اس کو حوالات میں رکھو اور ہاں' اس بات کا خیال رکھنا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ واقعی فی الحال ہمارا سرکاری مہمان ہے۔''

''حوالات میں.....؟'' خدا بخش نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور خود کہا۔

''خدا بخش! حوالات میں تم کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کرو گے۔ بے فکر ہو کر جاؤ اور جب تک ہمارا سرکاری مصور نہیں آ جاتا' آرام کرو۔'' پھر میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جاوید! مہمان کے کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کا خاص خیال رکھنا۔ آج کل ویسے بھی سردیوں کا موسم ہے۔''

عام حالات میں اس قسم کی ہدایات کا مطلب بالکل مختلف ہوتا ہے یعنی برعکس۔ مگر میں نے کانسٹیبل کو اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ خدا بخش کے ساتھ کسی قسم کی تفتیشی کارروائی نہ کی جائے۔

دوسرے روز سرکاری مصور نے دو گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسا خاکہ تیار کر لیا جس کو دیکھ کر خدا بخش نے تصدیق کی کہ وہ ہو بہو مبینہ لیاقت علی کا خاکہ تھا۔ خاکہ نگاری بھی ایک حیرت انگیز فن ہے۔ بیان کردہ مختلف علامات اور احوال کی مدد سے کسی شخص کی بہ عین تصویر کشی کرنا واقعی ہنرمندی ہے مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ہنرمندوں کی قدر نہیں کی جاتی ورنہ مغربی ممالک میں ایسے ماہر فن افراد کی دل کھول کر پذیرائی کی جاتی ہے۔

مبینہ لیاقت علی کا خاکہ تیار ہو چکا تھا۔ سرکاری فوٹو گرافر نے مقتول کی تصویر بھی تیار کر کے مجھے دے دی ہوئی تھی۔ اب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ مذکورہ رپورٹ آئندہ روز موصول ہوئی۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول کو عالم بے ہوشی میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا یعنی اسے قتل کرنے سے پیش تر بے ہوشی طاری کرنے والی کوئی چیز کھلائی یا پلائی گئی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مقتول کے قتل کے بعد ہی اسے پارچوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتول کی موت کا وقت نصف شب کے قریب بتایا گیا تھا۔ گویا مقتول کو قتل کرنے کے بعد اس کے ٹکڑے کر کے سیلوفین کی تھیلیوں میں پیک کرنے اور پھر انہیں صندوق میں بھرنے کے لیے قاتل کو اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔

خانیوال کے ریلوے اسٹیشن پر خدا بخش لنگاہ نے وہ چوبی صندوق لگ بھگ تین بجے سہ پہر کو اتارا تھا۔ ساہیوال سے خانیوال تک ٹرین جتنے وقت میں پہنچتی ہے اس کے پیش نظر کہا جا سکتا

ہے کہ مبینہ لیاقت علی دوپہر یا بعد از دوپہر ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ ان تمام حالات اور اندازوں سے ثابت ہوتا تھا کہ قاتل کوئی شقی القلب شخص تھا۔

میں نے اسی روز باقاعدہ تفتیش کا آغاز کر دیا۔ میرے سامنے اس وقت تفتیش کے لیے دو میدان تھے یعنی میاں چنوں کا ریلوے اسٹیشن' مبینہ لیاقت علی جہاں ٹرین سے اترا تھا اور ساہیوال کا ریلوے اسٹیشن' جہاں سے مبینہ لیاقت علی ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ میں نے زیادہ قریبی میدان یعنی میاں چنوں سے کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مہم میں اے ایس آئی جماعت علی کے علاوہ خدا بخش لنگاہ بھی میرے ساتھ تھے۔

ہم تینوں افراد بذریعہ پسنجر ٹرین خانیوال سے میاں چنوں پہنچے۔ میاں چنوں کے پلیٹ فارم سے میں نے پوچھ تاچھ شروع کر دی۔ وہاں موجود قلیوں کو میں نے ایک جگہ جمع کیا پھر مبینہ لیاقت علی کا خاکہ انہیں دکھا کر سوال کیا۔

''دو روز پہلے لگ بھگ دو بجے دوپہر آپ میں سے کسی نے اس شخص کو ٹرین میں سے اترتا اسٹیشن سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

میں اور اے ایس اس وقت وردی میں تھے اس لیے قلی حضرات پوری طرح تعاون کر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر قلی محمد دین نے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کون سی ٹرین کی بات کر رہے ہیں؟''

میں نے بتایا۔ ''وہ ٹرین جو لاہور سے آئی تھی اور کراچی جا رہی تھی۔'' پھر خاکے کو محمد دین کی آنکھوں کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص کا نام لیاقت علی ہے۔ یہ منہ دھونے کے لیے ٹرین سے نیچے اترا تھا مگر پھر سوار نہیں ہوا' ٹرین چلی گئی۔ ہمیں اسی لیاقت علی کی تلاش ہے!''

محمد دین نے نفی میں گردن ہلائی اور مایوسی سے بولا۔ ''جناب! میں نے تو اس شکل صورت کے کسی بھی شخص کو نہیں دیکھا۔''

ایک اور قلی رب نواز نے پوچھا۔ ''لیاقت علی کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی تھا؟''

''ایک دستی تھیلا تھا۔'' میں نے کہا۔

اسی وقت ایک خوانچہ بردار بچہ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں قلیوں کی طرف متوجہ تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بچہ بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک قلیوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا مگر کوئی مفید بات معلوم نہ ہو سکی۔

اس طرف سے مایوس ہو کر میں نے پلیٹ فارم کے دائیں بائیں بنی کھوکھا نما دکانوں سے

معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ میں ایک ایک دکان دار کو لیاقت علی کا قلمی خاکہ دکھا کر اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ خوانچہ بردار بچہ مسلسل میرے تعاقب میں تھا۔

میں نے ایک جگہ رک کر اس بچے کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کی عمر کم و بیش دس سال رہی ہوگی۔ اس کے خوانچے میں ٹافیاں، ریوڑیاں اور سگریٹ وغیرہ کے پیکٹ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ سوہن حلوہ بھی تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس بچے کا نام قدیر تھا۔ میں نے جب اس سے مسلسل تعاقب کے بارے میں استفسار کیا تو وہ معصومیت سے بولا۔

''میرا خیال ہے، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کم سن بچے کو دیکھا اور سوال کیا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کس قسم کی مدد درکار ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آہو جی۔''

میری حیرت دوچند ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ''پھر بتاؤ، تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

قدیر نامی اس بچے نے میرے ہاتھ میں موجود لیاقت علی کے خاکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس بندے کو ڈھونڈ رہے ہیں نا۔''

''ہاں ہاں، مجھے اسی کی تلاش ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے دو روز پہلے یہاں دیکھا تھا؟''

''آہو جی، دیکھا تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس سے کوئی گل بات بھی کی تھی؟''

''میں نے نہیں، پر اس بندے نے مجھ سے بات کی تھی۔''

''کیا بات کی تھی اس نے تم سے؟'' میرے لہجے میں بے چینی کی آمیزش تھی۔ ''کیا اس نے تم سے کوئی چیز خریدی تھی؟''

وہ مطمئن انداز میں بولا۔ ''اس نے مجھ سے ٹافیاں اور سگریٹ خریدے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا تو تمہارے ساتھ ہوتا ہی ہوگا۔ تم یہ چیزیں بیچتے ہو۔ لوگ تم سے یہ چیزیں خریدتے ہوں گے۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جس کی بنا پر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

قدیر نے جواب دیا۔ ''جناب! خاص بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ اسٹیشن سے نکل کر

کہاں گیا ہوگا۔''

میرے لیے قدیر کا یہ جملہ کسی حیرت انگیز انکشاف سے کم نہیں تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ، وہ میاں چنوں کے اسٹیشن سے نکل کر کہاں گیا تھا؟''

قدیر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس شخص نے مجھ سے پہلے ٹافیاں اور سگریٹ خریدے۔ میں نے اپنی چیزوں کی قیمت لے کر باقی پیسے اسے واپس کر دیے مگر اس نے ایک روپیا بطورِ انعام مجھے دیا اور مجھ سے پوچھا کہ یہاں کا بس اڈا اسٹیشن سے کتنی دور ہے۔ میں نے ایک روپیا فوراً اپنی جیب میں ڈالا اور اس سے سوال کیا۔ کون سے اڈے جاؤ گے؟''

اتنا کہہ کر قدیر خاموش ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہاں ایک سے زیادہ بس اڈے ہیں؟''

''آہو جی، یہاں بسوں کے دو اڈے ہیں۔'' قدیر نے جواب دیا۔ ''ایک کو چھوٹا اڈا اور دوسرے کو بڑا اڈا کہتے ہیں۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''لیاقت علی نے تم سے کون سے اڈے کا پتہ پوچھا تھا؟''

''بڑے اڈے کا۔'' قدیر کا جواب نہایت ہی مختصر تھا۔

''کیا اس نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ وہ بڑے اڈے سے کس طرف جانا چاہتا تھا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''یعنی وہ میاں چنوں سے آگے کہاں جا رہا تھا۔''

''بڑے اڈے تک جانے کا مشورہ اسے میں نے ہی دیا تھا۔'' قدیر نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ''اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ میاں چنوں سے آگے کہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں، بڑے اور چھوٹے اڈے سے کہاں کہاں کی بسیں جاتی ہیں۔''

قدیر اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑی باتیں کر رہا تھا۔ جو بچے چھوٹی عمر میں ہی روزگار سے وابستہ ہو جائیں وہ بہ نسبت بہت جلد سیانے ہو جاتے ہیں اور بڑوں کے ساتھ رہتے ہوئے بڑوں ہی کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔ قدیر بھی اپنی باتوں سے پندرہ سولہ سال کا لگتا تھا۔ میں نے گھماؤ پھراؤ کے بجائے براہِ راست اس سے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''قدیر! تم مجھے یہ بتاؤ کہ لیاقت علی یہاں سے آگے کہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا؟''

''میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا پھر کہا۔ ''اس سے پہلے آپ بھی مجھے کوئی انعام دیں۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ کسی بحث میں پڑنے کے بجائے میں نے اپنی جیب میں سے

آٹھ آنے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور کہا۔ ''اب بتاؤ؟''

وہ بولا۔ ''صرف آٹھ آنے!''

میں نے کہا۔ ''یہ میں اپنی حق حلال کی کمائی میں سے دے رہا ہوں اور اپنی خوشی سے دے رہا ہوں ورنہ تم جانتے ہو میں تمہیں اپنے ساتھ تھانے بھی لے کر جا سکتا ہوں جہاں تم ہر بات زائد بتاؤ گے۔ بلا معاوضہ۔''

اس نے آٹھ آنے اپنی جیب میں ڈالے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''مائی باپ کی توبہ جناب! میں تھانے جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کے یہ آٹھ آنے ہی کافی ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا۔ ''لیاقت علی یہاں سے بورے والا جانا چاہتا تھا۔''

''بورے والا!'' میں نے زیر لب دہرایا۔

''ہاں جی' بورے والا۔'' قدیر نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''بورے والا کی طرف جانے والی بسیں بڑے اڈے سے چلتی ہیں جناب۔''

بورے والا' دیہاڑی کے نزدیک پایا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بورے والا اور دیہاڑی ضلع ملتان میں شمار ہوتے تھے۔ اب دیہاڑی ضلع کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور بورے والا' ضلع دیہاڑی میں گنا جاتا ہے۔ شاید یہ دیہاڑی کی تحصیل ہے۔ قدیر سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں چنوں کے بڑے بس اڈے سے بورے والا کے لیے بسیں چلتی تھیں۔

ہم قدیر کو اسٹیشن پر ہی چھوڑ کر عمارت سے باہر نکل آئے۔ اگر قدیر نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا اور لیاقت علی نے بھی قدیر سے جھوٹ نہیں بولا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ لیاقت علی دو روز قبل میاں چنوں سے بس میں بیٹھ کر سیدھا بورے والا پہنچا ہوگا۔

اس بات کا امکان موجود تھا کہ لیاقت علی نے قدیر سے غلط بیانی کی ہو مگر مجھے یقین تھا کہ قدیر نے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں ان میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ اس بات کو بسوں کے بڑے اڈے سے جا کر چیک کیا جا سکتا تھا کہ آیا لیاقت علی وہاں سے بورے والا کے لیے روانہ ہوا تھا یا نہیں۔ اگرچہ یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا تاہم بہرحال مجھے یہ کام تو کرنا ہی تھا۔

بسوں کا بڑا اڈا اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ کر ہم ایک تانگے میں بیٹھے اور اڈے کی جانب روانہ ہو گئے۔ تانگا بان ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم بسوں کے اڈے پر تھے۔

اڈے کے ٹھیکے دار غلام نبی نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ موٹی توند والا ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے اریب قریب لگایا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد آمد کی غرض و غایت بیان کی تو وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا پھر میرے ہم راہیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔

''ملک صاحب! کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ذرا ہمیں خدمت شدمت کا موقع تو دیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں اور جب میں ڈیوٹی پر ہوتا ہوں تو پھر پہلے ڈیوٹی سرانجام دیتا ہوں' بعد میں کوئی اور کام!''

غلام نبی نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس عمل کے دوران میں اس کی چربی دار توند باقاعدہ ڈانس کرنے لگی۔ وہ اپنی ہنسی کو ہنگامی بریک لگاتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میں نے کب کار سرکار میں مداخلت کی بات کی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ اگر آپ آج کا کھانا.....''

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور خود کہا۔ ''اس تکلف کی ضرورت نہیں غلام نبی۔ ہم بس تھوڑی دیر یہاں رک کر واپس چلے جائیں گے۔''

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! یہ آپ کی بات اور نہ ہی میری بات۔ ایسا کرتے ہیں' میں ایک اچھی سی دودھ پتی آپ کو پلواتا ہوں۔''

پھر میرے کچھ کہنے سے پیشتر ہی اس نے اپنے نوعمر ملازم کو آواز دی۔ ''اوئے کاکا اللہ رکھا! جا' دس کے چار پانچ فس کلاس (فرسٹ کلاس) دودھ پتی بنوا لا۔ ذرا جلدی آنا۔ آج ویسے بھی موسم ٹھنڈا ٹھار ہو رہا ہے۔''

میرے استفسار پر ٹھیکے دار غلام نبی نے بتایا کہ میاں چنوں کے بس اسٹینڈ سے مختلف علاقوں کے لیے بسیں چلتی تھیں۔ بس اسٹینڈ سے کچھ فاصلے پر مین روڈ تھی جو شمال مشرق میں لاہور کی جانب اور جنوب مغرب میں خانیوال کی طرف جاتی تھی۔ اس پر لگاتار بسیں چلتی رہتی تھیں۔ ازیں علاوہ میاں چنوں کے اڈے سے تلمبہ' درکھنا' سرائے سدھو' کبیر والا' فاضل شاہ اور بورے والا کی سمت میں وقفے وقفے سے بسیں آتی اور جاتی رہتی تھیں۔

پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''غلام نبی! میں صرف ''میاں چنوں والا'' روٹ کے بارے میں ایک نہایت ہی اہم بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی پوچھیں' آپ اس سلسلے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''دو روز قبل' دوپہر کے بعد ایک مسافر نے یہاں سے بورے والا تک سفر
ہے۔ میں اسی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں؟''

''جناب' تھوڑی وضاحت کریں۔'' غلام نبی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ
مقصد نہیں سمجھ سکا۔''

میں نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''غلام نبی! میں نے جس مسافر کا ذکر کیا
اس کا نام لیاقت علی ہے اور.....'' میں نے اپنی جیب میں سے لیاقت کا علمی خاکہ نکال کر غلام
کے ہاتھ میں تھما دیا ''یہ اسی شخص کا حلیہ ہے۔ یہ خاکہ میں نے اپنے طور پر بنوایا تھا۔''

وہ بغور خاکے کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''میں نے اس شخص کو آج سے پہلے کبھی نہیں
دیکھا۔ آپ اس کے بارے میں کس قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''لیاقت علی نامی اس شخص نے دو روز پہلے اس اڈے سے بورے والا جانے والی بس میں
سفر کیا تھا یا نہیں' میں اس امر کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے غلام نبی کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' اس نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

اسی دوران میں شاندار قسم کی دودھ پتی آ گئی۔ ہم سب نے اپنی اپنی پیالی سنبھال لی۔ چند
ہی چسکی لینے کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے علام نبی کو دیکھا۔ وہ میری نظر کا مطلب سمجھتے ہوئے
کھنکار کر بولا۔

''ملک صاحب! میاں چنوں' بورے والا روٹ پر صرف تین بسیں چلتی ہیں۔ ایک بس
تو گزشتہ دس دن سے خراب پڑی ہے۔ باقی دو میں سے ایک روانہ ہونے ہی والی ہے اور دوسری
پندرہ بیس منٹ بعد یہاں پہنچنے والی ہے۔'' وہ ایک لمحے سانس لینے کو رکا پھر سلسلہ کلام جاری
رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں موجود بس کے کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو یہاں بلاتا ہوں۔ شاید ان سے کوئی
مفید بات معلوم ہو سکے۔''

اس کی تجویز انتہائی معقول اور قابلِ عمل تھی۔ میری تائید حاصل ہوتے ہی اس نے اللہ رکھا
نامی نوعمر ملازم کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''انتی بتی (انتیس بتیس) کے ڈرائیور اور کلینڈر (کنڈکٹر) کو یہاں بلا کر لا۔''

اللہ رکھا۔ ''ہلا جی'' کہتے ہوئے ٹھیکے دار غلام نبی کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر
کے بعد نمبر انتیس بتیس (2932) کا کنڈکٹر اور ڈرائیور میرے سامنے کھڑے تھے۔ غلام نبی نے

انہیں میرے بارے میں مختصراً بتایا اور کہا۔

''ملک صاحب! تم دونوں سے ایک مسافر کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے لیاقت علی کی خاکہ نما تصویر ان دونوں کو باری باری دکھائی اور کہا۔ ''کیا تم میں
سے کسی نے دو روز پہلے اس شخص کو اپنی بس میں سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے؟''

ڈرائیور بشیر احمد نے سرسری انداز میں تصویر کا جائزہ لینے کے بعد اسے کنڈکٹر کی طرف
بڑھا دیا اور بے پروائی سے بولا۔ ''لو اکرم! تم دیکھو اس بندے کو۔ سواریاں تم ہی چڑھاتے ہو اور
کرایہ اکٹھا کرنا بھی تمہارا ہی کام ہے۔ شاید تمہیں اس کے بارے میں کچھ یاد ہو۔ میں تو نہیں
جانتا اسے۔''

اکرم نامی بس کنڈکٹر نے تھوڑی دیر خاکے کا معائنہ کیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
''مجھے تو یہ چہرہ دیکھا ہوا نہیں لگتا۔'' پھر غیر ارادی طور پر اس نے ایک اہم سوال کیا۔ ''یہ مسافر
کتنے بجے بس پر سوار ہوا تھا؟''

میں پہلے بتا چکا تھا کہ لیاقت دوپہر کے بعد بس میں بیٹھا تھا لیکن شاید انہوں نے میری
بات پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے لیاقت کے بس میں سوار ہونے کا وقت دہرایا تو بشیر احمد نے دو
ٹوک الفاظ میں کہا۔

''جناب! ہماری بس تو اس وقت میاں چنوں اور بورے والا کے درمیان تھی۔ اس کا
مطلب یہی ہے کہ یہ بندہ ہماری بس میں نہیں سوار ہوا تھا۔''

ڈرائیور بشیر احمد کی بات میں وزن تھا۔ ٹھیکے دار غلام نبی نے بشیر احمد سے پوچھا۔ ''بشیرے!
چونتی چونٹھ (چونتیس چونسٹھ) کتنے بجے تک اڈے میں پہنچ جائے گی؟''

اس نے انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا۔ ''بس جی' ہمارے نکلنے کے پندرہ بیس منٹ
بعد آ ہی جائے گی۔''

''تمہارے نکلنے کا وقت تو ہو گیا ہے۔'' غلام نبی نے کہا۔

''بس جناب! بس اسٹارٹ ہے۔ ہم نکلنے ہی والے ہیں۔'' بشیر احمد نے بات ختم کرنے
والے انداز میں کہا پھر کنڈکٹر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چل اوئے اکرم' ہن ٹیم (ٹائم) کیں
اے۔''

ان کے جانے کے بعد غلام نبی نے کہا۔ ''ملک صاحب! دوسری بس یہاں پہنچنے ہی والی
ہے۔ پھر پتہ چل جائے گا ہر بات کا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا جناب! کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے؟''

''بات تو گڑبڑ والی ہی ہے غلام نبی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا اس بندے کو کوئی حادثہ شادثہ پیش آ گیا ہے؟''

''شاید ایسا ہو گیا ہو۔'' میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

''آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خیر' میں اصرار نہیں کروں گا۔ آپ اپنے معاملات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔''

''یہ تم نے عقل مندی کی بات کی ہے غلام نبی!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ پوچھا۔ ''کیا روزانہ اسی وقت (3464) نمبر کی بس یہاں پہنچتی ہے؟''

میں اس سوال سے دراصل لیاقت علی کی میاں چنوں سے روانگی کے بارے میں اندازہ چاہتا تھا۔ غلام نبی نے جواب دیا۔ ''جناب! تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ہاں بھگ اسی وقت وہ بس میاں چنوں کے اڈے پر پہنچتی ہے۔''

''یہاں اس کا قیام کتنی دیر کا ہوتا ہے؟''

''تقریباً ایک گھنٹا'' غلام نبی نے جواب دیا۔ ''بعض اوقات بس کو دو گھنٹے بھی رکنا ہے۔ بس جی اس کا دارومدار سواریوں پر ہے۔ جب بس بھر جاتی ہے' پھر ہم اسے ایک منٹ اڈے میں رکنے نہیں دیتے۔''

ہم ہلکی پھلکی باتوں سے وقت گزار رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد نوعمر ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ ہماری مطلوبہ بس اڈے میں داخل ہو چکی تھی۔ غلام نبی نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

''لو جی ملک صاحب! گل بن گئی۔''

پھر وہ ملازم لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''جا' اللہ رکھا! اس بس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کو اپنے ساتھ میرے پاس لے کر آ جا۔''

اللہ رکھا اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑا۔ میں بے چینی سے آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد ڈرائیور فتح محمد اور کنڈکٹر علی نواز ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا گیا جو اس سے قبل بشیر احمد اور اکرم کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس کے نہایت ہی مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

بس نمبر چونتیس چونسٹھ کے کنڈکٹر اور ڈرائیور دونوں نے لیاقت علی کے خاکے کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ ڈرائیور فتح محمد نے کنڈکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''علی نواز! یہ تو وہی بندہ ہے جس کا اس روز ایک مسافر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا وہ واقعہ۔ مجبوراً ہمیں بھی بس روکنا پڑی تھی۔''

''مجھے چنگی طرح یاد ہے استاد جی!'' علی نواز نے تائیدی لہجے میں کہا۔

میں نے فتح محمد ڈرائیور سے پوچھا۔ ''لیاقت علی کا دوسرے مسافر سے کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

''کون لیاقت علی جی!'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے خاکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس شخص کا نام لیاقت علی ہے۔''

''اچھا جی!'' اس نے آنکھیں گھمائیں پھر پوچھا۔ ''کیا آپ اس بدتمیز کو جانتے ہیں؟''

شاید سوال کرنا اس کی عادت میں شامل تھا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''فتح محمد! تھانے دار تم ہو یا میں؟''

''تھانے دار تو آپ ہی ہیں جی!'' وہ قدرے محتاط نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم یہ جانتے ہو کہ تھانے دار میں ہوں تو پھر سوال بھی مجھے ہی کرنے دو۔ تم صرف میرے سوالوں کے سیدھے اور سچے جواب دو۔''

''اچھا جی!'' وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔ ''اب میں کوئی بات نہیں پوچھوں گا۔ آپ مجھ سے سوال کریں۔''

میں نے کہا۔ ''سوال میں کر چکا ہوں..... لیاقت علی کا کسی مسافر سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

''وہ کھڑکی کی جانب والی سیٹ پر بیٹھنے کا معاملہ تھا۔'' فتح محمد کے بجائے علی نواز نے بتایا۔ ''کافی دیر تک ان دونوں میں تُو تکار ہوتی رہی۔ مجبوراً ہمیں ایک جگہ راستے میں بس روکنا پڑی۔ ہم نے ان دونوں سے درخواست کی کہ وہ ہماری بس سے اتر جائیں تو بہتر ہے۔ میں نے ان دونوں کا کرایہ بھی واپس کرنے کی پیش کش کر دی تھی۔''

''پھر کیا وہ دونوں بس سے اتر گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''توبہ کریں جی!'' ڈرائیور فتح محمد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا لیاقت تو بدمعاشی پر اتر آیا تھا۔ کہنے لگا' میں کرایہ واپس نہیں لوں گا۔ آپ کو ہر صورت مجھے میری منزل پر پہنچانا ہوگا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے دوسرے مسافر نے پسپائی اختیار کر لی اور بس سے اتر گیا۔ میں نے اس کا کرایہ واپس کر دیا بے چارہ کوئی شریف آدمی تھا۔ لڑائی جھگڑے سے دور

رہنے والا۔ لیاقت واپس بس میں بیٹھا اور ہم نے بس بورے والہ کی جانب بڑھا دی۔"

میں نے اس تفصیل کو سننے کے بعد سوال کیا۔ "فتح محمد! اس کے بعد تو پھر لیاقت علی سے گڑبڑ نہیں کی؟"

"نہیں جناب!" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

منہ برا بنانے کی وجہ اس تلخ واقعے کی یاد تھی جو میرے استفسار پر تازہ ہوگئی تھی۔ میں نے محمد سے پوچھا۔ "کیا لیاقت علی کو آپ لوگوں نے بورے والا کے بس اسٹینڈ پر ہی اتارا تھا یا راستے ہی میں کہیں اتر گیا تھا؟"

"وہ راستے میں تو کہیں نہیں اترا۔" کنڈیکٹر علی نواز نے بتایا۔ "مگر اڈے تک بھی نہیں گیا تھا۔" پھر خود ہی اس نے اپنی بات کی وضاحت بھی کردی۔ "جناب تھانے دار صاحب لیاقت علی نامی یہ شخص بورے والا کی حدود شروع ہوتے ہی ایک چوک (چوراہے) پر بس سے اتر گیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا لیاقت علی بورے والا کا رہنے والا ہے؟"

یہ سوال ان سے پوچھنا بے معنی تھا مگر ایک فوری خیال کے تحت میں نے یہ سوال کیا۔ جواب میں علی نواز نے کہا۔ "یہ تو ہم نہیں جانتے جناب!"

"اس کا مطلب ہے، وہ میاں چنوں کا باسی ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ہر موجود ہر شخص کو دیکھا۔

ان کے سروں کی جنبش نے وضاحت کر دی کہ وہ لیاقت علی کے بارے میں صفر کے معلومات رکھتے تھے۔ میں درحقیقت یہی جاننا چاہتا تھا کہ وہ لوگ لیاقت علی کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ میاں چنوں کوئی بہت بڑی جگہ کا نام نہیں خصوصاً ان دنوں تو یہ بہت مختصر علاقہ تھا۔ غلام نبی نے باتوں کے درمیان مجھے بتایا تھا کہ وہ کم وبیش میاں چنوں کے تمام باسیوں سے بہ خوبی واقف ہے۔ علی نواز اور فتح محمد کا تعلق بھی میاں چنوں ہی سے تھا۔ اگر وہ تینوں لیاقت علی کے بارے میں ناواقفیت کا اظہار کر رہے تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا..... یعنی لیاقت علی کا تعلق کسی بھی طور میاں چنوں سے نہیں تھا۔

اس صورتِ حال میں ذہن میں دو ہی نام آتے تھے۔ پہلے نمبر پر ساہیوال اور دوسرے پر بورے والا۔ لیاقت علی انہی دو جگہوں میں سے کہیں کا رہنے والا ہو سکتا تھا۔ لیاقت علی تک پہنچنے کے لیے ساہیوال اور بورے والا کو کھنگالنا ضروری تھا۔

میں غلام نبی ٹھیکے دار کا شکریہ ادا کر کے بس اسٹینڈ سے باہر نکل آیا۔ واپسی کے راستے میں اے ایس آئی جماعت علی نے مجھ سے پوچھا۔ "ملک صاحب! معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ گیا ہے۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ تو میرا ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے جماعت علی! میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اور جہاں تک معاملے کا تعلق ہے، وہ میرے خیال میں پہلے سے بہتر ہوگیا ہے۔ کم از کم اب میرے سامنے لائن آف ایکشن واضح ہوگئی ہے۔"

"آپ آئندہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"آئندہ میرے ٹارگٹ ساہیوال اور بورے والا ہوں گے۔" میں نے پُرخیال انداز میں جواب دیا۔ "جب تک مبینہ لیاقت علی میرے قابو میں نہیں آ جاتا، صندوق کا راز منکشف نہیں ہو سکتا۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ "لیاقت علی نے ساہیوال سے میاں چنوں تک ٹرین میں سفر کیا پھر وہ منہ دھونے کا بہانہ کر کے ٹرین سے اتر گیا۔ ازاں بعد بہ ذریعہ بس وہ میاں چنوں سے بورے والا روانہ ہوگیا۔ اس سے تو یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا تعلق بورے والا سے ہی ہے۔"

"اس سے قطعاً یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے، وہ بورے والا سے کسی دوسری بس میں بیٹھ کر کہیں اور نکل گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ ساہیوال ہی کا رہنے والا ہو اور گھوم پھر کر واپس ساہیوال پہنچ گیا ہو۔ اس کے علاوہ تم ایک خاص بات کو نظر انداز کر رہے ہو!"

میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ اے ایس آئی کی آنکھوں میں سوال تھا۔ میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیاقت علی ساہیوال سے اکیلا ٹرین میں سوار نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پاس ایک چوبی صندوق بھی تھا۔ ایک ایسا صندوق جس میں ایک جوان شخص کی ٹکڑے ٹکڑے لاش سیلوفین کی تھیلیوں میں پیک کر کے بند کر دی گئی تھی۔"

میں نے ایک لمحہ رک کر جماعت علی اور خدا بخش لنگاہ کی جانب دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیاقت علی نے خدا بخش کو بتایا تھا کہ وہ کسی شادی میں شرکت کرنے روہڑی جا رہا تھا۔ لیاقت کا منہ دھونے کے بہانے میاں چنوں کے ریلوے اسٹیشن پر اترنا، بس میں بیٹھ کر بورے والا کی جانب روانہ ہونا، ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں یعنی وہ صندوق میں بند "خوف ناک حقیقت" سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر وہ سہواً میاں چنوں کے پلیٹ فارم پر رہ جاتا تو پھر پہلی

فرصت میں اسے صندوق کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرنا چاہیے تھی کیونکہ بہ قول اس کے صندوق میں قیمتی کپڑے اور دوسری اشیا بھری ہوئی تھیں مگر فی الواقعہ ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ لیاقت نے خدا بخش کو روہڑی جانے کی جھوٹی کہانی سنائی' منہ دھونے کے بہانے میاں چنوں کے اسٹیشن پر اترا اور بڑے ہی اطمینان کے ساتھ ایک بس میں بیٹھ کر بورے والا روانہ ہوگیا۔ وہ ایک شاطر اور چالاک شخص ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا مگر.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا اور اپنی بات کو مکمل کر دیا۔ ''مگر اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔''

''یہی تو مشکل ہے'' اے ایس آئی نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا ''لیاقت کا سراغ لگانے کے لیے ہمارے پاس کوئی اشارہ نہیں ہے۔''

''اشارہ تو ہمیں تلاش کرنا ہوگا'' میں نے خیال افروز لہجے میں کہا۔

''وہ کس طرح ملک صاحب؟'' اے ایس آئی نے استفسار کیا۔

''وہ اس طرح'' میں چلتے چلتے رک گیا اور کہا۔ ہم واپس بس اسٹینڈ جا رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' اے ایس آئی نے سوال کیا۔

خدا بخش نے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! واپسی کی وجہ کیا ہے؟''

وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی رک گئے تھے اور الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔

''میں چونتیس چونسٹھ کے ڈرائیور سے ایک خاص بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں مجھ سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے اس لیے خاموشی سے میرے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ چند منٹ بعد ہم دوبارہ ٹھیکے دار غلام نبی کے کمرے میں موجود تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ڈرائیور فتح محمد اور کنڈکٹر محمد نواز ابھی تک غلام نبی کے پاس ہی تھے۔ وہ بھی ہمیں دیکھتے ہی ٹھیکے دار کی تقلید میں اسٹینڈ اپ ہوگئے۔

غلام نبی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''حکم ملک صاحب!''

میں نے کہا۔ ''حکم شکم کچھ نہیں ہے غلام نبی' میں بس فتح محمد ایک سوال کرنے آیا ہوں۔''

''جی پوچھیں تھانے دار صاحب!'' فتح محمد ڈرائیور میری جانب متوجہ ہوگیا۔

میں نے پوچھا۔ ''فتح محمد! جس روز لیاقت علی نامی اس بدتمیز اور جھگڑالو شخص نے تمہاری بس میں سفر کیا تھا' اس دن تم لوگ کتنے بجے بورے والا پہنچے تھے؟''

وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔ ''تقریباً ساڑھے چار بجے شام۔''

''کیا میاں چنوں سے بورے والا کا سفر ڈھائی گھنٹے کا ہے؟''

''سفر تو اس سے کم وقت کا ہے جناب!'' فتح محمد نے جواب دیا۔ ''مگر اس روز راستے میں ایک جگہ بس خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے بہت سا وقت ضائع ہوگیا۔''

''بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا کہ مذکورہ روز تمہاری بس کتنے بجے بورے والا پہنچی تھی۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہی بتایا تھا نا کہ لیاقت علی بس اسٹینڈ سے تھوڑا پہلے ہی ایک چوراہے پر اتر گیا تھا؟''

فتح محمد نے کہا۔ ''یہ بات آپ کو کلینڈر علی نواز نے بتائی تھی۔ بہرحال یہی حقیقت ہے۔ لیاقت علی بورے والا کی حدود سے پہلے ہی اتر گیا تھا۔''

ہم ایک مرتبہ پھر میاں چنوں کے بس اسٹینڈ سے باہر نکل آئے۔

اے ایس آئی نے سوال کیا۔ ''ملک صاحب! ان معلومات سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟''

''فائدے اور نقصان کا فیصلہ میں تھانے پہنچ کر کروں گا'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''فی الحال تو تم یہ سمجھ کہ ہم واپس خانیوال جا رہے ہیں۔''

میرے رویے سے اے ایس آئی سمجھ گیا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو میں خدا بخش لنگاہ کی موجودگی میں نہیں کرنا چاہتا۔ مصلحت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے اس نے چپ سادھ لی۔

کچھ دیر کے بعد خدا بخش نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! میرا خیال ہے' آپ کو اب میری مزید ضرورت تو نہیں ہوگی۔ خانیوال سے میں سیدھا کبیر والا چلا جاؤں گا۔''

''تم نے یہ فیصلہ کس طرح کر لیا کہ مجھے تمہاری مزید ضرورت نہیں رہی؟'' میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ..... وہ..... جناب! اب تو لیاقت کے بارے میں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ وہ بورے والا گیا تھا۔''

''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے خدا بخش؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''م..... میرا مطلب ہے' میری بات تو سچی ثابت ہوگئی۔'' وہ بے ترتیب لہجے میں بولا۔ ''لیاقت علی میاں چنوں کے اسٹیشن پر اترا تھا۔ اب آگے وہ کہاں اور کیوں گیا ہے اس سے میرا کیا تعلق۔ میں تو اس معاملے میں بے قصور ہوں جناب!''

''تمہاری بے گناہی کے بارے میں' مَیں اس وقت فیصلہ کروں گا جب لیاقت علی میرے ہاتھ آ جائے گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اور جب تک ایسا ہو نہیں جاتا' تم میری نظر کے سامنے رہو گے۔ اگر واقعی تم صندوق والے معاملے میں ملوث نہ پائے گئے تو پھر میں تمہیں بری ہو جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

''جانے وہ وقت کب آئے گا۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے قطعیت سے کہا۔ ''انشاءاللہ' بہت جلد وہ وقت آئے گا۔''

اسی شام ہم اپنے تھانے خانیوال پہنچ گئے۔

جب خدا بخش کو حوالات میں آرام کرنے کی غرض سے پہنچا دیا گیا تو اے ایس آئی میرے کمرے میں آ گیا اور آتے ہی مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! میں نے محسوس کیا ہے' آپ اپنے دل میں ایک لائحہ عمل تیار کر چکے ہیں۔ کیا میں غلط محسوس کر رہا ہوں۔''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ تم بالکل درست محسوس ہو رہے جماعت علی۔ میں واقعی ایک خاص لائحہ عمل ترتیب دے چکا ہوں۔''

''مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتائیں گے؟''

''ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ تم بھی اس سے متعلق ہو۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اے ایس آئی کو اپنی پلاننگ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ''جماعت علی! تم کل صبح دو سپاہیوں کے ساتھ بورے والا جاؤ گے۔ میں تمہیں بورے والا کے تھانہ انچارج کے نام ایک خصوصی رقعہ بھی لکھ دوں گا۔ تمہیں وہاں جس قسم کی بھی مدد کی ضرورت ہوگی' وہ تمہیں مذکورہ تھانے دار ہی کرے گا۔ تمہیں وہاں لیاقت علی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ چاہے اس کام میں ایک سے زیادہ دن لگ جائیں۔ اس دوران میں تم بورے والا کے تھانہ انچارج کے مہمان رہو گے۔ میں رقعے میں اس بات کی وضاحت کر دوں گا۔''

میں چند لمحے سانس لینے کو رکا پھر اپنا بیان جاری رکھا۔ ''میں نے لیاقت علی کا جو قلمی خاکہ بنوایا ہے' کل اس کی مزید کاپیاں تیار کروا دوں گا۔ ایک کاپی تم اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے۔ یاد رکھو اس کام میں تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔''

''میں ہر قسم کی احتیاط کو ملحوظ رکھوں گا جناب!'' اے ایس آئی نے پُر وثوق لہجے میں مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات کا اور خیال رکھنا۔ تھانے میں کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کل کہاں اور کس مقصد سے جا رہے ہو۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''میں آپ کی ہدایت کا پورا پورا خیال رکھوں گا جناب!'' اے ایس آئی جماعت علی نے کہا۔ ''میرے ساتھ جانے والے سپاہیوں کو بھی ایسی ہی احتیاط کی تاکید کرنا ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ جواد اور وقار جائیں گے اور میں انہیں ہر بات پوری تفصیل سے سمجھا دوں گا' تم اس کی فکر نہ کرو۔''

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ ''میں کل ساہیوال جاؤں گا مگر اس سے پہلے مجھے ایس پی علاقہ کو رپورٹ کرنا ہے۔ ساہیوال جانے کا فیصلہ ایس پی صاحب سے ملنے کے بعد ہی ہوگا۔''

''آپ کی عدم موجودگی میں تھانے کا انتظام و انصرام کون سنبھالے گا؟'' جماعت علی نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''سب انسپکٹر جمشید رانا خاصا ہونہار پولیس افسر ہے۔ میں اسے تمام امور سمجھا دوں گا۔ مجھے یقین ہے' وہ تمام معاملات سنبھال لے گا۔'' ایک لمحے کے وقفے سے میں نے اضافہ کیا۔ ''ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ میں کل ہی چلا جاؤں..... اور اگر گیا بھی تو شام تک واپس آ جاؤں گا۔ دیکھیں' ایس پی صاحب کیا مشورہ دیتے ہیں۔''

اس رات ہم کافی دیر تک نامعلوم مقتول اور گم شدہ قاتل کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتے رہے پھر میں آرام کرنے کی غرض سے اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا۔

دوسرے روز ساڑھے نو بجے میں نے اے ایس آئی کو بورے والا روانہ کر دیا۔ اتفاق سے گزشتہ رات سرکاری مصور تھانے آ گیا تھا اور میں نے لگے ہاتھ رات ہی میں لیاقت علی کے اسکیچ کی ایک کاپی ہنگامی طور پر بنوالی تھی جو اے ایس آئی اپنے ساتھ بورے والا لے گیا تھا۔

میں نے کہانی کے شروع میں بتایا ہے کہ یہ واقعہ ماہ فروری کے آخری ایام میں پیش آیا تھا تاہم مجھے بالکل درست تاریخ یاد نہیں رہی چنانچہ واقعات کے تسلسل اور ترتیب کی خاطر ہم وقوعہ کی تاریخ چھبیس فروری مقرر کر لیتے ہیں۔ یہ ایک فرضی تاریخ ہوگی مگر اس سے اصل معاملے پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کے مطابق نامعلوم شخص کی موت پچیس اور چھبیس فروری کی درمیانی

شب کو واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے موت کا وقت نصف شب کے لگ بھگ
تھا۔ اس حساب سے نامعلوم شخص کی موت واقع ہوئے چار روز گزر چکے تھے۔

میں نے پروگرام کے مطابق ایس پی صاحب سے ملاقات کی اور اب تک کی اپنی
گزاری سے انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے میری کارکردگی کو سراہا اور میرے ساہیوال جانے
حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''صفدر حیات! میں آج ہی ساہیوال کے اعلیٰ سرکاری افسر سے اس سلسلے میں فون پر بات
کروں گا۔ تمہیں اپنے کام میں اگر کہیں کوئی رکاوٹ محسوس ہو تو تم متعلقہ تھانے سے مدد حاصل
سکتے ہو۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

انہوں نے پوچھا۔ ''تم ساہیوال کب جانا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''سر! آج کا آدھا دن تو گزر گیا۔ میں کل ہی جا سکوں گا۔ ممکن ہے' کل تک
اے ایس آئی کی طرف سے کوئی مفید اطلاع مل جائے۔''

میں نے ایس پی صاحب کو اے ایس آئی کی بورے والا روانگی کے بارے میں تفصیلاً آگاہ
کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں میاں چنوں کے بس اسٹینڈ سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے
میں بھی بتایا تھا۔ ایس پی صاحب میرے کام سے مطمئن تھے' انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے' تم انہی خطوط پر تفتیش جاری رکھو۔ میں آج ہی ساہیوال بات کر کے تمہارے
بارے میں بتا دوں گا۔ تم وہاں کسی قسم کے مسئلے سے دوچار نہیں ہو گے۔''

پھر ایس پی صاحب نے مجھے اس افسر کا نام اور عہدہ بھی بتا دیا جس سے وہ میرے بارے
میں فون پر بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ واقعی ہمارے محکمے کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔

میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''سر! اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں پہلے اپنے طور پر
ہلکے پھلکے انداز میں کام کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کہیں مجھے دشواری محسوس ہوئی تو پھر میں
بااختیار لوگوں سے مدد کی درخواست کروں گا۔''

''او کے' دیٹس رائٹ'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''صفدر حیات! مجھے تمہارے
جیسے پولیس افسروں پر ناز ہے۔ میں جانتا ہوں' تم کسی بھی کیس کو حل کرنے کے لیے اپنی بہترین
صلاحیتیں صرف کرتے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اکثر کامیابی تمہارے قدم چومتی ہے۔ وش یو
گڈ لک!''

میں نے ''تھینک یو سر!'' کہنے کے بعد انہیں سلیوٹ کیا۔

ایس پی صاحب نے بہ طور خاص مجھ سے پر جوش مصافحہ کیا اور میں ان کے دفتر سے باہر
نکل آیا۔ ایس پی صاحب کے تعاون آمیز رویے نے میرا دل بڑھا دیا تھا۔ دل کے بڑھنے سے
مراد اس کا سائز نہیں ہے بلکہ وہ حوصلہ ہے جو دل کے نہاں خانوں میں پایا جاتا ہے

تین مارچ کی صبح میں حوالدار میر داد کے ہم راہ ساہیوال کے لیے خانیوال سے روانہ ہو گیا۔
دو مارچ کی رات تک بورے والا سے کوئی اہم اطلاع نہیں آئی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ اے
ایس آئی جماعت علی کو ابھی کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

ہم لگ بھگ دس بجے ساہیوال پہنچ گئے۔ میں نے حسب پروگرام اپنی تفتیش کا آغاز
ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن سے کیا۔ اس وقت ہم دونوں سادہ لباس میں تھے۔ میں نے اسٹیشن
ماسٹر سے اپنا تعارف کروایا اور تعاون کی درخواست کی۔ وہ سراپا تعاون نظر آنے لگا۔ میں حوالدار
میر داد کے ساتھ بکنگ کلرک کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس وقت فارغ ہی بیٹھا تھا۔

میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام عبدالخالق بتایا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اسٹیشن
ماسٹر کی ہدایات اس تک پہنچ چکی تھیں اس لیے وہ پوری طرح میری جانب متوجہ تھا۔ میں نے اس
سے پہلا سوال کیا۔

''باؤ عبدالخالق! تمہاری یادداشت کیسی ہے؟''

ٹکٹ بابو ہونے کے ناتے وہ وہاں باؤ عبدالخالق کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس نے
میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''میری یادداشت خیر سے ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔''

''میں تمہاری ٹھیک ٹھاک قسم کی یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے
چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چھبیس فروری کی دوپہر کو اس اسٹیشن سے ایک ٹرین کراچی کے
لیے روانہ ہوئی تھی۔ مذکورہ ٹرین لاہور سے یہاں پہنچی تھی۔ ساہیوال ریلوے اسٹیشن سے اس ٹرین
میں ایک مسافر سوار ہوا تھا۔ ظاہر ہے' اس مسافر نے ٹکٹ بھی لیا ہو گا اور یقیناً تم ہی سے لیا ہو گا۔''

اس بات کی میں پہلے ہی تسلی کر چکا تھا کہ وقوعہ کے روز دوپہر کے وقت ٹکٹ ونڈو پر
عبدالخالق ہی کی ڈیوٹی تھی۔

عبدالخالق نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرا تو کام ہی
ٹکٹ دینا ہے اور مسافر ٹکٹ لے کر ہی ٹرین میں سوار ہوتے ہیں۔ اس میں میری یادداشت کا
امتحان کہاں سے آ گیا جناب!''

''تمہاری یادداشت کا امتحان یہ ہے کہ تمہیں اس شخص کو شناخت کرنا ہے۔'' میں نے
''اس شخص کا نام لیاقت علی ہے اور اس کے پاس سامان کی صورت میں لکڑی کا ایک صندوق تھا
وہ بولا۔ ''میں ٹکٹ دیتے ہوئے مسافروں کا نام نہیں پوچھتا اور نہ ہی ان کے سامان کو
سے دیکھتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''لیاقت نامی اس شخص نے ساہیوال سے روہڑی جنکشن تک کا ٹکٹ لیا تھا
وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے لیاقت علی کا قلی خا
کھڑکی سے اندر جھانکا دیا اور کہا۔ ''اس تصویر کو دیکھ کر تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟''

وہ خاکے کو یہ غور دیکھتے ہوئے بولا۔ شکل تو کچھ دیکھی ہوئی لگ رہی ہے لیکن یہ یاد نہیں
رہا کہ اس شخص کو کہاں دیکھا ہے!''

''اس کا مطلب ہے عبدالخالق!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہا
یادداشت ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ یہ تصویری خاکہ اس مسافر لیاقت علی کا ہے۔''

وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میں نے پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ٹکٹ د
ہوئے میں مسافروں کے حلیے وغیرہ پر دھیان نہیں دیتا۔''

''مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ یہ شکل کچھ دیکھی ہوئی لگ رہی ہے۔''

''ہاں' میں نے ایسا کہا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اب بھی
ہی محسوس کر رہا ہوں۔ شاید یہ میرا لاشعوری احساس ہو۔ میں اس احساس کی وضاحت کرنے
قاصر ہوں۔''

میں نے مذکورہ خاکہ عبدالخالق سے واپس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اس تعاون کا
بہت شکریہ عبدالخالق۔''

میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے مڑا ہی تھا کہ اپنے عقب میں ایک دراز قامت قلی کو دیکھ
چونک پڑا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جب میں ٹکٹ کلرک عبدالخالق سے بات چیت کر
تھا' اس وقت اس قلی کی پوری توجہ ہماری ہی طرف لگی ہوئی تھی کیونکہ مجھ سے نگاہ ملتے ہی اس
کہا۔

''معاملہ کیا ہے باؤ جی! آپ کس مسافر کے بارے میں کچھ پرتیت کر رہے ہیں؟''

ٹکٹ گھر کے اندر سے عبدالخالق کی آواز آئی۔ اس نے مذکورہ قلی کو مخاطب کرتے ہو
تھا۔ ''نظام دین چاچا! اگر تم ان صاحب کی کچھ مدد کر سکتے ہو تو کر دو۔ یہ کسی مسافر کے با

میں پوچھ رہے ہیں جس کے پاس لکڑی کا صندوق تھا۔''

قلی نے کہا۔ ''اسی وجہ سے تو میں آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ آپ لکڑی کے کسی
صندوق کا ذکر کر رہے تھے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں
جناب؟''

''نظام دین! میں اس مسافر کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے
لیاقت علی کا خاکہ اس کے سامنے کر دیا۔ ''مورخہ چھبیس فروری کو اس نے ساہیوال سے روہڑی تک
کا ٹکٹ لیا تھا اور دوپہر کے وقت ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ اس کے پاس سامان کے نام پر لکڑی کا
ایک صندوق اور ایک دستی تھیلا تھا۔''

نظام دین نے خاکہ مجھے واپس کرتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''جناب! مجھے اچھی
طرح یاد ہے۔ اس مسافر نے واقعی اس اسٹیشن سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا کہ
وہ روہڑی گیا تھا۔ ہاں' اتنا مجھے یاد ہے' میں نے اسے کراچی جانے والی ٹرین میں سوار کروایا تھا۔
میں نے ہی اسٹیشن کے باہر سے اس کا سامان اٹھا کر ٹرین تک پہنچایا تھا۔''

نظام دین قلی کے جواب نے مجھے حد درجہ اطمینان سے نوازا۔ میں نے کریدنے والے
والے انداز میں کہا۔ ''نظام دین! اس مسافر کا نام لیاقت علی ہے۔ تم اس شخص کے بارے میں کیا
جانتے ہو؟''

''میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''کیا یہ شخص یہیں ساہیوال کا رہنے والا ہے؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا' اس شخص کے بارے میں۔''

''تم یقین سے کس شخص کے بارے میں کہہ سکتے ہو؟'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں
سوال کیا۔

وہ معتدل انداز میں گویا ہوا۔ ''جناب! اس سلسلے میں تو میں مہر منظور حسین کے بارے میں
ہی یقین سے کچھ کہہ سکتا ہوں۔''

''مہر منظور حسین!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ ''بھئی' یہ مہر صاحب بیچ میں
کہاں سے آ گئے؟''

نظام دین نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ ''جناب! مہر صاحب بیچ میں نہیں آئے بلکہ وہ
تو آپ کے مطلوبہ بندے کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک آئے تھے۔''

''یعنی لیاقت علی کے ساتھ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر مہر صاحب کے مہمان کا نام لیاقت علی ہے تو پھر یہی سمجھ لیں۔'' نظام دین نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم مہر منظور حسین کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''مہر منظور حسین' مہر ظہور حسین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔'' نظام دین نے بتایا۔ ''وہ یوسف والا کے مشہور زمیندار ہیں۔ وہاں ان کا ایک بہت بڑا ڈیری فارم بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا نظام دین' تم نے تھوڑی دیر پہلے لیاقت علی کو مہر منظور کا مہمان کہا ہے بھئی' یہ کیا چکر ہے؟''

''کوئی چکر نہیں جناب!'' وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نے جیسا سنا تھا' ویسا ہی آپ کو بتا دیا۔''

''ذرا اپنی بات کی وضاحت کرو۔''

وہ بولا۔ ''میں نے آپ کے مطلوبہ بندے کو مہر منظور کے ساتھ اسٹیشن کے باہر ایک بگھی سجائے تانگے سے اترتے دیکھا تھا۔ ان کے پاس صندوق بھی تھا۔ جناب! ہم تو مسافر کو دیکھ کر ہی پہچان لیتے ہیں۔ میں مہر صاحب کو تو جانتا تھا۔ میں نے یہی سمجھا' ان کے ساتھ جو بندہ ہے' اسے ٹرین پر چڑھانے آئے ہیں۔ میں سامان اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ پہلے مہر صاحب کو سلام کیا پھر سامان اٹھا لیا۔ میرے پوچھنے پر ہی مہر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کا لیاقت نامی بندہ مہر صاحب کا مہمان تھا۔ بس جی' اتنی سی بات ہے۔''

وہ جسے اتنی ہی بات کہہ رہا تھا' وہ میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ اس نے تو میرے لیے مفید معلومات و اطلاعات کا دریا بہا دیا تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

''نظام دین! کیا مہر صاحب' لیاقت کو اسٹیشن پر چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے یا ٹرین کے روانہ ہونے تک انہوں نے انتظار کیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''جناب! مہر صاحب ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مہر منظور حسین یوسف والا میں کہاں رہتے ہیں؟''

''بس جی وہ یوسف والا ہی میں رہتے ہیں۔'' نظام دین نے جواب دیا۔ ''مہر ظہور حسین یوسف والا کی مشہور شخصیت ہیں۔ آپ کسی سے بھی ان کی حویلی کا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔''

''ان معلومات کا بہت بہت شکریہ نظام دین!'' میں نے کہا۔

''خالی خولی سوکھے شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔ جناب!'' نظام دین نے معنی خیز لہجے میں مجھے دیکھا۔

میں اس کی نگاہ کا یہی مطلب سمجھا کہ وہ مجھ سے کوئی انعام وغیرہ کا طلب گار ہے۔ میں اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ میرا مقصد نہیں سمجھے۔''

جیب کی طرف اٹھا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے نظام دین کو دیکھا اور کہا۔

''پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ آپ مجھے صرف یہ بتا کر تسلی دے دیں کہ سب خیر خیریت ہے۔''

میں نظام دین کو صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے گول مول جواب سے کام چلایا۔ ''ابھی تک تو سب خیریت ہے چاچا! دعا کرنا' آئندہ بھی خیریت ہی رہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے اس سے یوسف والا کا راستہ معلوم کیا پھر ہم ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

نظام دین کے بہ قول مہر ظہور حسین اور مہر منظور حسین یوسف والا کی مشہور و معروف شخصیات تھیں۔ میں نے یوسف والا پہنچ کر نظام دین کے قول کو صد فیصد درست پایا۔ حویلی میں میری ملاقات بڑے مہر صاحب قبلہ ظہور حسین سے ہوئی۔ چھوٹا مہر صاحب یعنی منظور حسین حویلی میں موجود نہیں تھا۔

میں نے بڑے مہر سے چھوٹے مہر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے الٹا میرا ایک چھوٹا سا انٹرویو کر ڈالا۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ منظور حسین نے مجھے کیا کام ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں چونکہ بڑے مہر کے لیے ناشتا سا تھا اسی وجہ سے اس نے مجھ سے اتنے سوالات کر ڈالے تھے۔ میں نے تقاضائے مصلحت کو نبھاتے ہوئے خود کو چھوٹے مہر کا ایک دیرینہ شناسا ظاہر کیا اور بتایا کہ میں بورے والا سے آیا ہوں۔ مقصد آمد محض ملاقات ہے۔ ایک مختصر ملاقات کے بعد واپس چلا جاؤں گا' وغیرہ وغیرہ۔

بڑے مہر نے میرے جوابات سے مطمئن ہونے کے بعد مجھے بتایا کہ چھوٹا مہر مجھے ڈیری فارم پر مل جائے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹا مہر زیادہ تر ڈیری فارم پر ہی رہتا ہے۔ زیادہ تر راتیں بھی وہ وہیں گزارتا ہے۔ ڈیری فارم حویلی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم

مذکورہ ڈیری فارم پر پہنچ گئے۔

مہر منظور حسین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ظاہر ہے وہ مجھے قطعاً نہیں پہچان سکتا تھا نہ ہی حوال دار میر داد اس کے لیے شناسا تھا۔ مہر منظور کی عمر ستائیس سال کے قریب تھی۔ اس کی صحت قابل رشک اور انداز خاصا خطرناک تھا۔ خطرناک ان معنوں میں کہ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی بھوک محسوس کی تھی..... عورت کی بھوک۔ عورتوں کے شکاری افراد کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک پائی جاتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی مجموعی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ نشے کا بھی عادی تھا۔ الغرض مہر منظور حسین کے بارے میں میرا پہلا تاثر کچھ اچھا نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد مہر منظور نے میری آمد کا مقصد جاننا چاہا تو میں نے کہا۔ ”مہر صاحب! آپ ہمیں نہیں جانتے مگر ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو پچیس اور چھبیس فروری کی درمیانی شب آپ کا مہمان رہ چکا ہے۔ اس کا نام لیاقت علی ہے۔ چھبیس فروری کی دوپہر آپ اسے گاڑی میں سوار کروانے بھی گئے تھے۔“

میں نے اپنی بات کے دوران میں مہر منظور کے چہرے پر نگاہ جمار کھی تھی میں نے اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تغیر و تبدل نمودار ہوتے دیکھا تاہم میری بات کے اختتام تک وہ سنبھالا لے چکا تھا۔ اس نے گہری نظر سے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں کسی لیاقت علی کو نہیں جانتا۔“

میرے ذہن میں ایک امکان نے سر ابھارا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ لیاقت علی اس شخص کا نام نہ ہو جو خدا بخش کوٹرین میں ملا تھا۔ جس طرح خدا بخش نے اسے اپنا غلط نام اللہ دتہ بتایا تھا' بالکل اسی طرح اس شخص نے بھی اپنا غلط نام لیاقت علی بتایا ہو۔ درحقیقت اس کا نام کچھ اور ہی ہو۔

میں نے کہا۔ ”مہر صاحب! میں آپ کی بات پر یقین کر لیتا ہوں۔ آپ واقعی کسی لیاقت علی کو نہیں جانتے لیکن اس بات سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے نا کہ آپ چھبیس فروری کی دوپہر اپنے ایک مہمان کو ریلوے اسٹیشن چھوڑنے گئے تھے؟“

جواب دینے سے پہلے چند لمحے اس نے سوچا پھر گمبھیر آواز میں بولا۔ ”بھئی' میرے ہاں مہمان آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ آئے دن میں ان مہمانوں کو اسٹیشن چھوڑنے بھی جاتا ہوں۔ آپ لوگوں کو اگر کوئی اعتراض ہے تو بتائیں؟“

”ہمیں آپ کی مہمان داری اور مہمان نوازی پر کوئی اعتراض نہیں مہر صاحب!“ میں

مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہم تو ایک خاص مہمان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جس کے پاس لکڑی کا ایک صندوق بھی تھا۔“

”میں اپنے ایسے کسی مہمان سے واقف نہیں ہوں۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ جواب دیتے ہوئے وہ نگاہ چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اس کے چور ہونے کی دلیل تھی۔ میں نے اسے گھسنے کی سعی کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”مہر صاحب! آپ اپنے ایک ایسے مہمان سے انکار نہیں کر سکتے جس کے پاس لکڑی کا صندوق تھا کیونکہ ایک قلی چاچا نظام دین اس حقیقت کا گواہ ہے کہ آپ چھبیس فروری کی دوپہر اپنے مذکورہ مہمان کو ٹرین پر بٹھانے ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا' نظام دین کے ذکر پر وہ تھوڑا جز بز ہوا تھا تاہم جلد ہی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پا لیا اور رکھوس لہجے میں بولا۔ ”چاچا نظام دین نامی جس قلی کا آپ نے ذکر کیا ہے' یقیناً اس کی نظر کمزور ہو گی ورنہ وہ اس قسم کی اوٹ پٹانگ بات نہ کرتا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا۔ ”اگر اس کی نظر کمزور نہیں ہوئی تو پھر یقینی طور پر اس کا دماغی توازن درست نہیں ہو گا۔“

میں نے ایک اور زاویے سے وار کیا۔ ”مہر صاحب! مبینہ لیاقت علی ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن سے روہڑی جانے کے لیے ٹرین میں بیٹھا تھا اور اسٹیشن تک اس کو پہنچانے والے آپ ہی تھے' کچھ یاد آیا آپ کو؟“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”میری یادداشت بالکل درست ہے مگر لگتا ہے' آپ کسی غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں نہ تو کسی لیاقت علی کو جانتا ہوں اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو جس کے پاس لکڑی کا صندوق بھی ہو اور میں اسے ریلوے اسٹیشن بھی چھوڑنے گیا ہوں۔“

مہر منظور کی ڈھٹائی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا اور اس جھوٹ کے پیچھے وہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اتمامِ حجت کے طور پر آخری وار کیا۔

”کیا اس شخص کو بھی پہچاننے سے انکاری ہیں آپ مہر صاحب؟“

اس سوال کے ساتھ ہی میں نے مبینہ لیاقت علی کا خاکہ مہر منظور حسین کے سامنے کر دیا۔

خاکے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی تاہم دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کا رنگ اور لہجے کا ڈھنگ بدل گیا۔ اس نے غصیلے انداز میں غرا کر کہا۔

''میں آپ کو کتنی بار بتاؤں کہ اس شخص..... یعنی آپ کے لیاقت علی سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ آپ بار بار ایک ہی سوال کیوں کر رہے ہیں؟'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے کچھ پوچھنے والے؟ آپ تو پولیس والوں کی طرح تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟ آخر آپ ہیں کون؟''

میرے جی میں تو آئی کہ مہر بہادر سے کہہ دوں' ہاں ہم پولیس والے ہیں مگر میں نے ان الفاظ کو زبان تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا۔ بڑی مشکل سے اس کیس کا ایک سرا ہاتھ لگا تھا۔ میں اسے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نازک موقع پر انتہائی صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ مہر خاندان کا وہاں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ظاہر ہے وہاں کے تھانے میں بھی ان کی آؤ بھگت ہوتی ہوگی۔ یہ میرا علاقہ نہیں تھا۔ یہاں ایک طاقت ور شخص کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن مناسب نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ پہلے متعلقہ تھانے سے رجوع کروں۔ اس کے بعد ہی مہر منظور پر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ ایک بات کا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مہر منظور کا مبینہ لیاقت علی سے گہرا ربط ضبط تھا۔

میں نے مہر منظور کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا۔ ''مہر صاحب! آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے لیاقت نامی اس شخص سے کچھ پوچھ گچھ لینا ہے۔ کافی دنوں سے یہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ آج کل یہ آپ کا مہمان بنا ہوا ہے اس لیے ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ آپ تو اسے پہچاننے ہی سے انکاری ہیں۔ اب ہمیں شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ قلی نظام دین کو واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ہمارا مطلوبہ بندہ اس طرف نہیں آیا۔'' ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا جی' ہمیں اجازت دیں' خدا حافظ!''

پھر اس سے پہلے کہ مہر منظور ہماری آمد اور روانگی پر کوئی تبصرہ کرتا' ہم ڈیری فارم سے باہر نکل آئے۔ ایک بات میں نے واضح طور پر محسوس کی تھی کہ مہر منظور کی آنکھوں میں ہمارے لیے نفرت کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ مجھے اس کے دلی جذبات کی پروا نہیں تھی۔ وہ چاہے ہمارے لیے کچھ بھی سوچتا رہے' مگر میں نے اسے چھاپنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم تھوڑی دیر بعد متعلقہ تھانے میں موجود تھے۔ تھانہ انچارج سلطان خان بڑی خوش دلی سے ملا۔ میں اسے جانتا تھا۔ ہماری ایک دو ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی تھیں۔ میرے ریکارڈ کے مطابق وہ ضلع شیخوپورہ میں تعینات تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ گزشتہ ماہ ہی تبدیل ہو

کر اس تھانے میں پہنچا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سلطان خان کو اپنی آمد کا مقصد بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی باور کروا دیا کہ اعلیٰ سرکاری حکام سے مجھے مکمل سرپرستی حاصل ہے۔ اب مجھے اس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ پھر میں نے اسے صندوق اور لیاقت علی کے بارے میں مکمل تفصیل سنا دی۔

میری فراہم کردہ تصاویر (لیاقت علی کا خاکہ + مقتول کی کٹی ہوئی گردن کی تصویر) اس کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بہ غور ان کا جائزہ بھی لے رہا تھا اور کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں نے کہا۔

''خان صاحب! لگتا ہے' آپ کہیں بہت دور نکل گئے ہیں خیالوں ہی خیالوں میں۔''

''ہوں'' وہ چونکا پھر بولا۔ ''دراصل میں نامعلوم مقتول اور مبینہ لیاقت علی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے ذہن میں ان کے بارے میں شناسائی کا احساس نہیں ابھرا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے اس علاقے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہاں کے لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا نہیں ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں کے عام لوگوں کی بات تو آپ چھوڑیں لیکن مہر منظور حسین کے بارے میں تو آپ کی معلومات مکمل ہوں گی۔''

''ہاں' میں اس خاندان کے بارے میں پوری تفصیل سے جانتا ہوں۔'' سلطان خان نے جواب دیا۔ ''ایسے طاقتور لوگوں کے بارے میں آگاہی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں' ابھی ابھی میں منظور حسین کے ڈیری فارم پر اس سے ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔ وہ تو لیاقت علی کو سرے سے پہچاننے ہی سے انکاری ہے۔''

''ممکن ہے' وہ واقعی لیاقت علی کو نہ جانتا ہو۔'' سلطان خان نے خیال آرائی کی۔

میں نے کہا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ میرا تجربہ مجھے بتا رہا ہے کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔ مہر منظور اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔''

''آپ کے تجربے کا تو میں بھی قائل ہوں ملک صاحب!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''مگر بغیر ثبوت کے چھوٹے مہر پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہاں کی سیاست میں بھی اس خاندان کا عمل دخل ہے۔ اگر ہم نے کچا ہاتھ ڈالا تو ہمارے لیے دشواری پیدا ہو جائے گی۔''

''یعنی میں آپ سے کسی قسم کی مدد کی امید نہ رکھوں؟''

''ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب!''

''پھر کیسی بات ہے؟''

''کچھ سوچتے ہیں اس مسئلے کے حل کے بارے میں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

میں نے سلطان خان کے رویے سے محسوس کیا کہ وہ مہر خاندان کے معاملے میں کھلنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''خان صاحب! آپ اس سلسلے میں خواہ مخواہ کسی امتحان میں خود کو نہ ڈالیں۔ میں نمٹ لوں گا مہر صاحبان سے۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میں فکر مند نہیں ہوں۔''

''پھر کس الجھن میں گرفتار ہیں؟''

سلطان خان کے جواب دینے سے پہلے ایک سپاہی کو بلا کر اسے اے ایس آئی اعجاز کو بلانے کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد اعجاز احمد وہاں حاضر تھا۔

''جی خان صاحب! میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اعجاز احمد نے اٹین شن ہو کر پوچھا۔

سلطان نے اپنی میز پر سے دونوں تصویریں اٹھا کر اعجاز احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ذرا دیر ان دونوں افراد کے بارے اپنے ذہن پر زور دو اور یاد کرنے کی کوشش کرو کہ تم ان سے متعلق کیا کیا جانتے ہو؟''

''او کے سر!'' اعجاز احمد نے ہاتھ بڑھا کر وہ دونوں تصویریں تھانے دار سلطان خان کے ہاتھ سے لے لیں اور بہ غور انہیں دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ اس جوش میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔

''کوئی بات بنی اعجاز احمد؟'' سلطان نے پوچھا۔

''کچھ کچھ بات بنتی نظر تو آ رہی ہے جناب! مگر.....''

اے ایس آئی کے ادھورے جملے سے میں چونک اٹھا۔ بے اختیار میں نے کہا۔ ''مگر اعجاز احمد؟''

سلطان نے بھی پوچھا۔ ''تم بولتے بولتے رک کیوں گئے اعجاز احمد؟''

وہ تھوک نگلتے ہوئے گویا ہوا۔ ''جناب! میں ان میں سے ایک بندے کو جانتا ہوں مگر دوسری کی تصویر.....''

اس نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے غور کیا تو اس کے ہاتھ میں مقتول کی کٹی ہوئی گردن والی تصویر کو دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اعجاز کی الجھن نما پریشانی کا سبب معلوم ہو گیا۔ ظاہر ہے کسی شخص کی کٹی ہوئی گردن کی تصویر دیکھ کر کوئی بھی پریشان ہو سکتا ہے اور پھر اس صورت میں تو اعجاز احمد اس سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر رہا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ''تم اس شخص کو کس طرح جانتے ہو؟ کیا یہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہاں' یہ اس علاقے کا ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''اس کے ساتھ کیا ہوا ہے..... میرا مطلب ہے' کیا اسے کوئی حادثہ وغیرہ پیش آ گیا ہے؟''

''ہاں' یہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''تم ہمیں یہ بتاؤ کہ اس شخص کا نام کیا ہے اور اس کا گھر کس طرف ہے؟''

''اس کا نام ماسٹر خالد ہے..... ماسٹر خالد حسین'' اعجاز نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میری سسرال کے محلے میں رہتا ہے..... بلکہ اب تو یہ کہنا چاہیے کہ رہتا تھا۔'' وہ افسردہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اعجاز احمد' تمہاری سسرال کس محلے میں واقع ہے؟''

اعجاز کے بجائے سلطان خان نے بتایا۔ ''اعجاز کے سسرال والے کینال کالونی میں رہتے ہیں۔''

میں اعجاز احمد کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔ ''تم ماسٹر خالد حسین کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہو؟''

''میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔'' وہ بہ دستور افسردہ لہجے میں بولا۔ ''میری براہِ راست اس سے بات چیت نہیں رہی۔ بس اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ شخص کینال کالونی کے ایک اسکول میں پڑھاتا تھا اور ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے محبت کی شادی کی تھی۔''

محبت کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے اعجاز احمد کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''محبت کی شادی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا۔ میں نے اڑتی اڑتی سنی تھی کہ ماسٹر خالد حسین نے ایک لڑکی سے عدالت میں جا کر شادی کی تھی۔''

''عدالت میں جا کر۔'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یعنی کورٹ میرج؟''

''جی ہاں' کورٹ میرج'' اعجاز احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اعجاز احمد کی فراہم کردہ معلومات مفید ترین ہونے کے ساتھ ساتھ سنسنی خیز بھی تھیں۔ مقتول کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس کیس کی باقی ماندہ گتھیاں بھی سلجھنے کا وقت آ گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں اعجاز احمد سے پوچھا۔

''اگر ماسٹر خالد نے عدالت میں جا کر شادی کی ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ لڑکی کے خاندان والے اس شادی پر رضامند نہیں تھے۔ کیا یہی حقیقت ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی ہاں' یہ حقیقت ہے کہ لڑکی کے گھر والے اس شادی پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے تو اور بھی بہت کچھ سنا ہے' اس شادی کے بارے میں۔''

''مثلاً اور کیا کچھ؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سنا ہے' ماسٹر لڑکی کو گھر سے بھگا کر لایا تھا یا یوں کہہ لیں کہ لڑکی اپنی رضامندی سے ماسٹر کے ساتھ عدالت میں پہنچی تھی۔ دنیا کو تو اس وقت پتہ چلا جب وہ میاں بیوی کے رشتے میں بندھ چکے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس واقعے پر لڑکی کے گھر والوں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا؟''

''فی الحال تو ایسا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔'' اعجاز نے جواب دیا۔

''تمہارا یہ فی الحال قصہ ماضی بن چکا ہے اعجاز احمد!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ ایک مناسب اور ٹھیک ٹھیک ردِعمل ظاہر ہو چکا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب!'' اعجاز احمد نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا مقتول ماسٹر خالد حسین کی بیوی کے والدین بھی کینال کالونی ہی میں رہتے ہیں؟''

''نہیں جناب!'' اے ایس آئی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے سنا ہے' وہ لوگ عارف والا میں رہتے ہیں اور اچھے خاصے کھاتے پیتے زمیندار ہیں۔''

عارف والا' ضلع ساہیوال کا جنوبی یعنی زیریں علاقہ تھا اور یہ علاقہ دریائے ستلج سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی۔ اور ظاہر ہے زمین دار بھی خوش حال ہوں گے۔ میں نے اعجاز احمد سے پوچھا۔

''تم ماسٹر کے سسرال والوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ سادے سے لہجے میں بولا۔ ''اس سلسلے میں مجھے جو کچھ معلوم تھا' وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔''

''مقتول ماسٹر کی بیوی کا نام کیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''شاید اس کا نام زاہدہ ہے۔''

''تم نے ماسٹر کا گھر دیکھا ہوا ہے؟''

''دیکھا تو نہیں مگر کینال کالونی میں ماسٹر کا گھر تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔'' اعجاز احمد نے جواب دیا۔ ''وہ مقامی اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہے..... یعنی پڑھاتا تھا۔''

میرے ذہن میں ایک طوفان سر اٹھا رہا تھا۔ صندوق میں سے جس نامعلوم شخص کے پارچے ملے تھے' اب وہ نامعلوم نہیں رہا تھا۔ اس بدنصیب کا نام ماسٹر خالد حسین تھا اور وہ ساہی وال کے علاقے کینال کالونی کا رہنے والا تھا۔ سب سے اہم اور غور طلب بات یہ تھی کہ کچھ عرصہ قبل مقتول نے ایک لڑکی سے عدالت میں جا کر شادی کی تھی۔ لڑکی کے ورثا اپنے علاقے کے کھاتے پیتے زمیندار تھے یعنی طاقتور اور صاحبِ اختیار لوگ۔ وہ ماسٹر کی اس جرأت رندانہ اور اپنی لڑکی کی بغاوت کو خاموشی سے پی نہیں سکتے تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اب تک اس شادی سے بے خبر رہے ہوں۔ ایسی باتیں اور معاملات زیادہ دیر تک چھپے نہیں رہتے۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں' میرے ذہن میں یہ سوال شدت سے سر اٹھا رہا تھا کہ کیا ماسٹر خالد حسین کسی انتقامی کارروائی کا نشانہ بن گیا تھا؟

پھر میں مہر منظور کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ مبینہ لیاقت علی کو پہچاننے سے انکاری تھا مگر چاچا نظام دین نے اسے لیاقت کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے نظام دین کو واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ نظام دین کو غلط فہمی ہو سکتی تھی مگر میری تجربہ کار آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میری پوچھ گچھ کے جواب میں مہر منظور نے جس رویے کا مظاہرہ کیا تھا وہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میرا دل کہتا تھا' مہر منظور کسی نہ کسی حوالے سے اس معاملے میں ملوث ضرور تھا مگر سرِدست ماسٹر خالد اور اس کی بیوی زاہدہ والا معاملہ زیادہ قابلِ توجہ تھا۔

میں نے تھانے دار سلطان خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''خان صاحب! میں فوری طور پر زاہدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں ملک صاحب!'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔ ''بس ذرا

چائے پی لیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مہر منظور کو فراموش کر چکا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں بھی مکمل معلومات چاہئیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' سلطان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے بیان کردہ معاملے کی خفیہ انکوائری کرواتا ہوں۔ آج ہی میں چند سادہ لباس اہل کاروں کو اس کام پر مامور کرتا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا مبینہ لیاقت علی مہر منظور کے پاس کیا لینے آیا تھا اور یہ کہ صندوق والے معاملے میں مہر منظور کس حد تک ملوث ہے؟''

''آپ اس سلسلے میں پیش رفت کا یقین دلاتے ہیں تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ماسٹر خالد اور زاہدہ والا معاملہ بیچ میں نہ آ جاتا تو میں سب سے پہلے مہر منظور حسین کے بارے میں ہی کھوج لگاتا۔''

''آپ کا کہنا بجا ہے ملک صاحب!'' سلطان نے کہا۔ ''آپ نے جو حالات بیان فرمائے ہیں' ان کے پیش نظر مہر منظور کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تاہم اس سلسلے میں مجھے تھوڑا وقت دیں۔ میں آج ہی ایک خاص لائحہ عمل کے تحت اپنی کارروائی کا آغاز کرتا ہوں۔''

''پھر تو آپ میرے ساتھ کینال کالونی نہ ہی جائیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''آپ کا یہاں تھانے میں رہنا بہت ضروری ہے تاکہ آپ مہر منظور کے سلسلے میں اہم قدم اٹھا سکیں۔ میں اے ایس آئی اعجاز کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی ملک صاحب!'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے سلطان خان کی میز پر بڑی ہوئی دونوں تصویریں اٹھالیں۔ پھر مبینہ لیاقت علی کے اسکیچ کے اوپر ہاتھ پھیرتے ہوئے زیر لب کہا۔

''اس بندے کی شناخت کا معاملہ فی الحال کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔''

''یہ مسئلہ بھی حل ہو ہی جائے گا جناب!'' اے ایس آئی اعجاز نے پر امید انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے مقتول کی بیوہ زاہدہ اس خاکے پر کچھ روشنی ڈال سکے۔''

''ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو مجھے امید ہے کہ میرا اے ایس آئی جماعت علی بھی بورے والا سے ناکامیاب نہیں لوٹے گا۔''

ہم تھوڑی دیر تک اسی مسئلے پر گفتگو کرتے رہے پھر چائے پینے کے بعد میں حوالدار میرداد اور اے ایس آئی اعجاز احمد کے ساتھ کینال کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کینال کالونی پہنچ گئے۔ میری ہدایت پر حوالدار میرداد نے ماسٹر خالد حسین کے دروازے پر دستک دی۔ میں اور میرداد سادہ لباس میں تھے جبکہ اے ایس آئی اعجاز باقاعدہ پولیس کی وردی میں تھا۔

دستک کے جواب میں دروازہ تھوڑا سا کھلا پھر ایک نوجوان عورت نے باہر جھانکا اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ہم ماسٹر صاحب سے ملنے آئے ہیں۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

میں نے اے ایس آئی کو دانستہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ زاہدہ پولیس کی وردی دیکھ کر بدک نہ جائے۔ میرے سوال کے جواب میں اس عورت نے جو یقینی طور پر زاہدہ ہی ہو سکتی تھی' دروازہ بھیڑ دیا اور کہا۔

''ماسٹر صاحب تو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔''

''وہ کہاں گئے ہیں؟'' میں نے نرمی سے سوال کیا۔ ''اور کب تک آئیں گے؟''

ایک لمحے دروازے کے پیچھے خاموشی رہی پھر اس آواز میں پوچھا گیا۔ ''آپ کون ہیں اور آپ کو ماسٹر صاحب سے کیا کام ہے؟''

میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔ ''میرا نام محمد طفیل ہے اور میں عارف والا سے آیا ہوں۔ ماسٹر خالد کو ایک ضروری پیغام دینا ہے۔ آپ مجھے خالد کا ایک خیر خواہ سمجھ لیں۔''

''عارف والا!'' اس عورت نے دروازے کے پیچھے تشویش ناک انداز میں دہرایا پھر جلدی سے بولی۔ ''میں ماسٹر صاحب کے طفیل نامی کسی خیر خواہ کو نہیں جانتی۔ آپ جائیں یہاں سے۔''

میں نے اسے پٹڑی سے اترتے دیکھا تو کہا۔ ''یقیناً آپ بھابی زاہدہ ہیں؟''

اندر خاموشی طاری ہو گئی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ''دیکھیں زاہدہ بھابی! آپ مجھے سچ سچ بتائیں' ماسٹر خالد اس وقت کہاں ہے۔ آپ کی غلط بیانی آپ کو کسی مصیبت میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔''

''پتہ نہیں' آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں خالصتاً نجی نوعیت کی باتیں کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے' یہاں گلی میں کھڑے ہو کر اس طرح کی گھریلو باتیں کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیا آپ کے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

''جگہ تو ہے مگر اس وقت ماسٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔''

''میں ماسٹر خالد کے بارے میں ہی آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو وہ اطلاع گھر کے اندر بیٹھ کر سننا چاہیے۔''

تھوڑے تامل کے بعد وہ دروازہ کھولنے پر آمادہ ہوگئی۔ دروازے کے پیچھے سے اس کی آواز آئی۔ ''آپ رکیں، میں آپ کے لیے بیٹھک کھولتی ہوں۔''

زاہدہ نے جب بیٹھک کا دروازہ کھولا تو اپنے سامنے تین افراد کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ خاص طور پر اے ایس آئی اعجاز پر نگاہ پڑتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''پپ..... پولیس!''

زاہدہ انیس بیس سال کی ایک حسین و جمیل لڑکی۔ چونکہ وہ مبینہ طور پر شادی شدہ تھی اس لیے اسے ایک دلکش اور خوبصورت عورت کہا جا سکتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تذبذب، حیرانی اور پریشانی کے تاثرات ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا اور اس کے عمل سے پہلے ہی ردِعمل کا مظاہرہ کر دیا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ یک بہ یک دروازہ بند کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اس لیے میں نے فی الفور اپنی دائیں ٹانگ دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان پھنسا کر زاہدہ کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

میرے اس عمل کے نتیجے میں زاہدہ خوف زدہ انداز میں چیختے ہوئے پیچھے کی جانب اچھلی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور بیٹھک کے اندر داخل ہوگیا۔ میری دیکھا دیکھی میر داد اور اعجاز احمد بھی بیٹھک کے اندر آ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ زاہدہ مزید چیخ و پکار مچاتی، میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''میری بہن! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم اطمینان سے بیٹھ سکتی ہو۔''

بیٹھک میں ایک رنگیلے پلنگ کے علاوہ چار کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ہم اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زاہدہ نے ہمارے ہم دردانہ اور دوستانہ رویے کے پیش نظر مزید کسی شدید عمل سے اجتناب برتا اور پلنگ کے ایک کونے پر ٹک گئی۔ وہ سوالیہ نظر سے باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر نہایت ہی نرم لہجے میں اپنا تعارف کروایا۔ ''زاہدہ! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو اس لیے اپنے ذہن سے ہر قسم کے خوف کو دور کر دو۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں خانیوال کے ایک تھانے کا انچارج ہوں۔'' پھر میں نے حوالدار میر داد کی

جانب اشارہ کیا۔ ''یہ میرے تھانے کا حوالدار میر داد ہے اور یہ.....'' اب میرا روئے سخن اعجاز احمد کی طرف تھا۔ ''یہ تمہارے ہی علاقے کے تھانے کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر اعجاز احمد ہے۔ ہم یہاں پر ایک خاص معاملے کی تفتیش کے لیے آئے ہیں۔ اور اسی سلسلے میں تم سے پوچھ تاچھ کرنے آئے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس معاملے کا تعلق براہ راست تمہارے شوہر ماسٹر خالد حسین سے ہے۔''

''ایسا کون سا معاملہ ہے؟''

''تم سوال نہیں کرو، صرف جواب دو۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''خالد کتنے دنوں سے غائب ہے؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد بولی۔ ''وہ پچیس فروری کی رات کو گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے۔''

''وہ کہاں گیا تھا؟''

''عارف والا۔'' اس نے کم زور سے لہجے میں بتایا۔

''واپس کب تک آنے کو کہا تھا؟''

''چند دن بعد!'' وہ منمنائی۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے رہی تھی۔ میں نے سرزنش آمیز انداز میں کہا۔ ''دیکھو زاہدہ! میں نے اب تک تم سے نرمی برتی ہے مگر تم غلط بیانی سے کام لے کر اپنے لیے مشکلات کھڑی کر رہی ہو۔ مجبوراً مجھے سختی سے کام لینا ہوگا۔''

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کون سی غلط بیانی کی ہے؟''

''غلط بیانی تم نے یہ کی ہے کہ تمہارا شوہر عارف والا گیا ہوا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ! تمہارا تعلق عارف والا سے ہے اور تمہارے والدین وہاں کے خوش حال زمیں دار ہیں۔ وہ تم دونوں کی شادی کے لیے تیار نہیں تھے۔ جن حالات میں تمہاری شادی ہوئی ہے ان کے پیش نظر ماسٹر خالد کا عارف والا کی جانب جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' بات ختم کر کے میں اسے گھورنے لگا۔

وہ دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں آخری مرتبہ سمجھا رہا ہوں بہن کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو کیونکہ تمہیں سنانے کے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم خود کو ذہنی طور پر ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار کر لو۔''

''آپ مجھے کون سی خطرناک اطلاع دینے والے ہیں؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے کہا۔ ''اس اطلاع کا تعلق تمہارے شوہر سے ہے۔''

''کیا ہوا ہے ماسٹر صاحب کو؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

میں نے جی کڑا کر کے اپنی جیب سے ماسٹر خالد حسین کی گردن کٹی ادھوری تصویر برآمد اور افسوس ناک انداز میں اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو تم خود ہی دیکھ لو۔''

زاہدہ نے تصویر پر نگاہ ڈالی اس کے چہرے پر اندوہ کا طوفان نمودار ہوا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اوہ خدا یہ سب کیا ہو گیا!''

اس دوران میں تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر جا گری تھی۔ میں نے تصویر اٹھاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے شوہر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''مم..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ بتائیں تھانے دار صاحب! خالد کے ساتھ کس نے یہ ظلم کیا ہے؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟'' پھر وہ باقاعدہ رونے لگی۔

میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات سے اسے آگاہ کیا۔ اس دوران میں وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔ میں نے اس کی حالت بہتر ہوتے دیکھی تو سلسلہ سوالات پھر شروع کر دیا۔

''زاہدہ! ذرا سوچ کر بتاؤ' پچیس فروری کو خالد کہاں گیا تھا؟''

اس نے جواب دینے میں تامل کیا تو میں نے تنبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ نہ کہنا کہ وہ عارف والا گیا تھا۔ میں تمہارا مزید جھوٹ برداشت نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں اس وقت تم پر ایک قیامت گزر رہی ہے لیکن تمہارے تعاون کے بغیر میں تمہارے شوہر کے قاتل تک نہیں پہنچ سکتا۔''

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی' وہ اس روز کہاں گئے تھے۔ شام کے وقت کوئی شخص انہیں بلانے آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ مجھ سے یہی کہا تھا کہ کوئی دوست آیا ہے اور یہ کہ آدھے گھنٹے بعد واپس آ جائیں گے۔''

''اس نے اپنے دوست کا کوئی نام بھی بتایا تھا؟''

''نہیں'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہ انہوں نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے خالد کے اس دوست کو دیکھا تھا؟''

اس کا جواب اس مرتبہ بھی نفی میں تھا۔ میں نے ایک اور ترکیب آزمائی۔ اسی وقت میں نے اپنی جیب میں سے لیاقت علی کا خاکہ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''کہیں وہ یہ شخص تو نہیں تھا؟''

خاکے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی اور اس کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ خارج ہوئے۔ ''یہ تو پرویز کی تصویر ہے؟''

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ گویا زاہدہ اس شخص کو پرویز کے نام سے جانتی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خدا بخش کو پرویز نے اپنا نام غلط بتایا تھا جیسے خدا بخش نے اسے اپنا نام اللہ دتہ غلط بتایا تھا۔ اس انکشاف کے بعد میں پوری طرح زاہدہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس شخص کا نام پرویز ہی ہے؟''

''بالکل سولہ آنے یقین ہے جناب!'' اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''آپ کے پاس یہ تصویر کہاں سے آئی ہے؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم پرویز نامی اس شخص کو کس طرح جانتی ہو؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''میں اس شخص کو نہیں پہچانوں گی تو بھلا پھر کون پہچانے گا؟'' ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''یہ میرا بڑا بھائی ہے پرویز..... پرویز بھٹی!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے نزدیک ہی کوئی بم پھٹا ہو' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا واقعی' یہ شخص تمہارا بھائی پرویز بھٹی ہے؟''

''اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''اس نے تو ٹرین میں ایک مسافر خدا بخش لنگاہ کو اپنا نام لیاقت علی بتایا تھا۔ میں نے اپنے آرٹسٹ سے اس کا قلمی خاکہ تیار کروایا ہے اور مجھے اسی شخص کی تلاش ہے۔''

پھر میں نے زاہدہ کو وہ باتیں بھی بتا دیں جو اب تک چھپائی ہوئی تھیں مثلاً یہ کہ مبینہ لیاقت علی نے اس کے شوہر کی ٹکڑے ٹکڑے لاش والے صندوق کے ساتھ ساہیوال سے ٹرین میں سوار ہو کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ مبینہ طور پر وہ روہڑی جانا چاہتا تھا مگر دھوکے سے میاں چنوں کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا ازاں بعد اس نے بہ ذریعہ بس میاں چنوں سے بورے والا تک سفر کیا تھا وغیرہم۔

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے میری باتیں سنتی رہی اور آخر میں بولی۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پرویز ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ وہ ماسٹر صاحب کا قتل نہیں کر سکتا۔ یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی بی بی!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ تو ممکن ہے' تمہارے بھائی نے ماسٹر خالد کو قتل نہ کیا ہو مگر اس بات کا مجھے یقین ہے کہ اس نے لاش والے صندوق کے ساتھ ساہیوال سے میاں چنوں تک سفر کیا تھا اور اس یقین کی تصدیق کے لیے میرے پاس بے شمار ثبوت ہیں۔''

وہ سخت الجھن کا شکار دکھائی دینے لگی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نفی میں گردن جھٹکنے لگی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اس وقت ایک بہت بڑے عذاب سے گزر رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ! آخری مرتبہ پرویز تم سے کب ملنے آیا تھا؟''

''وہ ایک مرتبہ بھی یہاں مجھ سے ملنے نہیں آیا۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''وہ کیا' میرے گھر کا کوئی بھی فرد مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ میرا تو خیال ہے' انہیں میرے گھر کے بارے میں علم ہی نہیں ہوگا۔ میں نے محبت میں شادی کر کے ان سب کی ناراضی مول لی ہے۔ انہوں نے مجھ سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔''

''پھر تمہارے بھائی کا تمہارے شوہر کی لاش کے ساتھ پایا جانا کیا معنی رکھتا ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

وہ بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میرے لیے تو یہ ایک ان ہونی سی بات ہے۔''

میں نے دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ ''زاہدہ! کیا تم مہر منظور حسین نامی کسی شخص سے واقف ہو؟''

وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''نہیں' یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مہر منظور حسین یوسف والا کا رہنے والا ہے۔ وقوعہ کے روز یہی شخص تمہارے بھائی کو ساہیوال اسٹیشن تک چھوڑنے گیا تھا۔''

''میں نے کہا نا' میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ پرزور انداز میں بولی۔ ''مجھے تو ابھی تک آپ کی باتیں خواب و خیال محسوس ہو رہی ہیں۔''

میں نے اے ایس آئی اعجاز احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اعجاز احمد! زاہدہ تمہارے

علاقے کی رہائشی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کی ذمے داریاں اب آپ لوگوں کو سنبھالنا ہوں گی۔ مقتول خالد حسین کی لاش خانیوال کے سرکاری اسپتال میں رکھی ہے۔ ضروری سرکاری کارروائی کے بعد وہ لاش وہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔''

''آپ کا کیا پروگرام ہے ملک صاحب!'' اعجاز احمد نے مجھ سے پوچھا۔

''میں اپنی پہلی فرصت میں قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر زاہدہ کے بھائی پرویز بھٹی نے ہی اپنے بہنوئی کو قتل کیا ہے تو پھر وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔''

میرے ان الفاظ پر زاہدہ نے ایک جھرجھری لی اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''خدایا' یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ خالد حسین کی تو کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں تھی پھر اس کو خوامخواہ قتل کیوں کیا گیا اور یہ پرویز.....''

جملہ ادھورا چھوڑنے کے بعد وہ نفی میں گردن ہلانے لگی۔ میں اس پر ٹوٹنے والی بپتا کی شدت سے واقف تھا۔ میں اس کا درد نہیں بانٹ سکتا تھا نہ ہی اس کی تکلیف کو بہ عین محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اپنے فرائض ہر حال میں پورے کرنا تھے تاہم پوچھ گچھ کے دوران میں' میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا رویہ دوستانہ اور ہمدردانہ رہے۔

میں نے تفتیش کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے زاہدہ سے سوال کیا۔ ''میں تمہارے والدین کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ' عارف والا میں وہ کس جگہ رہتے ہیں؟''

''وہ عارف والا کے علاقے فیروز پور چشتیاں میں رہتے ہیں۔''

''تمہارے والد کا نام کیا ہے؟''

''اشفاق احمد بھٹی!''

''بہن بھائی کتنے ہیں؟''

''صرف ایک بھائی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پرویز بھٹی جس کی تصویر آپ نے مجھے دکھائی ہے۔''

''ٹھیک ہے'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا۔''

ہم مقتول کے گھر سے نکلے تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ تھانے پہنچنے تک میں واپس خانیوال جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تھانے دار سلطان خان کو میں نے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ خصوصاً زاہدہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور یہ بھی یاد دہانی کروائی کہ مہر منظور حسین پر بھی گہری نگاہ رکھنی ہے۔

سلطان خان نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے بعد میں حوالدار میر داد کے ساتھ واپس خانیوال آ گیا۔

میرے تھانے میں اے ایس آئی جماعت علی بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! میں لیاقت علی کی حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں۔ اس نے مہر کے سلسلے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا۔''

''اور اس کا اصلی نام پرویز ہے..... پرویز بھٹی!'' میں نے کہا۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' جماعت علی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں بھی ساہیوال سے کامیاب لوٹا ہوں۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد پرویز بھٹی کو گرفتار کر لیں گے۔''

اے ایس آئی نے بتایا۔ ''پرویز نے میاں چنوں سے بورے والا پہنچ کر وہ رات مشتاق احمد بھٹی کے گھر میں گزاری تھی جو رشتے میں اس کا سگا چچا لگتا ہے۔ مشتاق بھٹی بورے والا کے علاقے یعقوب آباد میں رہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بورے والا سے پرویز عارف والا روانہ ہو گیا ہو گا؟''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' اے ایس آئی نے تائید کی۔

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک اپنی اپنی کارگزاری پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ آخر کار مشترکہ طور پر ہم نے فیصلہ کیا کہ دوسری صبح ہم پرویز کی گرفتاری کے لیے عارف والا جائیں گے۔ اگر پرویز ہمارے ہاتھ لگ جاتا تو یہ عقدہ لاینحل سلجھ جاتا۔ موجودہ صورت حال میں' میں بہت پراُمید تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کامیابی مجھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔

قصہ مختصر' آئندہ روز دوپہر کے بعد ہم پوری تیاری کے ساتھ پرویز کی گرفتاری کے لیے عارف والا پہنچ گئے۔ ایس پی علاقہ کو میں تازہ ترین واقعات کی تفصیل بتا چکا تھا۔ وہ میری اب تک کی کارگزاری سے خاصے مطمئن تھے۔

ہم اسی شام پرویز بھٹی کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے' پہلے تو وہ سرے سے کسی صندوق کے وجود ہی سے انکاری تھا۔ میں نے خدا بخش کو اس کے سامنے کیا تو وہ گڑبڑا گیا' میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ پرویز کی گرفتاری کے دوران میں اس کے باپ نے مداخلت کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ اس رات پرویز کی خوب ''خاطر مدارات'' کی گئی۔ صبح تک وہ بالکل سیدھا ہو گیا۔

پرویز نے اپنے اقبالی بیان میں ماسٹر خالد حسین کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں مہر منظور حسین نے اس کے ساتھ بہت تعاون کیا تھا۔ پرویز کسی بہانے خالد حسین کو گھر سے بہکا لایا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک اجنبی شخص کی مدد لی تھی۔ ازاں بعد خالد کو بے بس کر کے مہر منظور کے ڈیری فارم پر پہنچا دیا گیا۔ اس سلسلے میں بے ہوش کرنے والی دوا بھی استعمال کی گئی تھی۔

پرویز نے بڑے فخر سے بتایا کہ اس نے غیرت میں آ کر ماسٹر خالد کو قتل کیا تھا۔ ماسٹر نے اس کی بہن کے ساتھ شادی کر کے ان کی خاندانی غیرت کو للکارا تھا جس کا بدلہ پرویز نے لے لیا۔

ازاں بعد مہر منظور حسین کو اعانت جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے خلاف پرویز کا بیان خاصا بھاری ثابت ہوا تھا۔ مہر منظور کے لیے جان چھڑانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا اختیار اس کے کسی کام نہیں آیا تھا۔

واقعات کے مطابق اس رات چھوٹے مہر کے ڈیری فارم پر پہلے خالد کو قتل کیا گیا پھر اس کی لاش کے مختلف ٹکڑوں کو سیلوفین تھیلیوں میں ڈال کر چوبی صندوق میں بند کر دیا گیا۔ چھوٹا مہر اس کارروائی کے خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا' ماسٹر کی لاش کو زمین میں گاڑ دیا جائے مگر پرویز اپنے آئیڈیے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا' روہڑی کے اسٹیشن پر یا پہلے کہیں بھی وہ صندوق جب کھولا جائے گا تو ایک سنسنی پھیل جائے گی۔ اس طرح وہ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ لاش کو صندوق میں ٹکڑوں کی صورت بند کر کے لاوارث ٹرین میں چھوڑ دینا اس کے پروگرام کا حصہ تھا۔ میں نے جب اس سلسلے میں پرویز سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا تو اس نے جواب دیا۔ ''بس' میں اس طرح پورے ملک میں ہلچل مچانا چاہتا تھا۔ میں نے یہ آئیڈیا ایک انگلش فلم سے لیا تھا۔''

اس کا جواب سن کر میں اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ ہمارا خیال ہے' آج کل کی انگلش فلمیں نوجوان نسل کو بگاڑ رہی ہیں مگر پرویز کے ''کارنامے'' سے پتہ چلتا ہے کہ تشدد پر مبنی فلمیں ہر دور میں معاشرتی انتشار اور جرائم میں اضافے کا باعث ثابت ہوئی ہیں۔

پرویز نے اپنی جھوٹی غیرت کے نام پر ماسٹر خالد حسین کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھا۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں اور پھر ماسٹر خالد نے تو باقاعدہ اس کی بہن کے ساتھ شادی کی تھی۔

جانے کب تک ہم اپنی جھوٹی انا کی خاطر بے گناہ اور معصوم افراد کو موت سے ہمکنار کرتے

رہیں گے۔ میرے خیال میں یہ غیرت کا مظاہرہ نہیں بلکہ بہت بڑی بے غیرتی ہے چاہے ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔

اگر پرویز کے موقف کو چند لمحات کے لیے درست بھی مان لیا جائے تو پھر بھی اس کی غیرت بہت لولی لنگڑی ثابت ہوئی۔ زاہدہ اور خالدہ نے جو کچھ بھی کیا تھا' اس کے لیے وہ دونوں برابر کے حصے دار تھے پھر سزا صرف خالدہ کو کیوں ملی؟ یہ ایک تازیانے برساتا ہوا سوال ہے جس کا جواب کسی بھی نام نہاد غیرت مند کے پاس موجود نہیں۔

خدا ہمیں عقل دے' آمین!

❋ ❋ ❋

عشق کاذب

چونی ریلوے اسٹیشن پر ہونے والی قتل کی واردات نے پورے علاقے میں سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ مقتول مختار حسین کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ چونی کا ایک معروف کاروباری باشندہ تھا۔ چونی کے مین بازار میں اس کی کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں دو ملازم کام کرتے تھے۔ مختار حسین اور ''مختار کلاتھ ہاؤس'' سے علاقے کا ہر شخص واقف تھا۔

مختار حسین کی لاش ریلوے اسٹیشن کے ایک دور افتادہ حصے میں جھاڑیوں کے نزدیک پائی گئی تھی۔ ادھر بنی گودام سے آگے خار دار خودرو جھاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جہاں دن کے وقت بھی ویرانی ہی رہتی تھی اور رات میں تو بالکل ہی سناٹا چھا جاتا تھا۔ مختار حسین کو رات کی تاریکی اور خاموشی کی آڑ میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا تاہم اس کی لاش دوسرے روز صبح دریافت ہوئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ اتوار کا دن تھا۔ میں حسبِ معمول تھانے پہنچا تو پتہ چلا' شبینہ ڈیوٹی والا اے ایس آئی دو کانسٹیبلو کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کی طرف گیا ہے کیونکہ وہاں جھاڑیوں میں کسی لاش کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں میں تھانے کے کوارٹر کے بجائے چونی (ضلع قصور) ہی کے ایک علاقے شمس آباد میں رہائش پذیر تھا۔ میں روزانہ صبح آٹھ بجے تھانے پہنچ جاتا اور واپسی کا انحصار تھانے کی مصروفیات پر ہوتا تھا۔ کبھی کبھار تو واپس گھر پہنچتے پہنچتے رات کے دس بھی بج جاتے تھے۔

میرے تھانے سے ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا چنانچہ کچھ ہی دیر بعد میں جائے واردات پر پہنچ گیا۔ ذہین اور مستعد اے ایس آئی فلک شیر اس وقت تک جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کر چکا تھا۔ میری آمد پر اس نے مجھے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے مقتول کی لاش کا جائزہ لیا۔

مقتول مختار حسین چونکہ علاقے کا خاصا نمایاں شخص تھا اس لیے فوراً ہی اس کی شناخت ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بے داغ شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ موسم کی مناسبت سے قمیض کے اوپر اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں گرم موزے اور بند جوتا تھا۔ وہ ماہ جنوری کے ابتدائی ایام تھے سردی اپنے جوبن پر تھی۔

مختار حسین کی موت کا سبب سر کے پچھلے حصے میں لگنے والی شدید ترین چوٹ تھی۔ ضرب کسی ٹھوس آہنی شے سے لگائی گئی تھی جس نے سر کے عقبی حصے کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ میں نے مجروح کھوپڑی کے گھائل مقام کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ کم از کم دس بارہ گھنٹے قبل قاتل کے دستِ ستم نے وہ قیامت ڈھائی تھی گویا مختار حسین کو گزشتہ رات کے پہلے پہر موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔ لاش پوری رات سخت سردی میں پڑے رہنے کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔

جائے وقوعہ اور مقتول کی لاش کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میں اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''فلک شیر! اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع کس نے تھانے پہنچائی تھی؟''

''ایک قلی نے جناب۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''خدا بخش نام ہے اس کا۔''

اپنی بات ختم کر کے اے ایس آئی متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت چالیس بیالیس سال کی عمر کا ایک شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں ادھر ہوں جناب۔''

مذکورہ شخص نے ریلوے قلیوں کا مخصوص پہناوا زیب تن کر رکھا تھا۔ اے ایس آئی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔ ''ملک صاحب! یہ خدا بخش ہے۔''

میرے سوالات کے جواب میں خدا بخش نے جو تفصیل بتائی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ قلی خدا بخش اس صبح ٹہلتے ہوئے بتی گودام سے خاصا آگے نکل گیا تھا پھر جب وہ خاردار جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اچانک اس کی نظر مقتول مختار حسین کی لاش پر پڑی۔ وہ بھاگا واپس ریلوے اسٹیشن کی بلڈنگ میں پہنچا اور ٹکٹ بابو کو اس سنگین ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ چند لمحے بعد تمام عملے کو اس واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔ ٹکٹ بابو بشیر احمد اور عملے کے بیشتر افراد مختار حسین کو جانتے تھے اس لیے ریلوے ہی کے ایک ملازم کو مختار حسین کے گھر دوڑایا گیا اور خدا بخش تھانے چلا آیا تھا۔ تاہم مقتول کے گھر سے ابھی کوئی وہاں پہنچا نہیں تھا۔

میں نے خدا بخش سے پوچھا۔ ''تم کتنے بجے ان جھاڑیوں کی طرف آئے تھے۔ میرا مطلب ہے، تم نے لاش کو کب دیکھا؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔

''کیا تم لاش کو دیکھتے ہی پہچان گئے تھے؟''

''جی ہاں، میں رانا صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''کون رانا صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا۔ ''یہی جناب جن کی لاش پڑی ہے۔'' وہ جھاڑیوں کے قریب پڑی مقتول کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کا پورا نام رانا مختار حسین ہے۔ لوگ عام طور پر انہیں رانا صاحب ہی کہتے ہیں۔''

میں خدا بخش سے پوچھ تاچھ کر ہی رہا تھا کہ اسی وقت مقتول کا بڑا بیٹا افتخار حسین وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران میں، میں نے مقتول کی لاش کو ایک سفید چادر سے ڈھک دیا تھا۔ افتخار حسین کی آمد پر میں نے لاش کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ وہ کافی دیر تک اپنے مقتول باپ کا جائزہ لیتا رہا پھر جذباتی لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب! بڑے رانا صاحب کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''ہمیں بھی قاتل کی تلاش ہے۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں۔ ''آپ لوگوں کا تعاون ہی مجھے قاتل تک پہنچائے گا۔''

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟''

''ہم بھی یہی جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا، پھر پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں تمہارے باپ کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

''ان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔'' افتخار حسین روہانسے لہجے میں بولا۔ ''پورے علاقے میں ان کی بہت عزت تھی۔ آج تک ابا جی کا کسی سے معمولی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔''

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بہرحال یہ کسی دوست کا کام تو نہیں لگتا افتخار حسین!''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''برخوردار! میں ابھی تم سے تفصیلی بات کرتا ہوں پہلے ذرا موقع کی ضروری کارروائی نمٹا لوں۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ویران نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کی مکمل جامہ تلاشی لی۔ کوٹ کی جیبوں میں سے عام استعمال مثلاً وہاں رومال، کنگھی اور خوش بُو کی شیشی کے علاوہ دو سو روپے کی رقم برآمد ہوئی۔ قمیض کی سامنے والی جیب میں سے ریلوے کا ایک ٹکٹ بھی ملا تھا جو بتوکی سے لاہور تک کا تھا۔ ٹکٹ پر گزشتہ روز کی تاریخ تھی۔ اس کے علاوہ چند

ایسے کاغذات تھے جن کی نوعیت سراسر کاروباری تھی اس لیے یہاں ان کا ذکر ضروری نہیں۔ مق
کی عمر کا اندازہ میں نے لگ بھگ پینتالیس سال قائم کیا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور خوش حال
تھا۔ ازاں بعد مجھے معلوم ہوا' افتخار حسین کے علاوہ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ پندرہ سالہ سلمیٰ اور
سال ناہید۔ مقتول کی بیوی کا نام رابعہ بیگم تھا جو مقتول سے عمر میں صرف پانچ سال چھوٹی تھ
افتخار حسین کی عمر بیس اور اکیس کے درمیان تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی تاہم وہ اپنی شخص
اور بول چال سے سیدھا سادہ شخص دکھائی دیتا تھا۔

میں نے وقوعہ کی نہایت ہی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد مقتول مختار حسین کی لا
پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع اسپتال بھجوا دی تاہم اس موقع پر افتخار حسین نے کم زور سا احتجاج کیا۔

"تھانے دار صاحب! آپ ابا جی کی لاش میرے حوالے کر دیں۔" اس نے بھرائی ہ
آواز میں کہا۔ "میں ان کی چیر پھاڑ نہیں ہونے دوں گا۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم مجھے قانون کے تقا
پورے کرنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ سب کچھ تم لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو رہا ہے۔ میں جلد
جلد تمہارے باپ کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد افتخار حسین نے زیادہ جرح نہیں کی۔ میں نے اپنے اہم کام سرانجام دی
بعد افتخار حسین سے کہا۔ "میں تم سے اور تمہاری والدہ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں لیکن ا
کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ تم دونوں کے بیانات کے لیے مجھے......" میں نے دانستہ جم
ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ بولا۔ "آپ میرے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔"

"ہاں' یہی مناسب رہے گا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "تمہارا گھر کس طر
ہے؟"

اس نے بتایا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم ابھی تمہارے گھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے میں ریل
کے ٹکٹ بابو سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر ہم دونوں چلتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے تک آ گئے۔ اسٹیشن ماسٹر اس وقت ا
سیٹ پر موجود نہیں تھا تاہم اس کے اسسٹنٹ نے میری "فرمائش" پر ٹکٹ بابو بشیر احمد کو بلا
لیا۔

بشیر احمد عام سی صورت والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی عمر تیس اور بتیس کے درمیان رہی ہو گی۔ میں تھوڑی دیر تک خاموش نظر سے اسے تکتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بشیر احمد! تمہاری ڈیوٹی کب سے کب تک ہوتی ہے؟"

"صبح سات سے رات سات بجے تک جناب۔"

قلی خدا بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ لاش کی دریافت کے بعد اس نے سب سے پہلے بشیر احمد کو اس بارے میں بتایا تھا۔ خدا بخش کے بیان کے مطابق اس نے صبح سات بجے خار دار جھاڑیوں میں مقتول کی لاش دیکھی تھی۔ اسی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ٹکٹ بابو سے سوال کیا۔

"بشیر احمد مجھے پتہ چلا ہے کہ خدا بخش نے سب سے پہلے تمہیں لاش کی اطلاع دی تھی۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

وہ بولا۔ "کوئی خاص وجہ نہیں ہے جناب۔ بس یہ ایک اتفاق ہی تھا۔ وہ بتی گودام کی جانب سے دوڑتا ہوا عمارت کی طرف آ رہا تھا۔ میں اس وقت پلیٹ فارم کے جنگلے کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ خدا بخش نے سب سے پہلے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔"

"تم پلیٹ فارم کے جنگلے کے قریب کھڑے کیا کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "تم ٹکٹ بابو ہو۔ تمہیں تو ٹکٹ گھر کے اندر ہونا چاہیے تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "میرے فرائض کا تقاضا تو یہی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران میں ہمہ وقت مجھے ٹکٹ گھر کے اندر موجود رہنا چاہیے تاہم پتوکی جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر صرف ٹرین کی آمد اور روانگی کے وقت ہی کچھ رونق اور مصروفیت ہوتی ہے اس لیے ٹکٹ کلرک اکثر اپنے کمرے سے باہر ہی نظر آتا ہے۔ کبھی پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے ہوئے اور کبھی دوسرے افراد سے گپ شپ کرتے ہوئے پھر آج صبح تو میرے ٹکٹ گھر سے باہر کھڑے ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔" آخری جملہ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"اور وہ وجہ کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "اس وقت سات بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے اور میری ڈیوٹی ٹھیک سات بجے شروع ہوتی ہے۔"

"خدا بخش نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے لگ بھگ سات بجے صبح مقتول مختار حسین کی لاش

کو دیکھا تھا۔ تمہارے بیان کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ اس نے جب لاش کا نظارہ کیا اس وقت سات بجنے میں پانچ چھ منٹ باقی ہوں گے۔''

وہ بولا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔ خدا بخش نے جب مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا اس وقت تقریباً سات بجنے ہی والے تھے پھر ہم سب لوگ جائے وقوعہ کی جانب دوڑ پڑے تھے۔''

''اور تم نے پہلی نظر میں مقتول کو پہچان لیا تھا؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک میں ہی کیا' سب نے مختار حسین کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس علاقے کی خاصی معروف شخصیت ہیں۔''

میں نے زاویہ سوال کو ذرا تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بشیر احمد! تم رات سات بجے (واضح رہے کہ جنوری کی ابتدائی تاریخوں میں وسطی پنجاب میں پانچ سوا پانچ بجے سورج غروب ہو جاتا ہے لہٰذا سات بجے کا وقت رات ہی میں شمار ہوگا) اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر چلے جاتے ہو۔ تمہاری جگہ کون ڈیوٹی سنبھالتا ہے۔؟''

''رات والا ٹکٹ بابو عبدالخالق۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اپنی جیب میں سے وہ ٹکٹ نکال لیا جو مقتول کی جامہ تلاشی سے میرے ہاتھ چڑھا تھا۔ میں نے مذکورہ ٹکٹ' ٹکٹ بابو بشیر احمد کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹکٹ کل کی تاریخ میں اسی ریلوے اسٹیشن سے جاری کیا گیا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ تمہارے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے یا عبدالخالق کے ہاتھوں کا؟''

وہ ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹکٹ میرے ہاتھوں ہی جاری ہوا تھا۔ میں اپنی تحریر کو کیسے بھول سکتا ہوں بلکہ مجھے تو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ ٹکٹ مقتول مختار حسین کے لیے بنایا تھا۔ وہ لاہور جانا چاہتا تھا۔'' پھر وہ ٹکٹ کے ایک مخصوص حصے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھیں' یہاں ''پتوکی تا لاہور'' لکھا ہوا ہے۔''

''میں یہ تمام اندراجات اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بشیر احمد! ذرا سوچ کر بتاؤ' تم نے کل کتنے بجے مقتول کو یہ ٹکٹ دیا تھا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے جناب! اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا۔ میرا خیال ہے' پونے چھ یا چھ بجے کا وقت ہوگا جب مقتول مختار حسین نے مجھ سے ایک ٹکٹ طلب کیا۔ وہ لاہور جانا چاہتا تھا۔ کراچی سے آنے والی ایک ٹرین

ساڑھے چھ بجے پتوکی پہنچتی ہے۔ مقتول اسی ٹرین سے لاہور جانا چاہتا تھا۔ میں نے رانا صاحب کو سلام کیا' ٹکٹ کی رقم وصول کی اور یہ ٹکٹ بنا کر ان کی جانب بڑھا دیا۔ مجھے یہ تمام باتیں اچھی طرح یاد ہیں ابھی کل رات ہی کی تو بات ہے۔''

اس کا تفصیلی جواب سننے کے بعد میں نے سوال کیا۔ ''کیا مقتول اس وقت اکیلا ہی تھا؟''

''بالکل اکیلا تھا جناب۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اسی لیے تو اس نے صرف ایک ہی ٹکٹ لیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم میرا مطلب نہیں سمجھے بشیر احمد!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھ دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا مقتول بالکل تنہا اسٹیشن پہنچا تھا یا کوئی اسے چھوڑنے بھی آیا تھا؟''

میں نے یہ سوال ایک اہم امکان کے پیش نظر کیا تھا۔ اگر گزشتہ شب مقتول کے ساتھ کسی اور شخص کی موجودگی ثابت ہو جاتی تو قاتل کی تلاش میرے لیے قدرے آسان ہو جاتی لیکن ٹکٹ بابو کے جواب نے یہ امکان بھی معدوم کر دیا۔

''جناب! میں نے تو رانا صاحب کے ہمراہ کسی اور شخص کو نہیں دیکھا تھا۔'' اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔ ''ہاں' اگر کوئی ذرا ہٹ کر کھڑا ہو تو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''بشیر احمد! کراچی سے آنے والی وہ ٹرین کہاں تک جاتی ہے؟''

''راولپنڈی تک جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مذکورہ ٹرین گزشتہ رات وقت مقررہ پر یہاں پہنچ گئی تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بتایا۔ ''ٹرین آدھا گھنٹہ لیٹ تھی جناب۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ٹرین سات بجے پلیٹ فارم پر پہنچی تھی؟'' میں نے پرسوچ انداز میں خود کلامی کی۔

بشیر احمد نے جلدی سے کہا۔ ''بالکل سات بجے تھانے دار صاحب۔''

''بشیر احمد!'' میں نے ٹکٹ بابو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم سے ٹکٹ خریدنے اور ٹرین کی آمد کے درمیانی وقفے میں تم نے مقتول کی کوئی جھلک دیکھی تھی؟''

وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''جناب! میری کھڑکی سے اسٹیشن کا پلیٹ فارم نظر نہیں آتا..... میرا مطلب ہے' ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر نہیں آتا اس لیے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے' میں نے مقتول کو ٹکٹ دینے کے بعد پھر زندہ حالت

میں نہیں دیکھا تھا۔ ازیں علاوہ ٹرین کی آمد کے ساتھ ہی میری چھٹی کا وقت ہو گیا تھا اس لیے میں نے اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت میری پوری توجہ عبدالخالق کی طرف تھی جس میں چارج دے رہا تھا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ ''بشیر احمد! ذرا سوچ کر بتاؤ' تم نے مقتول کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی دیکھا تھا؟''

یہ سوال میں نے خاص طور پر اس لیے بھی کیا تھا کہ جائے وقوعہ پر مجھے سامان نام کی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ بشیر احمد کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے مقتول رانا مختار حسین کے پاس ایک قیمتی بریف کیس بھی دیکھا تھا۔''

''بریف کیس!'' میں نے بے اختیار دہرایا۔

''جی ہاں' بریف کیس۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ بات مجھے اس لیے بھی یاد رہ گئی کہ جب رانا صاحب میری کھڑکی کے سامنے کھڑے ٹکٹ بنوا رہے تھے تو اس وقت انہوں نے وہ سیاہ بریف کیس کھڑکی کے آگے بنے ہوئے سنگی شیلف پر رکھ دیا تھا۔''

یہ انکشاف خاصا اہم تھا کیونکہ مقتول مختار حسین کی لاش کے نزدیک مجھے بریف کیس نامی کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ میرے ذہن میں ایک فوری خیال نے سر ابھارا..... کہیں خدا بخش قلی نے تو وہ بریف کیس نہیں اڑا لیا تھا؟''

خدا بخش شکل وصورت سے جرائم پیشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم قتل کی اس سنگین واردات میں' میں اسے یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں جب اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آیا تھا تو افتخار حسین کو میں نے باہر ہی رکنے کی ہدایت کی تھی۔ بریف کیس کی تصدیق کے لیے میں نے مقتول کے بیٹے کو کمرے میں بلا لیا اور پوچھا۔

''افتخار حسین! تمہارے باپ کے پاس کوئی بریف کیس وغیرہ بھی تھا؟''

وہ چونک اٹھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل تھا جناب۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''پتہ نہیں' اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔ وہ بریف کیس مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اس بریف کیس میں تو ایک بھاری رقم موجود تھی۔''

''بھاری رقم!'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ ''کتنی رقم تھی اس سیاہ بریف کیس میں؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں بالکل درست رقم تو نہیں بتا سکتا تاہم وہ ہزاروں روپے تھے جو انہوں نے اپنے لاہور والے بھائی یعنی میرے تایا کو دینا تھے۔''

اس زمانے کے ہزاروں روپے آج کل لاکھوں میں بنتے ہیں۔ افتخار حسین کے انکشاف نے مجھے قدرے مختلف خطوط پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ مقتول کے پاس بریف کیس میں ایک بڑی رقم موجود تھی اور قتل کے بعد اس کی لاش کے پاس سے وہ بریف کیس نہیں ملا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں سوچا جا سکتا تھا کہ مقتول مختار حسین کو رقم کی خاطر قتل کیا گیا تھا اور قاتل بریف کیس حاصل کر کے غائب ہو گیا تھا۔ اس تھیوری سے ایک اہم بات یہ بھی سامنے آتی تھی کہ قاتل اس راز سے واقف تھا کہ مقتول کے بریف کیس میں ایک بھاری رقم موجود تھی اور وہ اس بریف کیس کے ساتھ بذریعہ ٹرین لاہور جانے والا تھا۔ گویا قاتل' مقتول کے معمولات اور پروگرام سے بخوبی آگاہ تھا۔ ان خطوط پر سوچتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ قاتل' مقتول کا کوئی قریبی شخص تھا۔

میں نے افتخار حسین سے پوچھا۔ ''برخوردار! تمہارے باپ کے لاہور جانے والے پروگرام سے کتنے لوگ آگاہ تھے؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں' ماں جی' میری چھوٹی بہنیں اور..... اور مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے ابا جی نے کسی سے ذکر کیا ہو۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''میری معلومات کے مطابق تم کاروبار میں اپنے مقتول باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس کے علاوہ تمہاری دکان میں دو ملازم بھی کام کرتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔''

میں نے پوچھا ''مختار کلاتھ ہاؤس میں کام کرنے والے ملازموں کے نام کیا ہیں؟''

''ایک کا نام منظور احمد ہے۔'' افتخار حسین نے بتایا۔ ''اور دوسرا ناظم علی۔''

''وہ کتنے عرصے سے تمہاری دکان پر کام کر رہے ہیں؟''

''پانچ اور آٹھ سال سے۔'' افتخار حسین نے جواب دیا پھر خود ہی وضاحت کر دی۔ ''منظور کو وہاں کام کرتے ہوئے پانچ سال ہوئے ہیں اور ناظم آٹھ سال سے ہمارے ساتھ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' دونوں پرانے ہیں۔''

''جی ہاں' ایسا ہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پھر تو یہ بات انہیں ضرور معلوم ہوگی کہ مقتول مختار حسین گزشتہ رات
جانے والا تھا؟''

''اس بات کے صد فی صد امکانات ہیں۔'' افتخار نے بتایا۔ ''کل دن کے وقت ملازم
کی موجودگی میں اس سلسلے میں میری ابا جی سے بات ہوئی تھی۔ اس وقت ابا جی نے مجھے
پروگرام کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ انہیں اتوار کا پورا دن یعنی آج کا دن لاہور میں گزار کر
میں واپس پتوکی آنا تھا۔'' بات کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے افتخار کی آواز بھرا گئی۔ باپ کی نا
موت نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر شکستگی تھی۔

چند لمحات تک میں نے اس کے سنبھلنے کا انتظار کیا پھر پوچھا ''افتخار! ذرا سوچ کر بتاؤ
تمہارے دونوں ملازم یہ بات جانتے تھے کہ مختار حسین ایک بڑی رقم اپنے ساتھ لے کر لاہور جا
تھا؟''

''آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہ
جناب۔'' وہ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ جس انداز میں سوچ رہے ہیں اس
امکانات نہیں ہیں۔ منظور اور ناظم ہمارے برسوں کے آزمائے ہوئے ہیں۔ ہم ان پر پورا بھر
رکھتے ہیں۔ ان کی طرف سے ایسی گری ہوئی حرکت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔'' ایک لمحے
توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں بریف کیس والی رقم کے بار
میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم باپ بیٹے کے درمیان اس حوالے سے ان کے سامنے کوئی بات نہیں ہو
تھی۔ مجھے بھی شام میں گھر آ کر ماں کی زبانی اس رقم کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''افتخار حسین! ہم کسی امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو بعض اوقات ا
افراد پر بھی شک کرنا پڑتا ہے جن کا موجودہ کیس سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے فرض
تقاضا ہے۔ بہرحال' کیا منظور اور ناظم سے میں اس وقت مل سکتا ہوں؟''

''اس وقت تو ممکن نہیں۔'' افتخار نے جلدی سے کہا۔

''میرا مطلب تھا' تمہاری دکان پر جا کر!''

''آج دکان بند ہے۔'' افتخار نے بتایا۔ ''اتوار کے روز ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہے اور وہ دونوں
بھی پتوکی سے ڈیڑھ کر رہتے ہیں۔ وہ کل صبح ہی دکان پر پہنچیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان دونوں کی رہائش کہاں ہے؟''

''منظور احمد تو کوٹ سردار میں رہتا ہے۔'' افتخار نے جواب دیا۔ ''اور ناظم علی چونیاں

رہنے والا ہے۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کل تک انتظار کرنا ہی پڑے گا۔'' ایک لمحے کے
توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''میں ایک کام تمہارے ذمے لگا رہا ہوں افتخار۔'' اس نے تعاون
آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تم کل صبح ان دونوں کو لے کر میرے پاس تھانے آ جانا۔
ان کا بیان بہت ضروری ہے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا جناب۔'' افتخار نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ٹکٹ بابو بشیر احمد سے مزید دو چار سوالات کرنے کے بعد میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے
باہر نکل آیا۔ مقتول کی لاش کے ساتھ اے ایس آئی فلک شیر اور ایک کانسٹیبل گیا تھا۔ دوسرا
کانسٹیبل اس وقت میرے ساتھ تھا۔ کمرے سے باہر آتے ہی کانسٹیبل نے پوچھا۔

''ملک صاحب! اب مقتول کے گھر جانا ہے نا!''

''مقتول کے گھر تو جانا ہی ہے۔'' میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن
اس سے پہلے ایک چھوٹا سا کام بھی کرنا ہے۔''

''کون سا چھوٹا کام جناب؟'' کانسٹیبل نے میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔
''شاید آپ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''پتہ نہیں' یہ خدا بخش کہاں غائب ہو گیا۔''

''وہ تو اس طرف کھڑا ہے جناب۔'' کانسٹیبل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ
دیکھیں' بوتلوں والی دکان کے پاس۔''

مجھے بھی وہ دکھائی دے گیا تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''جاؤ' جلدی سے اسے بلا کر
یہاں لے آؤ۔''

تھوڑی ہی دیر بعد قلی خدا بخش میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''میرے
لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب!''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا بخش! میں ان لوگوں کی بڑی سے
بڑی خطا بھی معاف کر دیتا ہوں جو میرے ساتھ تعاون کا اظہار کرتے ہوئے سچ بولتے ہیں
اور.....'' میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''اور جو لوگ اپنی
چالاکی سے مجھے فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں یا حقائق کو چھپا کر دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں'
میں ان کو الٹا لٹکا کر کھال کھینچ لیتا ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ منمنایا۔ ''بات تو میری سمجھ میں آ رہی ہے سرکار لیکن آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے۔ اگر میں نے تھانے میں قتل کی اس واردات کی اطلاع دی ہے تو یہ کوئی جرم تو نہیں؟''

''تھانے آ کر کسی بھی اہم واقعے کی اطلاع دینا کوئی جرم نہیں خدا بخش۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں تم کسی بھی طرح قصور وار نہیں ہو البتہ اب میں جو کچھ تم سے پوچھنے والا ہوں اگر اس کے جواب میں تم نے غلط بیانی کی تو یہ تمہارا سنگین جرم ثابت ہوگا۔''

وہ گھگیایا۔ ''میں ہرگز غلط بیانی نہیں کروں گا۔ آپ پوچھیں' کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''خدا بخش! جب آج صبح لگ بھگ سات بجے تم نے مختار حسین کی لاش دیکھی تو لاش کے پاس تمہیں اور کیا چیز نظر آئی تھی؟''

''کچھ نہیں جناب۔'' وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''وہاں جھاڑیوں کے پاس صرف رانا صاحب کی لاش ہی پڑی ہوئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ کل رات جب مقتول ریلوے اسٹیشن پہنچا تو اس کے پاس ایک سیاہ بریف کیس بھی تھا۔''

''بریف کیس..... میں بریف کیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹکٹ بابو بشیر احمد اس سیاہ بریف کیس کی تصدیق کر چکا ہے۔' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم کہہ رہے ہو کہ بریف کیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

خدا بخش نے منت آمیز لہجے انداز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! میں آپ سے ہرگز غلط بیانی نہیں کروں گا۔ اگر ٹکٹ بابو نے مقتول کے پاس کوئی سیاہ بریف کیس دیکھا تھا تو دیکھا ہوگا۔ میں نے تو پہلی مرتبہ مقتول کو بتی گودام سے آگے جھاڑیوں کے پاس ہی دیکھا تھا اور وہ بھی لاش کی صورت میں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اس وقت وہاں کوئی بریف کیس موجود نہیں تھا۔''

''جانتے ہو' اس بریف کیس میں کیا تھا؟''

''نہیں جناب' میں کچھ نہیں جانتا۔''

''بریف کیس میں ہزاروں روپے کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں' لرزیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی نے رانا صاحب کو اسی رقم کے لیے قتل کیا ہے۔''

''کسی نے..... کون؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''مجھے کیا پتہ جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ہوگا کوئی ظالم شخص۔''

''تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں سرکار۔''

''جھوٹ بولنے کا انجام تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔''

''میں نے مر کر خدا کو جواب دینا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو خدا مجھے اسی وقت غرق کر دے۔''

خدا بخش نے آخری جملہ دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا جس سے سچائی جھلکتی تھی۔ کوئی دروغ گو اس انداز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے خدا بخش کی بے گناہی کا یقین ہو گیا تاہم میں اپنے فرائض کے سلسلے میں قانونی تقاضوں کو پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''خدا بخش! تمہاری رہائش کس طرف ہے؟''

اس نے ایک نزدیکی بستی کا نام لیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''کیا تم تھانے میں اطلاع کرنے سے پہلے یا بعد میں اپنے گھر بھی گئے تھے؟''

''جی ہاں' میں اسٹیشن سے سیدھا اپنے گھر گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''پہلے میں نے اپنی گھر والی کو اس سانحے کے بارے میں بتایا پھر تھانے کا رخ کیا۔''

اس کے جواب میں شک کی گنجائش تھی۔ اگر اس قتل میں ملوث ہونے یا صرف بریف کیس اڑا لے جانے میں خدا بخش کا کوئی ہاتھ تھا تو تھانے آنے سے پہلے اس کا اپنے گھر جانا ذہن میں شکوک و شبہات کو جنم دیتا تھا۔ اس بات کا تو مجھے ننانوے فی صد یقین تھا کہ قتل خدا بخش نے نہیں کیا تھا اور اگر بریف کیس واقعی اس نے اڑایا تھا تو پھر یہ بات واضح تھی کہ مختار حسین کو رقم کے لیے قتل نہیں کیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں قاتل اپنا کام نمٹانے کے بعد بریف کیس کو جائے وقوعہ پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ قوی امکانات اسی بات کے تھے کہ مختار حسین کو رقم کی خاطر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور قاتل خدا بخش نہیں تھا تاہم میں نے اپنی تسلی کی خاطر خدا بخش کے گھر کی تلاشی ضروری سمجھی اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ اپنے گھر چلو گے۔''

''اس کا مطلب ہے' آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔'' وہ شکوا کناں لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ بات یقین آنے یا نہ آنے کی نہیں ہے۔ ہمارا اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ پولیس

کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ ہم چھوٹی سے چھوٹی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''ست بسم اللہ۔'' وہ سادہ لہجے میں بولا۔ ''آپ بڑے شوق سے میرے گھر کی تلا لیں۔ اگر اس طرح میری سچائی ثابت ہوتی ہے تو میرے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔''

خدا بخش کا گھر جس بستی میں تھا وہ مقتول کے گھر کے راستے میں پڑتی تھی۔ ہم پیدل اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم چاروں (میں + کانسٹیبل + افتخار حسین + بخش) خدا بخش کے جھونپڑا نما گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

اس جھونپڑے میں بھوک' افلاس اور محبت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جی ہاں' خدا بخش اپنی بیوی کے ساتھ وہاں محبت بھری زندگی گزار رہا تھا۔ اس گھر کی ہر شے سے عسرت ٹپکتی تھی تا اس بڈھے بڈھی کی محبت مثالی تھی۔ وہ اولاد ایسی نعمت سے محروم' اپنے شب و روز باہمی الفت رفاقت کے سہارے بسر کر رہے تھے۔

میں نے کانسٹیبل کی مدد سے صرف پانچ منٹ کے اندر اس جھونپڑے کی مکمل تلاشی لی۔ قیمتی سیاہ بریف کیس کی وہاں موجودگی کے آثار نہیں ملے تھے۔ اس بات کا مجھے پہلے اندازہ تھا تاہم یہ قانونی کارروائی بھی ضروری تھی۔

''اب تو آپ کی تسلی ہو گئی تھانے دار صاحب!'' خدا بخش نے خانہ تلاشی کے اختتام پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ ہمیں تمہارے گھر سے وہ بریف کیس نہیں ملا جو کل رات مقتول کے پاس دیکھا گیا تھا۔''

''اس سے میری بے گناہی ثابت ہو گئی نا۔''

''فی الحال ..... ایسا کہا جا سکتا ہے۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''لیکن جب تک مختار حسین کے قاتل تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک تم اس علاقے سے باہر نہیں جاؤ گے اور اگر جانا ناگزیر ہی ہو تو پہلے تھانے میں اطلاع دو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں مائی باپ۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''ہم بڈھوں ٹھڈوں نے بھلا چوکی سے باہر کہاں جانا ہے۔ ساری عمری یہیں گزر گئی۔ ہمارا تو کوئی ہے بھی نہیں جس کے پاس جائیں گے۔'' ایک ٹھنڈی اور یاس انگیز آہ بھرنے کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ ''ٹھیک ہے تھانے دار صاحب! اگر خدانخواستہ مجھے یا میری گھر والی کو چوکی سے باہر جانا ہوا

تو میں ضرور تھانے میں اطلاع کروں گا۔''

''ایک بات اور۔'' اس کی بات ختم ہونے پر میں نے کہا۔ ''کل کسی وقت تھانے آ کر اپنا بیان ضرور ریکارڈ کروا لینا۔''

''میں آج ہی شام کو حاضر ہو جاؤں گا سرکار۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

ہم اس کے گھر سے باہر نکل آئے۔

کچھ دیر بعد میں مقتول مختار حسین کے شان دار گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور وہاں پر موجود اشیاء سے مقتول کی امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ویسے ایک دو مرتبہ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے ''مختار کلاتھ ہاؤس'' بھی دیکھا تھا۔ وہ مذکورہ بازار کی سب سے زیادہ بڑی اور خوب چلنے والی دکان تھی۔

مقتول کی بیوہ رابعہ بیگم اور صاحب زادے افتخار حسین سے آدھے گھنٹے کی گفتگو کے دوران میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں' میں یہاں ان کا خلاصہ بیان کروں گا۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ آدھے گھنٹے کی اس گفتگو کے لیے مجھے ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ رانا مختار حسین کی اچانک موت نے پورے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا تھا۔ رابعہ بیگم اور چھوٹی بچیوں کا برا حال تھا۔ میں بڑی مشکل سے رابعہ بیگم کو بات چیت کے لیے آمادہ کر پایا تھا۔ اس گھر اور گھر کے مکینوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس کی تباہ کاریوں کا ذکر موقوف کر کے میں ضروری اور اہم واقعات کی طرف آتا ہوں۔

رابعہ بیگم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس کا جیٹھ یعنی مقتول کا بڑا بھائی رانا دلدار حسین لاہور کے مشہور علاقے کرشن نگر میں رہتا تھا۔ وہ بھی کپڑے ہی کا کاروبار کرتا تھا اور لاہور کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں دلدار کی تھوک کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی۔ مقتول بھی اپنی دکان کے لیے سارا مال بڑے بھائی ہی سے لیتا تھا اور ہر مہینے کے اختتام پر حساب کر لیا جاتا تھا۔

چند روز قبل دسمبر کے آخر میں معمول کا حساب ہو چکا تھا لیکن جنوری کے ابتدائی دنوں میں مقتول کو بڑے بھائی کا یہ پیغام ملا کہ اسے ایک بڑی رقم کی فوری ضرورت ہے۔ مقتول کے پاس رقم کی مطلوبہ رقم موجود تھی چنانچہ وہ ہفتے کی شام بذریعہ ٹرین لاہور جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا ہوا۔ اس نے مذکورہ رقم سیاہ بریف کیس میں ڈالی اور چوکی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا اسے وہ اندوہناک حادثہ پیش آیا تھا جس میں رقم سے بھرے ہوئے قیمتی بریف کیس کے ساتھ اس کی جان بھی چلی گئی تھی۔

رابعہ بیگم نے بتایا کہ مقتول کا پروگرام ایک دن لاہور میں گزارنے کا تھا۔ وہ اتوار کی
واپس پتوکی آ جاتا مگر اسے پتوکی سے جانا ہی نصیب نہیں ہوا تھا تو واپس کہاں سے آتا۔ رابعہ
بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''آپ نے ابھی تک رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

وہ ذہین عورت تھی۔ فوراً میرے سوال کا مقصد سمجھ گئی' بولی۔ ''بھائی دلدار نے دس
روپے منگوائے تھے۔ بریف کیس میں اتنی ہی رقم موجود تھی۔''

''دس ہزار روپے!'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''یہ تو خاصی تگڑی رقم ہے بھئی۔''

''جی ہاں' رقم تو واقعی خاصی بڑی ہے۔'' رابعہ بیگم نے کہا۔ ''دراصل مختار اپنے بڑے بھ
کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا پھر اس کے پاس رقم بھی موجود تھی۔ اس لیے کم یا زیادہ کا کیا سوال
اس سے زیادہ رقم کا بھی نقصان ہو جاتا تو دکھ کی بات نہیں تھی مگر مختار.....''

اس کی آواز بھرا گئی۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں امڈ آ
والے آنسوؤں کو صاف کرنے لگی۔ وہ اس وقت جتنے بڑے خسارے سے گزر رہی تھی اس
اندازہ صرف وہی عورت کر سکتی ہے جو بھری بہار میں اچانک بیوہ ہو جائے۔

اس زمانے کے دس ہزار روپے آج کل کے پانچ لاکھ سمجھ لیں۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں
تاہم رابعہ بیگم کا زیاں اس سے لاکھوں گنا زیادہ اور مستقل تھا۔ کہتے ہیں' دولت ہاتھ کا میل ہو
ہے۔ دولت میں ہونے والا بڑے سے بڑا نقصان بھی پورا کیا جا سکتا ہے لیکن مختار حسین کی ا
خیز موت نے رابعہ بیگم کی زندگی میں جو خلا پیدا کر دیا تھا اسے زمانے بھر کی دولت بھی پُر نہیں کر سکتی
تھی۔

وہ جذبات کے ریلے سے ذرا سنبھلی تو میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو اس سے
افتخار حسین سے کر چکا تھا۔ میں نے رابعہ بیگم سے پوچھا۔

''خاتون! اچھی طرح سوچ کر بتائیں' آپ کے مرحوم شوہر کی کسی سے کوئی دشمنی وغیر
نہیں تھی؟''

وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ ''کاروبار میں مسابقت' مخاصمت اور مقابلہ وغیرہ تو
ہی رہتا ہے لیکن عمومی طور پر مختار ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ میرا نہیں خیال کہ اس کا کوئی
بھی دشمن ہوگا جو اس کی جان ہی لے لے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بات کو ذہن میں ضرور رکھیں۔ مختار کی موت کا کوئی نہ کوئی تعلق اس

بریف سے ضرور ہے جس میں دس ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر یہ کسی چور اچکے کا کام لگتا ہے تھانے دار صاحب!'' افتخار حسین نے
خیال آرائی کی۔

''اور وہ چور اُچکا کوئی ایسا شخص ہوگا جسے یہ معلوم ہو کہ مقتول کے بریف کیس میں ایک
بھاری رقم موجود ہے۔'' میں نے افتخار کی جانب دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مختار کا قاتل
یقینی طور پر کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو مقتول کے معمولات اور روزمرہ کے پروگرام سے واقف
ہو۔ خصوصاً کل رات لاہور جانے والے پروگرام سے۔''

''خدا جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آن پڑی ہے۔'' رابعہ بیگم نے دونوں ہاتھوں سے
اپنا سر تھام لیا۔ ''مختار نے تو کبھی کسی کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا' پھر اس کے ساتھ یہ سلوک
کیوں کیا گیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' یہ
سب کیا ہو گیا ہے!''

میں نے ہمدردی آمیز لہجے میں کہا۔ ''رابعہ خاتون! آپ ان حالات میں اپنے ذہن پر
زیادہ زور نہ ڈالیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے شوہر کا قاتل بہت جلد قانون کی
گرفت میں ہوگا۔''

پھر میں نے اٹھتے ہوئے افتخار حسین کو مخاطب کیا۔ ''برخوردار! میں نے تمہارے ذمے جو
کام لگایا ہے اسے یاد رکھنا۔

''کون سا کام ملک صاحب؟'' وہ بے ساختہ بولا۔

''وہی کام..... منظور اور ناظم والا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''اچھا اچھا۔ ہاں' میں آپ کی ہدایت کو یاد رکھوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔
کل وہ دونوں آپ کے پاس تھانے حاضر ہو جائیں گے۔''

میں کانسٹیبل کے ہمراہ مقبول کے گھر سے باہر نکل آیا۔

دوسرے روز دوپہر سے تھوڑا پہلے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی اس رپورٹ کے
مطابق ہفتہ کی رات چھ اور آٹھ بجے کے درمیان مختار حسین کی موت واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب
سر کے عقبی حصے میں لگنے والی وہ شدید ترین چوٹ تھی جس نے کھوپڑی کا پچھلا حصہ چٹخا دیا تھا۔
بہ ظاہر پر وہ چوٹ کسی ٹھوس آہنی چیز سے لگائی تھی۔ رپورٹ میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا
تھا کہ مقتول کے سر کو اس کی بے خبری میں نشانہ بنایا گیا تھا اور حملہ آور کوئی پستہ قامت شخص تھا۔

دوپہر کے بعد افتخار حسین اپنے مقتول باپ کی لاش لینے تھانے آیا تو اس کے ساتھ دکان کے دونوں ملازم منظور اور ناظم بھی تھے۔ میں نے منظور اور ناظم کو ایک جانب بٹھا دیا اور خود ضروری کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ جب افتخار حسین مقتول مختار حسین کی لاش لے کر تھانے سے رخصت ہو گیا تو میں اپنے کمرے میں آن بیٹھا اور کانسٹیبل سے' پہلے منظور احمد کو اندر بھیجنے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد منظور میرے سامنے کھڑا تھا۔

منظور احمد کی عمر اٹھارہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ وہ ایک گبرو جوان تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ منظور احمد۔''

وہ میری میز کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''منظور! میں نے تمہیں بیٹھنے کو کہا ہے تو اس کا مطلب ہے' تم مجھے معقول آدمی لگے ہو۔ کیا میرے سوالات کے جواب میں بھی معقولیت کا اظہار کرو گے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب!'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں تمہارے منہ سے صرف اور صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''میں بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا جی؟''

میں نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''منظور! تمہیں رانا صاحب کی موت کا یقیناً صدمہ ہوا ہوگا؟''

''بہت گہرا صدمہ جناب۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''بڑے رانا صاحب بہت نیک دل اور خدا ترس انسان تھے۔ ملازموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ پتہ نہیں' کس ظالم نے ان کی جان لی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا' کوئی ایسے پرخلوص انسان سے بھی دشمنی کر سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''منظور! مجھے چھوٹے رانا نے بتایا ہے کہ تم مقتول کے پاس گزشتہ پانچ سال سے کام کر رہے ہو۔''

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''رانا افتخار نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں ایک چھوٹی دکان ''مجاہد کلاتھ ہاؤس'' پر کام کرتا تھا مگر وہاں تنخواہ بہت کم ملتی تھی۔''

''رانا مختار تو تمہیں خاصی معقول تنخواہ دیتا تھا۔''

''رانا صاحب کی تو بات ہی اور تھی جناب۔''

''منظور احمد! پانچ سال ایک اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے بتایا ہے کہ مقتول تمہارا بہت خیال بھی رکھتا تھا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی اس کا خیال رکھتے ہو گے؟''

''ظاہر ہے جناب' جی کو جی ہوتی ہے۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''رانا صاحب تو ایسے نیک بندے تھے کہ ان پر جان بھی چھڑکی جا سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''منظور! جب تم مقتول سے اتنے قریب تھے تو تمہیں اس کے معمولات کی بھی خبر رہتی ہوگی۔''

''بالکل جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھے اچھی طرح معلوم تھا' وہ کتنے بجے دکان پر آتے تھے' کتنے بجے دوپہر کا کھانا کھاتے تھے اور کتنے بجے دکان سے واپس گھر چلے جاتے تھے۔''

''اس کے علاوہ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ چتوکی سے باہر کب کب جاتے تھے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ متامل لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہر مہینے کے آخر میں وہ ایک چکر لاہور کا ضرور لگاتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار دوسرے شہروں کی طرف بھی چلے جاتے تھے۔''

میں نے اچانک پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہفتے کی رات وہ کہاں جانے کے لیے گھر سے نکلے تھے؟''

''انہیں لاہور جانا تھا۔''

''لاہور تو وہ مہینے کے آخر میں جاتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور میری معلومات کے مطابق ستمبر کے آخر میں وہ لاہور کا چکر لگا آیا تھا۔''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! مہینے کے آخر میں تو وہ کاروباری حساب کتاب کی خاطر لاہور جاتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہفتے کی رات وہ خلاف معمول کیوں لاہور جا رہا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا' ''اس نے اس سلسلے میں تمہیں کچھ بتایا تھا؟''

''زیادہ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں جناب۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تاہم انہوں نے اتنا ذکر ضرور کیا تھا کہ انہیں ایمرجنسی میں لاہور جانا پڑ رہا ہے اور یہ کہ وہ اتوار کی شام واپس آ جائیں گے۔''

''انہوں نے ایمرجنسی کی وضاحت نہیں کی تھی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

منظور احمد کی باتوں سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بریف کیس والی رقم یا مقتول کے لاہور جانے کے مقاصد سے واقف نہیں تھا۔ یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ اس کا اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں تھا بشرطیکہ اس نے ابھی تک غلط بیانی سے کام نہ لیا ہو۔ میں نے دوسرے زاویے سے چند سوالات بھی ضروری سمجھے۔ میں نے پوچھا۔

''منظور احمد! ''مختار کلاتھ ہاؤس'' کو صبح کون کھولتا ہے؟''

''جناب' آج تو رانا صاحب کے سوگ میں دکان بند ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں آج کی نہیں' معمول کی بات کر رہا ہوں۔''

منظور نے بتایا۔ ''میرے اور ناظم میں سے جو بھی پہلے رانا صاحب کے گھر پہنچ جاتا تھا' چھوٹے رانا صاحب اس کے ساتھ دکان پر آتے ہیں۔ دکان رانا افتخار کی نگرانی میں کھولی جاتی تھی۔ بڑے رانا صاحب بعد میں دکان پر آتے تھے۔''

''ہوں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اور دکان کو بند کون کرتا تھا؟''

''بند بھی چھوٹے رانا صاحب اپنی موجودگی ہی میں کرواتے تھے۔'' منظور نے بتایا۔ ''اس وقت میں اور ناظم دونوں وہاں موجود ہوتے تھے۔ بڑے رانا صاحب دکان بند کرنے سے آدھا گھنٹہ پہلے اٹھ کر گھر چلے جاتے تھے۔''

''دکان عموماً کتنے بجے کھلتی او کتنے بجے بند ہوتی تھی؟''

''آج کل سردیوں کا موسم ہے۔ دن خاصے چھوٹے ہوتے ہیں۔'' منظور نے بتایا۔ ''عموماً صبح دس بجے دکان کھولی جاتی تھی اور شام کو پانچ بجے ہم دکان بند کر دیتے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا وقوعہ کے روز بھی شام پانچ بجے دکان بند کر دی گئی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' ساڑھے چار بجے مقتول دکان سے اٹھ کر گھر چلا گیا ہوگا۔ تم نے بتایا ہے نا' وہ دکان بند کرنے سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی گھر چلا جاتا تھا؟''

منظور نے بتایا۔ ''اس روز رانا صاحب خلاف معمول دوپہر کے کھانے کے بعد ہی گھر چلے گئے تھے۔'' ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ''شاید انہیں لاہور جانے کے لیے تیاری شیاری کرنا تھی۔''

رابعہ بیگم نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول سوا دو بجے ہی گھر آ گیا تھا۔ اس سے منظور کے بیان کی بھی تصدیق ہوتی تھی۔ میں نے منظور احمد سے پوچھا۔ ''منظور! تم نے بتایا ہے

کہ وقوعہ کے روز حسب معمول پانچ بجے شام دکان بند کی گئی تھی۔ اس کے بعد تم کہاں گئے تھے؟''

''میں سیدھا اپنے گھر گیا تھا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا گھر کوٹ سردار میں ہے نا!''

''ہاں جی' میں کوٹ سردار ہی کا رہنے والا ہوں۔''

''کیا دکان بند کرنے کے فوراً بعد تم اپنے گھر روانہ ہو گئے تھے؟''

''جی بالکل' فوراً روانہ ہو گیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا' رات چھ سے آٹھ بجے کے درمیان تم چتو کی شہر میں نہیں تھے۔'' میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں درج مقتول کی موت کے وقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پوچھا۔

منظور کے جواب سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ وقوعہ کے وقت چتو کی ریلوے اسٹیشن سے بہت دور پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس سے وقوعہ سے دوری کے لیے ثبوت مانگا تو اس نے اطمینان بخش ثبوت مہیا کر دیا۔ اس سے منظور کی بے گناہی ثابت ہوتی تھی۔ رات چھ اور آٹھ بجے کے درمیان وہ ایک ایسے مقام پر تھا جو جائے وقوعہ سے خاصے فاصلے پر تھا۔

میں نے مزید چند سوالات کے بعد منظور احمد کو فارغ کر دیا اور دکان کے دوسرے ملازم ناظم علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

ناظم علی کی عمر لگ بھگ پچیس سال تھی۔ وہ دبلا پتلا مسکین صورت شخص تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ منظور احمد کی طرح ناظم علی بھی دراز قامت تھا جب کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بات ظاہر کی گئی تھی کہ مقتول کی کھوپڑی پر ضرب لگانے والا کوئی پستہ قامت شخص تھا۔ یہ نکتہ دونوں ملازمین کے حق میں جاتا تھا۔

میں نے آدھے گھنٹے تک ناظم علی سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن کوئی مفید اور اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس کا بیان منظور کے بیان سے لگا کھاتا تھا۔ افتخار حسین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے بھی وہ دونوں بڑی حد تک اس معاملے سے دور ہی نظر آتے تھے۔ تاہم انہیں تھانے سے رخصت کرنے سے قبل میں نے ان کے گھروں کے مکمل ایڈریس اپنے پاس نوٹ کر لیے تھے۔ ناظم علی چونیاں میں ''محمد پورہ'' کا رہنے والا تھا۔ میں نے انہیں تاکید کر دی تھی کہ جب تک مختار حسین کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا' وہ تھانے میں اطلاع دیئے بغیر ضلع سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔

آئندہ دو چار روز میں بڑی سرگرمی سے نامعلوم پستہ قامت قاتل کو تلاش کرتا رہا لیکن ناکامیابی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں نے اپنی کارکردگی کی مکمل رپورٹ علاقہ ایس پی کو روانہ کر

دی تھی اور استدعا کی تھی کہ وسیع پیمانے پر قاتل کی تلاش کے لیے مجھے اختیارات تفویض کیے جائیں۔ ایس پی صاحب نے اپنے تعاون کا مجھے بھرپور یقین دلایا تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ قاتل واردات کے بعد پتوکی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔

میں نے تھوڑی دیر کے لیے قاتل کو بھول کر سیاہ قیمتی بریف کیس کو اپنے ذہن میں بسا لیا تھا۔ اگر میں مذکورہ بریف کیس کا کوئی سراغ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو قاتل تک رہنمائی ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں' میں نے اپنے تھانے کے عملے کو تو مستعد کیا ہی تھا' ساتھ ہی سادہ لباس افراد کو بھی اس مہم میں شامل کر لیا۔ ان سادہ لباس میں سے زیادہ تر عام شہری تھے میں نے دو دو' تین تین افراد پر مشتمل ٹولیوں کو آس پاس کے علاقوں میں پھیلا دیا۔ اس کے علاوہ چونیاں' بلوکی' بھوئے آسل' چھانگا مانگا' کوٹ رادھا کشن اور پریم نگر کے متعلقہ تھانوں کو بھی تعاون کے لیے آمادہ کر لیا۔ پتوکی کے پورے علاقے پر بھی میں نے گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

''چند روز بعد میری یہ محنت رنگ لے آئی۔ چھانگا مانگا تھانے کا ایک حوالدار میرے پاس پہنچا رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ایک' چادر کی گٹھڑی کو میری میز پر رکھ دیا اور زیر لب مسکرانے لگا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے مذکورہ گٹھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

حوالدار بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کھول کر دیکھ لیں جناب!''

اے ایس آئی فلک شیر اس وقت میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فلک شیر! ذرا کھول کر تو دیکھو۔ حوالدار صاحب کیا تحفہ لائے ہیں ہمارے لیے۔''

فلک شیر نے آگے بڑھ کر وہ گٹھڑی کھول دی۔ گٹھڑی کے اندر سے برآمد ہونے والی چیز کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

وہ ایک ٹوٹا پھوٹا سیاہ بریف کیس تھا!

''اوہ!'' میرے منہ سے ایک گہرا سانس خارج ہوا۔ میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملا حوالدار؟''

''یہ چھانگا مانگا کے جنگلات کی سوغات ہے جناب۔'' حوالدار نے ذومعنی لہجے میں بتایا۔

''میں سمجھا نہیں!''

وہ بولا۔ ''آپ کو اسی کالے بریف کیس کی تلاش تھی نا!''

''تمہارے سوال کا حتمی جواب میں تھوڑی دیر بعد دوں گا۔'' میں نے حوالدار سے کہا پھر

فلک شیر کو مخاطب کیا۔ ''فلک شیر! مقتول کے بیٹے افتخار حسین کو تھانے بلانے کا فوری بندوبست کرو۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!''

''جی بالکل سمجھ گیا۔'' اے ایس آئی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کچھ بریف کیس کی شناخت افتخار کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔''

اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے چھانگا مانگا کے تھانے سے آنے والے حوالدار سے پوچھا۔ ''حوالدار! تھوڑی دیر بعد اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ بریف کیس مقتول کا ہی ہے یا کوئی اور ہے۔ جب تک تم مجھے اس بریف کیس کے بارے میں بتاؤ۔ یہ تم لوگوں کو کہاں سے ملا؟ اس میں سے کچھ برآمد ہوا؟ اور اس کی یہ حالت کس نے کی ہے؟''

''مجھے افسوس ہے ملک صاحب! میں آپ کے صرف ایک سوال کا ہی جواب دے سکوں گا۔'' حوالدار نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''یعنی یہ کہ یہ بریف کیس ہمیں اس راستے پر پڑا ہوا ملا ہے جو گھنے جنگلات کے اندر تک جاتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے توڑنے پھوڑنے میں کس کا ہاتھ ہے اور یہ کہ اس میں سے کیا کچھ برآمد کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ بالکل اسی شکستہ حالت میں ملا ہے۔ اگر یہ مقتول مختار حسین کی ملکیت ہے تو پھر یہ ساری کارستانی اسی نامعلوم قاتل کی ہو سکتی ہے۔''

حوالدار کا طویل جواب ختم ہوا ہی تھا کہ اسی وقت افتخار حسین اے ایس آئی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اے ایس آئی نے فوراً وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! افتخار مجھے تھانے سے باہر ہی مل گیا تھا۔ یہ اسی طرف آ رہا تھا۔''

''چلیں یہ بھی اچھا ہوا۔'' میں نے کہا پھر میز پر پڑے ہوئے مجروح بریف کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے افتخار حسین سے کہا۔ ''ذرا اس کو تو پہچاننے کی کوشش کرو برخوردار!''

''اسے تو میں پہلی نظر ہی میں پہچان چکا ہوں!'' افتخار میز کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ابا جی کا بریف کیس ہے جس میں وہ دس ہزار روپے بھر کر گھر سے نکلے تھے۔ یہ دیکھیں پکی نشانی۔'' اس نے بریف کیس کے ہینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ بریف کیس کے ہینڈل کے ساتھ ہی انگریزی حروف ''آر۔ ایم۔ ایچ'' واضح طور پر لکھا دکھائی دے رہا تھا جو ''رانا مختار حسین'' کا مخفف ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے افتخار حسین کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم نے پہلے مجھے اس نشانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا برخوردار۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

"نہیں جناب! کوئی خاص یا عام وجہ نہیں ہے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "دراصل پریشانی اور اباجی کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعے کے صدمے نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو خاصا متاثر کر رکھا ہے۔ یوں سمجھیں کہ میری مت ماری گئی تھی جو اس مخصوص نشانی کا ذکر آپ سے نہ کر سکا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "آپ نے بھی تو شناخت کے سلسلے میں بریف کیس کے بارے میں ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا!"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ کوتاہی واقعی مجھ سے ہوئی تھی۔ میں نے شناخت کے ذیل میں "سیاہ" اور "قیمتی" کو ہی کافی جانا تھا۔ بہرحال خدا کا شکر تھا' ہم بریف کیس کا سراغ پا چکے تھے۔

افتخار حسین نے سوال کیا۔ "یہ بریف کیس آپ کو کہاں سے ملا؟"

"یہ چھانگا مانگا کے جنگلات میں سے برآمد ہوا ہے۔" میں نے جواباً بتایا۔ "اور یہ حوالدار صاحب اسے یہاں لے کر آئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سامنے بیٹھے حوالدار کی طرف اشارہ کیا۔'

افتخار حسین نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا قاتل گرفتار ہو گیا؟"

حوالدار نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ "افتخار حسین! یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ قاتل پتوکی ریلوے اسٹیشن پر واردات کرنے کے بعد چھانگا مانگا کی طرف گیا تھا جہاں اس نے زور زبردستی سے بریف کیس کا ستیاناس کر کے رقم نکال لی۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ قاتل کون ہے؟ چھانگا مانگا سے اس کا کیا تعلق ہے اور اس نے کس دشمنی میں مقتول کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا؟ اس کے بعد ہی اس کی گرفتاری کی کوئی صورت نظر آئے گی۔"

"یہ ساری معلومات کس طرح حاصل ہوں گی جناب؟" افتخار حسین نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

میں نے قطعیت سے کہا۔ "چھانگا مانگا جا کر۔"

افتخار حسین نے چھانگا مانگا سے آنے والے حوالدار سے سوال کیا۔ "آپ نے اپنے طور پر کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں جناب' ہمیں جیسے ہی یہ بریف کیس ملا' تھانے دار صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا...... اس بریف کیس کے ساتھ۔" اپنی بات کے خاتمے پر اس نے میز پر رکھے انجر پنجر بریف کیس کی سمت اشارہ کیا۔

میں نے افتخار حسین کو دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی اور اسی وقت چھانگا مانگا روانہ ہو رہا ہوں۔ پھر ساری صورتِ حال سامنے آ جائے گی۔" پھر میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "فلک شیر! چھانگا مانگا چلنے کی تیاری کرو۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا تھانے دار صاحب!" افتخار حسین نے کہا۔ "اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "ویسے بھی اس سلسلے میں آپ نے بہت سے عام شہریوں کو بھی مختلف ذمے داریاں سونپ رکھی ہیں۔ میں تو پھر بھی ایک انتہائی متعلق آدمی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" میں فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

چھانگا مانگا' پتوکی سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم چھانگا مانگا کے متعلقہ تھانے میں بیٹھے تھانہ انچارج سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ میری فرمائش پر تھانے دار نے اس کانسٹیبل کو بھی بلا لیا تھا جس نے وہ بریف کیس دریافت کیا تھا۔ میں نے مذکورہ کانسٹیبل سے پوچھا۔

"جوان! کیا تمہیں یہ بریف کیس اسی ناگفتہ بہ حالت میں ملا تھا؟"

"جی تھانے دار صاحب۔"

"اور یہ جنگل کی جانب والے راستے پر پڑا تھا؟"

"راستہ تو وہ گھنے جنگل ہی کی طرف جاتا ہے جناب۔" کانسٹیبل نے بتایا۔ "مگر یہ بریف کیس راستے سے ایک طرف جھاڑیوں میں الجھا پڑا تھا جیسے کسی نے زور سے گھما کر اس طرف پھینکا ہو۔"

میں نے تھانہ انچارج سے پوچھا۔ "جناب! آپ کو کبھی اس راستے پر گھنے جنگل میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"ملک صاحب! مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی دو ماہ ہی ہوئے ہیں۔" تھانہ انچارج نے جواب دیا۔ "میں نے جنگل کے اندر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ویسے آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس راستے پر چلتے ہوئے گھنے جنگل کے اندر کہاں تک جایا جا سکتا ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ جس شخص نے بریف کیس کا یہ حشر کیا ہے وہ بریف کیس کو جھاڑیوں میں پھینک کر گھنے جنگل ہی کی طرف گیا ہوگا۔ یعنی نامعلوم قاتل...... جس

کی ہمیں تلاش ہے۔"

"آپ کی بات میں وزن ہے ملک صاحب!" تھانہ انچارج نے سوچتے ہوئے کہا پھر کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "خوش بخت' تم کبھی گئے ہو جنگل کے اندر؟"

"کئی بار گوندل صاحب۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "ایک مرتبہ تو میں اپنی گھر والی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔"

میں نے چونک کر کانسٹیبل کی جانب دیکھا۔ اس کے جواب نے میرے ذہن میں ہل چل سی مچا دی تھی تاہم میں فوری طور پر اس ہلچل کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ مجھے لاشعوری طور پر احساس تھا کہ اس جنگل کے حوالے سے کوئی خاص بات ضرور ہے۔ میں نے اضطراری لہجے میں کانسٹیبل سے دریافت کیا۔

"خوش بخت! تم اپنی گھر والی کو کیوں گھنے جنگل میں لے گئے تھے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

خوش بخت نے جواب دینے سے پہلے اپنے تھانہ انچارج صدیق گوندل کی طرف دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ دراصل..... بات تو کچھ ایویں سی ہے پر میرا یقین پکا ہو گیا ہے۔ جب تک آزمایا نہیں تھا' میں بھی اسے فراڈ اور بکواس ہی سمجھتا تھا لیکن....."

"یہ کیا بجھارتیں (پہیلیاں) ڈال رہے ہو خوش بخت!" صدیق گوندل نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟"

"آپ میرا مذاق تو نہیں اڑائیں گے جناب!" کانسٹیبل نے باری باری ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا۔ "بالکل نہیں خوش بخت!"

"اگر بات مذاق اڑانے والی نہیں ہوگی تم کیا ہمارا دماغ خراب ہوا ہے جو تمہارا مذاق اڑائیں گے۔" صدیق گوندل نے سخت لہجے میں کہا۔

تم سب کچھ تفصیل سے بتاؤ خوش بخت۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری بات پوری توجہ سے سنیں گے۔"

خوش بخت نے کہنا شروع کیا۔ "ادھر گھنے جنگل کے اندر ایک بہت پہنچا ہوا عامل کامل رہتا ہے۔ سب اسے "سائیں جی" کے نام سے جانتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے' سائیں بڑا کرنی والا ہے۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس حاجت روائی کے لیے آتے ہیں اور من کی مرادیں لے

جاتے ہیں۔ سائیں نے بیچ جنگل کے ڈیرا بنا رکھا ہے جہاں وہ اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتا ہے۔ سائیں سے منسوب کرامات اور اس کی صلاحیتوں کو پہلے میں بھی نہیں مانتا تھا لیکن جب سائیں کے تعویذ سے میری گھر والی کی گود ہری ہو گئی تو مجھے اس کی بزرگی اور کاملیت پر یقین آ گیا۔ ہم نے اولاد کے لیے ہر جتن کیا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سائیں جی کے تعویذ نے ایک ماہ کے اندر ہی میری گھر والی کی مراد پوری کر دی۔ ہمارا بچہ اب پورے ایک سال کا ہے۔ جو ہمارے شادی کے دس سال بعد پیدا ہوا ہے۔"

خوش بخت کی بات ختم ہوئی تو میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "سچا حاجت روا اور من کی مرادیں پوری کرنے والا تو بس ایک ہی ہے۔ وہی خدا کی ذات' خالقِ کائنات اور مالکِ دو جہاں۔ کوئی انسان کبھی خدائی صفات کا حامل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال!" ایک لمحے کو رک کر میں نے توقف کیا پھر کہا۔ "میں ابھی اور اسی وقت اس "سائیں جی" سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے رانا مختار حسین کے قاتل کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔ بریف کیس کو جھاڑیوں میں پھینکنے کے بعد قاتل نے یقیناً سائیں کے ڈیرے کا ہی رخ کیا ہوگا۔"

صدیق گوندل نے کہا۔ "ملک صاحب! اس سلسلے میں اگر میرے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"آپ کا فی الحال اتنا ہی تعاون درکار ہے کہ کانسٹیبل خوش بخت کو ہمارے ساتھ روانہ کر دیں۔" میں نے تھانہ انچارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پہلے بھی کئی مرتبہ سائیں کے ڈیرے تک جا چکا ہے۔ ہماری رہنمائی کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

صدیق گوندل نے بخوشی خوش بخت کو ہمارے ساتھ جانے کو اجازت دے دی اور کہا۔ "ملک صاحب! میں آپ کی کامیاب واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے گوندل صاحب!" میں نے تہ دل سے کہا۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک گھنے جنگل کے ٹیڑھے میڑھے راستے پر سفر کرتے رہے۔ دورانِ سفر میں خوش بخت نے ہمیں وہ جھاڑی بھی دکھائی جہاں سے مقتول کا کٹا پھٹا بریف کیس ملا تھا۔ وہ مقام جنگل کے ابتدائی حصے ہی میں تھا۔ قصہ مختصر' آدھے پونے گھنٹے کی پُر خار اور دشوار گزار مسافت طے کر کے ہم "سائیں جی" کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

سائیں اپنے چار خدمت گاروں کے ساتھ اس وقت ڈیرے پر موجود تھا۔ اتفاق سے اس وقت کوئی سائل وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں' اے ایس آئی فلک شیر' کانسٹیبل خوش بخت

سرکاری وردی میں تھے۔ جب کہ افتخار حسین سادہ لباس میں تھا۔ سائیں نے ہمیں دیکھتے ہی اک نعرہ مستانہ بلند کیا۔

''حق ہو!'' اس نے آنکھیں بند کر کے تین چار مرتبہ یہ مختصر سا فقرہ دہرایا پھر آنکھیں کھول کر اپنے چیلوں کو احکامات صادر کرنے لگا۔ ''اوے گامو' نظامو! بدبختو' دیکھ نہیں رہے کہ بڑے بڑے لوگ یہاں تشریف لائے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع کا کچھ بندوبست کرو۔ اوے کریمو! تم کہاں مر گئے ہو؟''

گاموں' نظامو کے علاوہ کرمو اور کریمو بھی وہیں موجود تھے تاہم سائیں جی نے انہیں اس انداز میں پکارا تھا جیسے وہ غیر موجود ہوں۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''سائیں جی! ہم یہاں خدمت کروانے نہیں آئے بلکہ ایک ضروری کام ہمیں آپ کے پاس کھینچ لایا ہے۔''

''سب کام ہی سے آتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ میری وردی پر سجے ہوئے بیجز سے میرے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خاصا ہوشیار اور کائیاں شخص تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''کسی کا کام بھی غیر ضروری نہیں ہوتا۔ بتائیں' آپ کو کون سا ضروری کام یہاں لے آیا ہے؟''

''کام کی نوعیت خاصی سنگین ہے سائیں جی!'' میں نے سائیں کے ڈیرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

سائیں کا ڈیرا اکلوتے کمرے پر مشتمل تھا تاہم کمرے کے چاروں جانب ایک وسیع صحن تھا گویا وہ اکلوتا کمرہ ڈیرے کے وسط میں واقع تھا اور ایک خاص بات میں نے یہ نوٹ کی تھی کہ کمرے کی چاروں دیواروں میں ایک ایک چھوٹی کھڑکی موجود تھی۔ دروازہ صرف ایک ہی تھا۔ اس سیٹنگ سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ کمرے میں رہتے ہوئے کھڑکیوں کی مدد سے گرد و پیش پر گہری اور بھرپور نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔

میری بات سن کر سائیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بند آنکھوں ہی کے ساتھ بولا۔ ''تھانے دار صاحب! کام کی نوعیت سنگین ہے یا رنگین' جب تک آپ منہ سے کچھ نہیں بولیں گے' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

''مجھے ایک قاتل کی تلاش ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہاں تو سب مقتول ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ اس کی

آنکھیں بدستور بند تھیں۔ ''قاتل کا یہاں کیا کام؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے جس قاتل کی تلاش ہے وہ اسی جنگل میں داخل ہوا تھا۔ میرے پاس یہاں اس کی آمد کا واضح ثبوت موجود ہے۔''

''یہ جنگل بہت بڑا ہے۔'' سائیں نے گونج دار آواز میں کہا۔ ''پھر میرے ہی ڈیرے کا رخ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ میرا مطلوبہ قاتل جس راستے سے جنگل میں داخل ہوا تھا وہ راستہ سیدھا اس ڈیرے تک آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ قاتل کی بازیابی میں مجھ سے تعاون نہیں کریں گے تو مجبوراً مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''تم قانون کے رکھوالے!'' وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔ ''پہلے راستے پر چند قدم چل کر ہی فوراً دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہو جب کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے پہلا راستہ ہی سب سے زیادہ سیدھا اور سچا ہوتا ہے۔''

اس کا طرز تخاطب مجھے قدرے ناگوار گزرا۔ میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں تمہارا فلسفہ سننے نہیں آیا ہوں۔ تم سیدھی طرح تعاون کرتے ہو یا میں......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سائیں جی نے فوراً آنکھیں کھول دی۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی قوت موج زن تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں بمشکل اس سے نظریں ملا پا رہا تھا۔

چند لمحات کے سکوت کے بعد اس نے بھاری بھرکم آواز میں سوال کیا۔ ''اگر میں سیدھی طرح تعاون نہ کروں تو تم کیا کر لو گے؟''

''پھر مجھے مجبوراً تمہارے ڈیرے کی تفصیلی تلاشی لینا پڑے گی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''سرچ وارنٹ لائے ہو ساتھ؟'' وہ مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ ''اس کے بغیر تو خانہ تلاشی کا تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ زیادہ نہ سہی' تھوڑا بہت قانون میں بھی جانتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا پھر میرے چہرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے' تمہارا تعلق چھانگا مانگا سے نہیں ہے۔ تم کسی دوسرے علاقے سے یہاں پہنچے۔ کیوں' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

وہ نہ صرف ہوشیار اور کائیاں تھا بلکہ عیار، چالاک، معاملہ فہم اور گھاگ بھی تھا۔ کسی اللہ والے کے یہ چلن نہیں ہوتے البتہ عامل کامل پیر باوا، بولتا جادو سینا سی بابا اور نام نہاد ماہر روحانیات اسے ہی ''شارپ'' ہوتے ہیں۔ اس سے ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ سراسر ایک فراڈ یعنی ''ڈبا پیر'' تھا۔ ہمارے معاشرے میں خوش بخت جیسے خوش عقیدہ لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے جعلی پیروں فقیروں کا دھندا خوب چمکا رکھا ہے۔ انہی کی دیکھا دیکھی بعض مجبور و بے بس سادہ دل لوگ الفاظ دیگر احمق ان معاشرتی ناسوروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنی اور اپنے خاندان والوں کی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں۔

میں نے سائیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں پتوکی سے قاتل کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں..... اور قاتل کو اپنے ساتھ لے کر ہی واپس جاؤں گا۔''

''پتوکی!'' اس نے زیر لب دہرایا اور بولا۔ ''پتوکی، بلوکی، بدھوکی..... الغرض، ہر طرف سے یہاں لوگ اپنی اپنی مصیبتیں لے کر آتے ہیں۔ میں کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ قاتل ہے یا مقتول، چور ہے یا شاہد، سلطان ہے یا غلام اور خادم ہے یا مخدوم۔ میں ان کی عرضیاں سنتا ہوں۔ انہیں تعویذ دیتا ہوں اور ان کے حق میں دعا کرتا ہوں اور بس۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی تیز نگاہ میرے چہرے کا ایکسرے کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گویا ہوا۔ ''اگرچہ تمہارے پاس خانہ تلاشی کا قانونی اجازت نامہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں خود کو ایک امن پسند شہری ثابت کرتے ہوئے تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کروں گا۔ جانتے ہو کیوں؟'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بولا۔ ''اس لیے کہ میری گہری نظر مجھے بتا رہی ہے کہ تم ایک ایمان دار اور فرض شناس پولیس افسر ہو۔ تم چاہو تو اسی وقت اس فقیر کی کٹیا کی تلاشی لے سکتے ہو۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس چبوترے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا جو کمرے کے وسط میں زمین سے دو فٹ بلندی پر بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کی لمبائی چوڑائی ایک جیسی تھی یعنی وہ مربع کی شکل کا تھا۔ کم و بیش پانچ فٹ لمبا چوڑا۔ چبوترے کی بالائی سطح خاصی نرم اور آرام دہ تھی یقیناً وہاں کوئی دبیز اور گداز چیز بچھائی گئی تھی۔ آپ اس چبوترے کو ''سائیں جی'' کی ''گدی'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

سائیں جس اعتماد سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور اس نے مجھے خانہ تلاش کی ''اجازت'' مرحمت فرمائی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں وہاں سے کچھ بھی برآمد نہیں کر سکوں گا اور ہوا بھی یہی۔

آدھے گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد وہاں سے کوئی قابلِ گرفت چیز نہ مل سکی اور نہ ہی ایسا کوئی سراغ ملا جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا کہ کسی بھی قاتل نے چند روز قبل وہاں پناہ لی ہوگی۔ سائیں کا کلوٹا کمرہ کسی ہال کے سائز کا تھا۔ کمرے کے وسط میں سائیں کی نشست گاہ یعنی پانچ بائی پانچ فٹ کا وہ چبوترہ تھا۔ چبوترے کے بعد چاروں طرف چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ ہر قسم کی اوٹ پٹانگ اشیا کی بھرمار تھی۔ وہاں میں نے مختلف پنجروں میں کئی جانوروں کو مقید پایا۔ ایک پنجرے میں صحت مند کالی بلی، ایک پنجرے میں اُلّو، ایک پنجرے میں مرغ سیاہ، ایک پنجرے میں کبوتر کے بچے موجود تھے۔ ان پنجروں کے علاوہ پتیل اور تانبے کے چھوٹے بڑے کئی دیگچے بھی تھے۔ اسی قسم کا الم غلم بہت سا سامان وہاں موجود تھا۔ ظاہر ہے، ان میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لیے میں سائیں جی کو گرفت میں لیتا۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اس سے کہا۔

''سائیں جی! آپ کے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ۔''

وہ طنزیہ انداز میں میں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو میرا فرض تھا!''

میں نے کہا۔ ''سائیں جی! آپ ضرورت سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن میں آپ کو یہ بات ضرور بتاؤں گا کہ مجھے جس قاتل کی تلاش ہے وہ پستہ قامت کا ایک نامعلوم شخص ہے۔ پتوکی ریلوے اسٹیشن پر اس نے ایک معروف کاروباری آدمی مختار حسین کا قتل کیا ہے اور ایک تگڑی رقم والا بریف کیس لے کر رفو چکر ہو چکا ہے۔ وہ بریف کیس ہم نے اس جنگل کے داخلی راستے سے بازیافت کر لیا ہے۔ اس بدنصیب مقتول کا بیٹا اس وقت آپ کے سامنے کھڑا ہے۔'' میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے افتخار حسین کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق میرا مطلوبہ شخص اس طرف نہیں آیا۔ ٹھیک ہے، میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ اسی جنگل میں کہیں روپوش ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ آپ کے ڈیرے کی طرف بھی آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے آپ سے پوری امید ہے کہ آپ اس قاتل کی گرفتاری کے لیے قانون سے پورا پورا تعاون کریں گے۔''

میں یہ تمام مسکا پالش محض اس لیے کر رہا تھا تاکہ سایں میرے منصوبے تک نہ پہنچ سکے۔ میں اسے یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کی طرف سے میرے ذہن میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے وہ اب چھٹ چکے ہیں اور یہ کہ میں اسے اس معاملے میں بری الذمہ اور لاتعلق سمجھ رہا ہوں۔ یہ سب اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں اس کی کڑی نگرانی کا پروگرام بنا چکا تھا۔ مجھے یقین

تھا کہ قاتل کا سراغ سائیں کے ڈیرے ہی سے مل سکتا تھا۔ مجھے ایسا یقین کیوں تھا' میں اسے الفا
میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس یہ میرے اندر کی ایک مضبوط آواز تھی۔ مجھے لاشعوری طو
وہاں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے کچھ باور کرانے کی کوشش کر رہ
تھی۔

میری پوری بات سننے کے بعد سائیں جی نے تعاون آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''میں قانون
مدد کر کے بہت خوشی محسوس کروں گا۔ قاتل کی پہچان کے سلسلے میں آپ مجھے کوئی اشارہ دے
گے؟''

وہ بڑے نرم اور ہمدردانہ انداز میں بات کر رہا تھا لیکن میں اس کی آنکھوں میں عیاری ا
مکاری کی چمک واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ ''لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے۔'' کے مصداق' میں اس عیار شخص
کو عیاری ہی کی مار مارنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں جی! میں قاتل کے بارے میں صرف دو باتیں جانتا ہوں۔ ایک تو
کہ وہ پستہ قامت شخص ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے پاس ایک کثیر رقم موجود ہے۔''

''ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں اپنی موٹی گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسا کوئی شخص
میرے ڈیرے پر پہنچا تو سمجھیں کہ وہ یہاں سے بچ کر نہیں جائے گا۔ میرے ایک اشارے پ
میرے خدمت گار اسے قابو کر کے بے بس کر دیں گے۔ آپ صرف یہ بتائیں تھانے دار صاحب
کہ میں اسے چھانگا مانگا کی پولیس کے حوالے کروں یا سیدھا آپ کے پاس چتوکی لے آؤں؟''

وہ مجھے گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی خوش فہمی کو برقرار رکھتے کہا۔ ''میں تو اب
سیدھا چتوکی ہی جاؤں گا۔ وہاں اور بھی بہت ضروری کام پڑے ہیں۔ آپ اگر نامعلوم قاتل تک
رسائی حاصل کر لیں تو اسے سیدھے چھانگا مانگا کے تھانے پہنچا دیں۔'' پھر میں نے خوش بخت کی
جانب اشارہ کیا۔ ''یہ کانسٹیبل اسی تھانے سے تعلق رکھتا ہے اور آپ کا عقیدت مند بھی ہے۔ آپ
ہی کے عنایت کردہ تعویذ سے اس کی گھر والی کی گود ہری ہوئی تھی۔''

''اچھا اچھا۔'' سائیں نے تیز نظر سے خوش بخت کو گھورا اور دبے دبے لہجے میں بولا۔
''جبھی یہ مجھے کچھ دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔ دراصل یہاں اتنے سائل آتے ہیں نا کہ سب کے
چہرے اور نام یاد رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔''

میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بالکل بجا فرماتے ہیں حضرت۔ آپ
کسی اور ہی دنیا کے ہیں' بہت پہنچے ہوئے اور کرنی والے۔ نام اور چہرے یاد رکھنا تو دنیا داری کی

باتیں ہیں لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''وہ کیا تھانے دار صاحب؟'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''کہیں آپ مجھے اور میرے کام ہی کو نہ بھول جایئے گا سائیں جی۔'' ایک
لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں چتوکی کے تھانے کا
انچارج ہوں۔ میں ایک بے رحم اور سفاک قاتل کی تلاش میں یہاں تک پہنچا ہوں۔''

''لیں جی ملک صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''آپ کو اور
آپ کے کام کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

''آپ نے کہا اور میں بے فکر ہو گیا۔'' میں نے جواباً بے تکلفی کا مظاہرہ کیا پھر کانسٹیبل خوش
بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بندہ یہیں کا ہے۔ میں اس کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ یہ
روزانہ آپ کی خدمت میں حاضری دیتا رہے گا۔ اگر کوئی خاص بات آپ کے علم میں آئے تو
آپ اسے بتا سکتے ہیں۔''

''ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ خوش بخت کو کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب مجھے رخصت کی اجازت دیں۔'' میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے
کہا۔

وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''آپ اس وقت ڈیوٹی پر ہیں اس لیے میں آپ کو
روکنے کی کوشش نہیں کروں گا ورنہ دل تو چاہتا ہے کہ آپ ایک طویل عرصے تک یہاں رکیں اور
ہمیں خدمت کا موقع دیں۔''

''کیوں گناہ گار کرتے ہیں سرکار۔'' میں نے اپنے لہجے میں عقیدت کی شیرینی بھرتے
ہوئے کہا۔ ''ویسے میں اس کیس سے نمٹ لوں' پھر ایک دو روز کے لیے ضرور آپ کے آستانے پر
حاضری کروں گا۔''

''ضرور' ضرور'' اس نے اپنی تنومند گردن کو بڑی سرعت سے دو تین مرتبہ حرکت دیتے
ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم سائیں جی کے ڈیرے سے نکل کر واپس تھانہ چھانگا مانگا کی جانب سفر کر
رہے تھے۔ جب ہم تھانے پہنچے تو تھانہ ان چارج صدیق گوندل کی بے قراری دیدنی تھی۔

اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ ''کیا رہا ملک صاحب؟''

میں نے اس مختصر سے سوال کے جواب میں اسے پوری روداد سنا دی اور آخر میں اپنے

خدشات کا اظہار بھی کر دیا۔ میری کتھا سننے کے بعد صدیق گوندل نے پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''کس قسم کا تعاون ملک صاحب؟''

''مجھے آپ کے تھانے کی کچھ نفری درکار ہے۔''

''یہ سب سرکار کے ملازم ہیں۔'' صدیق گوندل نے کہا۔ ''تھانہ آپ کا ہو یا میرا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ میرے تھانے کی حدود میں کوئی کارروائی ڈالنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ آپ حکم تو کریں۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں کل صبح ہی ایس پی علاقہ سے بھی بات کر لوں گا تاکہ ہمیں ہر قسم کی آسانی حاصل رہے۔''

''ویسے آپ نے سوچا کیا ہے؟'' صدیق گوندل نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میں سائیں جی کی مسلسل نگرانی کروانا چاہتا ہوں خصوصاً رات کے وقت۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ قاتل کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے۔''

''اگر آپ کو یقین ہے تو پھر ضرور ایسا ہی ہوگا۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں نے آپ کی چھٹی حس کے بہت سے کارنامے سنے ہیں۔''

''بس اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''سائیں کے رویے نے مجھے اس کی ذات کے حوالے سے گہرے شک میں ڈال دیا ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ قاتل اس جنگل میں داخل ہوا تھا اور وہ راستہ سیدھا سائیں کے ڈیرے تک جاتا ہے۔''

''چلیں، جو بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔'' تھانہ انچارج صدیق گوندل نے کہا۔ ''آپ مجھ سے جو کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو میں واپس چتوکی جا رہا ہوں۔ کل پھر آؤں گا۔ جب تک آپ اپنے عملے میں سے کم از کم آٹھ نہایت ہوشیار اور لڑائی بھڑائی کے ماہر افراد کا انتخاب کر لیں۔ میں کل ہی اپنے منصوبے کی تفصیلات بتاؤں گا۔''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''آٹھ تو نہیں لیکن چار افراد کا بندوبست ہو جائے گا یعنی آپ کی ضرورت اور طلب کے عین مطابق..... چالاک اور ہوشیار، لڑائی بھڑائی کے ماہر۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''باقی چار کا میں انتظام کر لوں گا۔''

تمام معاملات طے کرنے کے بعد ہم چھانگا مانگا سے واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب ہم چتوکی پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

دوسرے روز میں اپنے علاقے کے ایس پی صاب سے جا کر ملا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد انہوں نے میرے موقف کی تائید کی اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ میں مطمئن ہو کر چھانگا مانگا روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ اے ایس آئی کے علاوہ چار انتہائی چاق و چوبند کانسٹیبل تھے جو ہر طرح سے میرے آزمائے ہوئے تھے۔ اس بار ہم سب سادہ لباس میں تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔

چھانگا مانگا کے تھانہ انچارج صدیق گوندل نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔ ''گوندل صاحب! رات میں آپ کے بندے سائیں کے ڈیرے کی خفیہ نگرانی کریں گے اور دن میں میرے یہ جوان۔'' پھر میں نے اسے نگرانی کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔''

''اور کوئی خاص بات اگر سامنے آئے گی تو فوراً مجھے اطلاع دی جائیگی۔'' میں نے کہا۔ ''میرے آدمیوں کے ہاتھ پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے روانہ شام کو واپس چتوکی چلے جائیں گے۔''

صدیق گوندل نے میرے منصوبے کی تائید کی۔ میں نے کہا۔ ''ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''وہ یہ کہ کانسٹیبل خوش بخت کو روزانہ سائیں جی کے ڈیرے کا ایک چکر لگانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔''

''ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔'' صدیق گوندل نے کہا۔

اس کے بعد ہم کافی دیر تک اسی منصوبے پر باہمی تبادلہ خیال کرتے رہے پھر میں ہر طرف سے مطمئن ہو کر چتوکی واپس لوٹ آیا۔

نگرانی کے چوتھے روز مجھے ایک غیر معمولی اطلاع ملی۔ سائیں جی کو آدھی رات کے ایک درخت کے نیچے ایک عجیب وغریب عمل کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اطلاع دینے کانسٹیبل نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ لگ بھگ نصف شب سائیں اپنے ڈیرے کے اکلو کمرے سے نکل کر ایک جانب چل پڑا۔ اس وقت اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ اس ترین سرد رات میں وہ ایک گھنے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ سائیں ڈیرے سے اپنے ایک بڑے سائز کا تانبے کا دیگچہ بھی لایا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹا موٹا سامان بھی اس کے تھا۔ اس کے کندھے پر ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔

سائیں نے مذکورہ دیگچہ ایک جانب رکھ دیا اور تھیلے میں سے ایک تصویر نکال کر کیل کی سے درخت کے تنے پر پیوست کر دی پھر اس نے وہاں پہلے سے رکھی ہوئی اینٹوں کی مد ایک چولہا ترتیب دیا اور تانبے کا دیگچہ چولہے پر چڑھا دیا۔ نگرانی کرنے والے کانسٹیبل نے وا طور پر دیکھا کہ مذکورہ دیگچے کا ڈھکن سیل بند کیا گیا تھا جیسا کہ عموماً گندھا ہوا آٹا لگا کر بند کیا ہے۔ نگرانی پر مامور کانسٹیبل بڑی احتیاط سے وہ کارروائی دیکھنے لگا۔ اتنے دنوں میں رات وقت سائیں پہلی مرتبہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ مذکورہ کانسٹیبل سائیں سے زیادہ فاصلے نہیں تھا تاہم اس نے خود کو گھنے درختوں میں اس طرح چھپا رکھا تھا کہ سائیں کو وہاں اس موجودی کی خبر نہیں تھی۔ ویسے بھی سائیں کی اس جانب پیٹھ تھی۔

سائیں نے اس کے بعد اپنے تھیلے میں سے چار چراغ برآمد کیے اور انہیں روشن کر دیگچے کے نیچے یعنی چولہے کے اندر رکھ دیا اور خود دیگچے کے نزدیک ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ اس کا رخ اس درخت کی طرف تھا جس پر تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر والے درخت اور سائیں درمیان چولہے پر دیگچہ چڑھا ہوا تھا۔ سائیں ٹھنڈی ٹھار رات میں ننگ دھڑنگ اس طرح بیٹھا تھا جیسے بڑے خوش گوار موسم کا لطف اٹھا رہا ہو۔

کانسٹیبل سائیں کے عقب میں تھا اس لیے وہ سائیں کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا تاہم زبان میں بہ آواز بلند سائیں جو کچھ پڑھ رہا تھا وہ کانسٹیبل کی سماعت تک بخوبی پہنچ رہا کانسٹیبل دم سادھے بیٹھا رہا اور پوری توجہ سے اُس کارروائی کا نظارہ کرتا رہا۔

دس منٹ کے بعد تانبے کے دیگچے میں ہلچل کے آثار پیدا ہوئے کانسٹیبل نے محسوس جیسے دیگچے کے اندر کوئی زندہ چیز موجود ہو جس کی اچھل کود سے دیگچے میں واضح حرکت پیدا ہو رہی

تھی۔

چند لمحے بعد دیگچے کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ کانسٹیبل نے واضح طور پر سنا' وہ کسی بلی کی پر درد آواز تھی۔ وہ اذیت آمیز آواز ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے تانبے کا دیگچہ گرم ہو رہا تھا' بلی کی چیخ و پکار میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سائیں اس ''داد و فریاد'' سے بے نیاز درخت پر لگی تصویر پر دھیان جمائے ناقابلِ فہم الفاظ میں کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ یقینی طور پر وہ کوئی سفلی عمل کر رہا تھا۔ بلی کی پرسوز فریاد میں ہیجانی کیفیت پائی جاتی تھی۔

پھر اچانک دیگچے میں مقید بد نصیب بلی نے ایک بھیانک چیخ ماری اور بند دیگچے میں بھونچال سا آ گیا۔ اسی وقت سائیں نے پڑھائی کا سلسلہ موقوف کر دیا اور دیگچے کو چولہے سے نیچے اتار لیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے تھیلے کے اندر سے ایک کپڑا نکال کر استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد کانسٹیبل نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ سائیں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد دیگچے کا ڈھکن کھول دیا' دیگچے میں بند بدبخت بلی کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر دیگچے سے نکلی اور غراتی چلاتی ہوئی نزدیکی درختوں کی جانب بھاگ نکلی۔

کانسٹیبل نے بغور دیکھا۔ وہ ایک ستم رسیدہ کالی بلی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھنے درختوں میں غائب ہو گئی۔ کانسٹیبل نے اپنی توجہ پوری طرح سائیں پر مرکوز کر دی۔

سائیں کے اطمینان میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے دیگچے کو دوبارہ ڈھکن لگا کر بند کر دیا۔ درخت پر ٹنگی تصویر کو اتار کر اپنے تھیلے میں رکھا۔ دیگر ساز و سامان سمیٹا اور خراماں خراماں اپنے ڈیرے کی جانب چل دیا۔

کانسٹیبل کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کے لیے حیرت انگیز تو تھا ہی' علاوہ ازیں اس منظر نے اس کے جذبہ تجسّس کو بے پناہ ہوا دے دی تھی وہ اسی جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر سائیں کے ڈیرے تک چلا آیا تاہم اس نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ سائیں کو اپنے تعاقب کا احساس نہ ہو۔

سائیں ڈیرے کے اکلوتے ہال نما کمرے میں داخل ہوا تو کانسٹیبل ایک کھڑکی کی درز سے آنکھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے اندر مدھم روشنی کا اک چراغ جل رہا تھا تاہم سائیں کے چیلوں میں سے کوئی بھی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ کانسٹیبل کی حیرت میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ جب اس نے سائیں کو چبوترے کے اندر غائب ہوتے دیکھا۔

جی ہاں' کمرے کے وسط میں جو پانچ بائی پانچ فٹ کا مربع چبوترہ بنا ہوا تھا' سائیں اس کے اندر غائب ہوگیا تھا۔ کانسٹیبل کے مطابق سائیں نے اپنی گدی والے حصے کو تھوڑی سی کوشش کے بعد اس طرح اوپر اٹھایا تھا جیسے صندوق کا ڈھکنا کھولا جاتا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے چبوترے کے اندر اس طرح داخل ہوگیا جس طرح کسی تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر داخل ہوا جاتا ہے۔ بلی کے عمل والا دیگچہ بھی وہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ کانسٹیبل کھڑکی سے آنکھ جمائے پیش آمدہ واقعات کا انتظار کرنے لگا۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد سائیں چبوترے کے زیریں شگاف سے برآمد ہوا۔ اس وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔ دیگچہ اور کپڑے کا تھیلا وہ اندر ہی کہیں چھوڑ آیا تھا۔ وہ بڑے سکون سے باہر آیا۔ چبوترے کا ڈھکن نما بالائی حصہ بند کیا اور اپنی گدی پر ہاتھ پاؤں سمیٹ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے اطمینان سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی بڑی مہم بہ احسن طریق سر کر لی ہو۔ جب کمرے میں سائیں کے خراٹے گونجنے لگے تو کانسٹیبل خاموشی سے وہاں سے سرک لیا۔

سائیں نے جنگل کے اندر جو بھی سفلی عمل کیا تھا' میرے لیے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے مکروہ اعمال تسخیر محبوب کے لیے عامل کامل عموماً کرتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں عامل کامل سے میری مراد ناہرین سفلیات ہے جو صرف اور صرف اپنا مالی فائدہ دیکھتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ کس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ سفلی عمل کے دوران میں کراہت' گندگی اور غیر فطری عوامل جس قدر زیادہ کارفرما ہوتے ہیں' عمل کی تاثیر اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

کانسٹیبل کی زبانی تانبے کے دیگچے اور کالی بلی کا تذکرہ سن کر مجھے ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں' میں نے ''طلسمات سکندری'' نامی ایک کتاب میں محبوب کو تسخیر کرنے کا ایک ایسا ہی عمل پڑھا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے غلط اور صحیح کی تفریق کا شعور عطا کیا ہے۔ مطالعہ میرا شوق رہا ہے اور میں نے اس شوق کی تکمیل کے لیے دنیا کے ہر موضوع پر سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں اور اب بھی پڑھتا رہتا ہوں لیکن خدا کے فضل و کرم سے میرے ذہن نے ہمیشہ سیدھے اور سچے راستے کا انتخاب کیا ہے ورنہ مکروہات زمانہ میں بے پناہ کشش موجود ہے' انسان کو بھٹکتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

کانسٹیبل کی پوری بات سننے کے بعد میری سوچ صرف ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی تھی اور وہ

نقطہ تھا سائیں کا چبوترہ!

مجھے امید تھی کہ اس چبوترے کے اندر بہت کچھ حیرت انگیز دیکھنے کو ملے گا۔ ڈبا پیروں کے ایسے خفیہ خانے بہت انکشاف انگیز ہوتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی سائیں جیسے پیر فرتوت ''پہنچے ہوئے'' لوگوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور ہر مرتبہ ایک نئی اور عبرت اثر کہانی سامنے آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سائیں کی گدی کے نیچے جو دنیا آباد تھی وہ بھی بہت انکشاف انگیز ثابت ہوگی اور عین ممکن ہے' وہیں سے پستہ قامت نامعلوم قاتل کا بھی کوئی سراغ مل جائے۔

دوسرے روز میں نے اے ایس آئی فلک شیر کو ساتھ لیا اور چوکی سے چھانگا مانگا پہنچ گیا۔ ہم کیل کانٹے سے پوری طرح لیس تھے۔ چھانگا مانگا تھانے کا انچارج صدیق گوندل بھی ہر تعاون کے لیے تیار تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہولیا۔ مزید احتیاط کے طور پر صدیق نے اپنے تھانے سے چند ہوشیار قسم کے کانسٹیبل بھی ساتھ لے لیے۔ ہمیں سائیں کے ڈیرے پر زیادہ سے زیادہ پانچ افراد سے نمٹنا تھا یعنی سائیں اور اس کے چار چیلے چانٹے۔ ان پانچ افراد پر قابو پانے کے لیے ہماری تیاری مکمل اور بھرپور تھی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم سائیں کے ڈیرے پر تھے۔ اس وقت وہاں صرف دو چیلے موجود تھے البتہ تین چار سائل ہمیں نظر آئے۔ وہ اپنے چہروں ہی سے عقل سے پیدل اور توہم پرست دکھائی دیتے تھے۔

سائیں نے خوش دلی (بظاہر) سے ہمارا استقبال کیا اور ہماری آمد کی غرض و غایت دریافت کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں جی! ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ پہلے آرام سے اپنے مریدوں کو نمٹالیں پھر تسلی سے بات ہوگی۔''

میں نے لفظ ''تسلی'' کی ادائی خاصے معنی خیز انداز میں کی تھی۔ سائیں ایک کائیاں شخص تھا' فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے' آپ ادھر تشریف رکھیں۔'' اس نے ایک جانب بچھی چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم سب نے سائیں کے ارشاد کے مطابق کمرے کے ایک کونے میں تشریف رکھی اور گہری نظروں سے چبوترے پر براجمان سائیں کا جائزہ لینے لگے۔ اس نے صورتِ حال کی نزاکت کے باعث اپنے عقیدت مندوں کو چٹ پٹ فارغ کر دیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں خاصا اضطراب پایا جاتا تھا۔ جب اس کے پاس آنے والے سائل ڈیرے سے رخصت ہو گئے تو وہ

ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔

''ہاں تو جناب ملک صاحب!'' اس نے پہلے مجھے مخاطب کیا۔ ''قاتل کا کوئی سراغ ملا آپ کو؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک سراغ ملا تو ہے۔''

''وہ کیا؟'' سائیں کے لہجے میں بے تابی تھی۔

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ ''سائیں جی! قاتل ایک تہ خانے میں جا چھپا ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔''

''تہ خانہ؟'' سائیں نے بے اختیار دہرایا اور چبوترے پر بڑی سرعت سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کس تہہ خانے کا ذکر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''سائیں جی! آپ تو بہت کرنی والے ہیں۔ بھلا آپ سے کوئی بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ کون سا تہ خانہ آپ کی دور بین نگاہ سے پوشیدہ ہے!''

وہ میرے لہجے کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! پتہ نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کا مطلوبہ قاتل کون سے تہ خانے میں چھپا بیٹھا' مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے!''

میں نے کہا۔ ''میں اس تہ خانے کا ذکر کر رہا ہوں جہاں تانبے کا ایک بہت بڑا دیگچہ بھی پایا جاتا ہے!''

میرے لہجے میں اتنی سنسنی تھی کہ وہ ایک مرتبہ پھر پہلو بدل کر رہ گیا تاہم میرے بجائے صدیق گوندل کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''گوندل صاحب! آپ ہی مجھے کچھ سمجھائیں' ملک صاحب کس قسم کی لایعنی باتیں کر رہے ہیں۔''

صدیق گوندل نے کہا۔ ''آج کا دن ملک صاحب کا ہے۔ میں تو بس ان کی مدد کے لیے ساتھ آیا ہوں۔''

سائیں الجھی ہوئی نظر سے دوبارہ میری جانب تکنے لگا۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''سائیں جی! آپ کے دو خدمت گار تو باہر موجود ہیں لیکن نظاموں اور کرمو کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔ کیا آپ نے انہیں کہیں بھیجا ہے؟''

''وہ ذرا کوٹ مہتاب خان تک گئے ہیں۔'' سائیں نے جواب دیا۔

''کیا گامو اور کریمو بھی کہیں گئے ہوئے تھے؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور سوال کیا۔ ''آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ پرسوں رات آپ ڈیرے پر اکیلے ہی تھے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے چاروں خدمت گاروں میں سے ایک بھی اس رات یہاں موجود نہیں تھا!''

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا پرسوں رات آپ یہاں آئے تھے؟''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''سوال نہیں کرو سائیں' صرف جواب دو۔''

وہ میرے طرزِ تخاطب پر چیں بہ جبیں ہوا تاہم متحمل لہجے میں بولا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔ پرسوں رات میں ڈیرے پر اکیلا ہی تھا۔ گامو اور کریمو گاؤں والا سے کل شام کو واپس آئے ہیں۔''

سائیں کے چیلوں کی آمد و شد کے بارے میں مجھے معلوم تھا تاہم یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ جنگل سے نکل کر کس طرف روانہ ہوئے تھے اور ان کی واپسی کہاں سے ہوئی تھی۔ میں اگر بہ نفسِ نفیس وہاں موجود ہوتا تو صورت حال کچھ اور ہوتی۔

میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ''سائیں! پرسوں رات جب تم ڈیرے پر اکیلے تھے تو تمہاری مصروفیات کیا رہیں؟''

وہ چند لمحے خاموش نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی تذبذب کا شکار تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ سچ بولے یا دروغ گوئی کا سہارا لے۔ خیر اتنا تو اسے احساس ہو ہی گیا تھا کہ میں خاصے مضبوط قدموں سے اس کی جانب پیش قدمی کر رہا ہوں۔ اپنی فطرت کے مطابق اس نے جھوٹ کا سہارا لیا اور بولا۔

''رات میں انسان کی مصروفیات کیا ہو سکتی ہیں بھلا۔ میں پوری رات چین کی نیند سوتا رہا۔''

میں نے غصیلی نظر سے اسے گھورا۔ ''سائیں! تم جھوٹ بول کر اپنی مصیبتوں میں گراں قدر اضافہ کر رہے ہو۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے!'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم پرسوں رات چین کی نیند سو رہے تھے تو پھر آدھی رات کے وقت جنگل میں تماشا' کون کر رہا تھا؟''

میرے الفاظ میں اتنی قطعیت تھی کہ وہ اچھل پڑا اور گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تماشا...... یہ کیا ہوتا ہے؟"

صدیق گوندل نے کہا۔ "سائیں! تم نے ملک صاحب کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے کہا تھا کہ تم غلط بیانی کر کے اپنی مصیبتوں میں اضافہ کر رہے ہو۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بات کو آگے بڑھایا "سائیں! اب میری بھی ایک بات توجہ سے سنو۔ تم جو یہ ان جان پن کا مظاہرہ کر رہے ہو اس سے سراسر تمہاری مشکلات کے دروازے کھل رہے ہیں۔ اب تمہارے لیے سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کیوں کہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔"

"جس طرح پرسوں رات تانبے کے دیگچے سے باہر آئی تھی!" میں نے صدیق گوندل کے آخری محاورانہ جملے پر گرہ لگائی۔

سائیں پھٹی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اے ایس آئی کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دو کانسٹیبلو کے ساتھ ہال نما کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں سائیں کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے خالص تھانے دارانہ لہجے میں بولا۔

"تم پرسوں رات جنگل میں کیا کر رہے تھے؟"

"جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہے سائیں!" صدیق گوندل نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے سرزنش آمیز انداز میں کہا۔

سائیں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں ایک مخصوص عمل کر رہا تھا۔"

"سفلی عمل؟" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

وہ بولا۔ "آپ اسے سفلی سمجھیں یا علوی، میرے لیے بس ایک عمل ہی تھا۔"

"اس بدنصیب بلی کا کیا قصور تھا جسے تم دیگچے میں بند کر کے اذیت ناک مراحل سے گزارتے رہے؟" میرے لہجے میں غصے کے ساتھ نفرت بھی شامل ہو گئی تھی۔ "ایک جاندار پر ایسا ظلم کر کے تمہیں ذرا بھی ندامت محسوس نہیں ہوئی بے ضمیر شخص!"

"اس میں ندامت یا شرمندگی کی کون سی بات ہے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "کسی بھی قسم کے علاج یا عمل میں مختلف جانداروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بلی تو پھر بھی ایک حقیر سا جانور ہے۔ کیا نباتات اور جڑی بوٹیاں زندہ اشیا نہیں ہیں۔ انہیں بے دریغ ادویات کی تیاری میں کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کم بخت انسان! اگر تم بلی کو پکا کر کھا جاتے یا اس کو مار ڈالتے تو یہ تمہارا ایک عمل ضرور ہوتا مگر بلی بے چاری کو لمحہ بہ لمحہ دردناک عذاب سے نہ گزرنا پڑتا۔ میں تو تمہارے اس ظلم کی بات کر رہا ہوں جو تم نے ایک جانور کو تپتے ہوئے تانبے کے دیگچے میں بند رکھ کر کیا۔"

"یہ سب کچھ اس عمل کا تقاضا تھا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"تا کہ تم کا جل پاڑ سکو؟" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ تھانے دار ہیں یا کوئی......؟"

میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "سائیں! میں عام قسم کے تھانے داروں سے بہت مختلف ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ میں سامنے والے کو دیکھتے ہوئے اپنا انداز اپناتا ہوں۔ جس قسم کا منہ ہو ویسا ہی تھپڑ مارتا ہوں۔ اس وقت میں لوٹ پلٹ اور کاٹ چھانٹ کا ماہر تھانے دار ہوں۔ تم جیسے ڈبا پیر کی سرکوبی کے لیے میرے پاس ایک سو ایک ہنر موجود ہیں۔ زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ قدرے سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ اس کے علاوہ اس عمل کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"پورا یقین کرنا چاہتے ہو!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو سنو، تم بھی کیا یاد کرو گے، کس تھانے دار سے پالا پڑا تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "تم نے جس کالی بلی کو پرسوں رات تانبے کے دیگچے میں بند کر کے تے کرنے پر مجبور کیا تھا وہ بلی گزشتہ چند روز سے تمہارے لیے تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔ چولہے پر چڑھانے سے قبل تم نے اسے مکمل تاریکی میں رکھا ہوا تھا جہاں خوراک کے طور پر تم اسے خالص دیسی گھی کھلا رہے تھے۔ دیگچے کو گرم کرنے کے لیے بھی تم نے دیسی گھی ہی کے چار چراغ چولہے میں جلائے تھے۔ اب مظلوم بلی کی تے سے تم کاجل پاڑو گے۔ وہ کاجل اکیس دن تک وہ شخص استعمال کرے گا جس کے لیے تم نے عمل کیا ہے پھر جیسے ہی مذکورہ شخص کی نظر اس کے سنگ دل محبوب سے ملے گی اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ ضدی، سرکش اور سنگ دل محبوب تسخیر ہو جائے گا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

سائیں حیرت کے بھنور میں گھمن گھیریاں کھا رہا تھا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسی لمحے اے ایس آئی فلک شیر گامو اور کریمو کو دھکیلتے ہوئے کمرے میں

داخل ہوا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا کانسٹیبلو کے ہاتھ میں تھا۔ سائیں کی حیرت دوچند ہوگئی۔ وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔

ملک صاحب! میرے بندوں کو آپ نے کیوں گرفتار کیا ہے۔ آخر ان کا قصور کیا ہے؟"

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "سائیں! پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں ڈشکرے تمہارے نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کا بھی قصور کچھ کم نہیں ہے کہ یہ تمہارے جیسے شقی القلب شخص کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں اور تیسری بات یہ کہ ابھی تھوڑی دیر بعد تمہاری کلائیوں میں بھی آہنی زیور پہنایا جانے والا ہے۔"

"وہ کیوں جناب؟" اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کو پشت کے پیچھے چھپالیا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ "سائیں! پرسوں رات وہ بلی والا عمل، کس شخص کے لیے کر رہے تھے؟"

اسے موقع کی نزاکت کا احساس ہوگیا تھا۔ معتدل لہجے میں بولا۔ "اس کا نام خوشیا ہے...... خوشی محمد عرف خوشیا۔"

"اس کا جغرافیہ بتاؤ؟"

"میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "بس اتنا پتہ ہے، وہ چتو کی کا رہنے والا ہے۔"

چتو کی کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "اب تم نے ذرا بھی جھوٹ بولا سائیں تو سمجھ لو تمہاری خیر نہیں ہے۔"

"میں واقعی اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس کا نام خوشیا اور وہ چتو کی کا رہنے والا ہے۔" سائیں نے بتایا۔ "وہ چتو کی ہی کی ایک لڑکی کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا ہے اسی غرض سے وہ میرے پاس آیا تھا اور میں نے اس کے لیے یہ عمل کیا ہے۔"

"لڑکی کا نام کیا ہے؟"

"غزالہ۔"

"غزالہ کے بارے میں مزید کیا جانتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

"خوشیا کا حلیہ بیان کرو؟ میں نے ایک اہم بات دریافت کی۔

وہ کسی ریکارڈ کی طرح بولنے لگا۔ "نام خوشی محمد عرف خوشیا۔ عمر لگ بھگ اٹھائیس سال۔

ن موٹی۔ دائیں گال پر مسا۔ تنگ پیشانی۔ کان چھوٹے۔ بال گھونگریالے۔ بائیں ہاتھ کی چھ لیاں یعنی ڈبل چھنگلی۔ مونچھیں راج کپور مار کا اور...... اور قد پانچ فٹ کے قریب۔"

صدیق گوندل نے حیرت سے پوچھا۔ "سائیں تم کوئی ایکسرے مشین لگتے ہو۔ بڑی گہری ہے بھئی تمہاری، آخر کھاتے کیا ہو تم؟"

میرا ذہن سائیں کے آخری جملے پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس نے خوشیا کا قد پانچ فٹ کے ب بتایا تھا۔ اٹھائیس سالہ کسی شخص کا قد اگر پانچ فٹ ہو تو اسے پستہ قامت ہی کہا جائے گا۔ مطلب یہ قاتل بھی پستہ قامت ہی تھا اور مقتول کا نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس، تہی داماں اور شکل وصورت کے ساتھ اسی راستے سے ملا تھا جو سائیں کے آستانے تک آتا تھا۔ اس بات کا کان موجود تھا کہ خوشیا ہی وہ شخص ہو جس کی تلاش مجھے رانا مختار حسین کے قاتل کی حیثیت سے ی۔ میں نے بریف کیس کی رقم کو ذہن میں رکھتے ہوئے سائیں سے سوال کیا۔

"سائیں! مجھے معلوم ہے، کالی بلی والا عمل تم نے فی سبیل اللہ نہیں کیا ہوگا؟"

وہ بولا ظاہر ہے جناب! اس قسم کے اعمال میں عامل کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ان کو داؤ پر لگانے کے لیے سائل سے رقم تو وصول کی ہی جاتی ہے۔"

"نے خوشیا سے اس سلسلے میں کتنی رقم اینٹھی تھی؟"

لفظ "اینٹھی" پر سائیں نے برا سا منہ بنایا لیکن سیدھے لہجے میں جواب دیا۔ "صرف پانچ روپے۔"

"پانچ سو روپے!" میں نے اسے گھورا۔ "یہ اچھی خاصی رقم ہے اور تم اس کے لیے رف" کا لفظ استعمال کر رہے ہو؟"

قارئین! یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت پانچ سو روپے کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ آپ کل کے حساب سے پچیس ہزار روپے سمجھ لیں ویسے ان نام نہاد عاملوں کا آج کل بھی تیرہ ہے۔ موجودہ دور کے عاملین سفلیات چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بھی پندرہ بیس ہزا پے سے کم نہیں لیتے اور ان میں سے اکثریت ٹھگوں پر مشتمل ہے جو مجبور، بے بس اور پریشان لوگوں کو کند چھری سے کاٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

میرے سوال کے جواب میں سائیں نے کہا۔ "جناب! میں نے تو اسے سارا عمل سمجھا کر کہا وہ خود ہی سب کچھ کر لے لیکن پوری تفصیل سننے کے بعد اس نے کہا تھا کہ یہ کام اس کے ہیں ہے لہٰذا میں ہی اس کے لیے یہ عمل کروں چنانچہ میں نے اس کا کام کرنے کا وعدہ کر

لیا۔"

"اور خوشیا نے تمہارا مطالبہ پورا کر دیا!" میں نے کہا۔ "تمہیں پانچ سو روپے دیئے کر اس نے ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ٹٹولتی ہوئی نظر سے سائیں کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا

"خدا کی قسم! میں نہیں جانتا' خوشیا نے ان پانچ سو روپوں کے لیے کیا کیا ہوگا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔"

"میں بھی اپنے کام سے کام رکھنا ہی پسند کرتا ہوں سائیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں گھورا اور پوچھا۔ "اب خوشیا تمہارے پاس کب آئے گا؟"

"تقریباً ایک ہفتے بعد۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "وہ تانبے کا دیگچہ کہاں ہے جس میں مظلوم کالی بلی نے تے کی تھی؟"

"اسے میں نے تین روز کے لیے زمین میں دبا دلیا ہے۔"

"اور وہ تصویر؟"

"کون سی تصویر؟" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے کہا۔ "گدھے کے بچے! میں اس تصویر کا ذکر کر رہا ہوں جسے کیل کے ذریعے تم نے درخت پر پیوست کر کے تانبے کے دیگچے کو آگ دکھائی تھی...... خوشیا کی مطلوبہ لڑکی غزالہ کی تصویر...... وہ غزالہ جس کے بارے میں تم اس کے نام کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ کچھ یاد آیا کہ میں دوسرا راستہ اختیار کروں؟"

"تص...... تصویر تو میں نے عمل کے بعد جلا دی تھی۔" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ سائیں کے چہرے کے تاثرات اس کے الفاظ سے لگا نہیں کھاتے تھے۔

میں نے اچانک اسے ایک زور دار چانٹا رسید کیا۔ یہ اس کی بے خبری تھی یا شاید میرے چانٹے میں غیر معمولی قوت تھی کہ وہ اپنی گدی سے لڑھک کر دور چٹائی پر جا گرا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ایک تحقیر آمیز ٹھڈے سے نوازتے ہوئے گرج کر کہا۔

"تخم نا تصدیق! غزالہ کی تصویر کو تم نے جلا دیا ہے اور دیگچے کو زمین میں دبا رکھا ہے' کیوں یہی بیان ہے نا تمہارا؟" ایک لمحے کو رک کر میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "حقیقت اگلنے ابھی ننگا کروں تمہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ "ملک صاحب! میں کسی قاتل کو نہیں جانتا اور نہ ہی قتل کی کسی واردات میں میرا ہاتھ ہے۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔"

"میں نے کہا ہے کہ تم قاتل کے ماما چاچے ہو یا یہ کہ رانا مختار کو تم نے قتل کیا ہے۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو صرف غزالہ کی تصویر اور تانبے کے دیگچے کے بارے میں پوچھا تھا تم سے؟"

"وہ......وہ...... میں نے بتایا ہے نا......" وہ رک رک کر بتانے لگا۔

میں نے ایک زور دار جھٹکا دے کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس نے دو قلابازیاں کھائیں اور چاروں خانے چت ہو گیا۔ میں نے اس کی گدی والے چبوترے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے کیا بتاؤ گے شیطان کی اولاد۔ دیکھو' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہاری گدی کے نیچے کیا کیا راز پنہاں ہیں۔"

وہ بے اختیار زمین سے اٹھا اور غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر میرے قدموں سے لپٹ گیا اور منت آمیز لہجے میں گھگیایا۔ "نہیں ملک صاحب! وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ خدا کے لیے رک جائیں۔"

میں نے اس کی التجا کو ٹھوکروں میں اڑاتے ہوئے تھوڑی سی کوشش کے بعد گدی کا بالائی حصہ اوپر اٹھا دیا۔ اسی دوران میں صدیق گوندل نے میرے اشارے پر سائیں کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس کارروائی پر پہلے تو وہ ہمیں بڑی بڑی دھمکیاں دینے لگا پھر جب دو چار کرارے پڑے تو ساری چوکڑی بھول گیا۔

سائیں کی گدی کا بالائی حصہ واقعی کسی بڑے صندوق کے ڈھکنے کی طرح ہی کھلتا تھا۔ نیچے تہ خانے میں جانے کے لیے باقاعدہ زینے بنے ہوئے تھے۔ تہ خانہ لگ بھگ ہال نما کمرے جتنا تھا۔ ہم نے اس تہ خانے کی مکمل تلاشی لی۔ سائیں اور اس کے دونوں خدمت گار ہماری تحویل میں آ چکے تھے اس لیے ہمیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

تہ خانے میں سے جو کچھ برآمد ہوا وہ سائیں کو پکا مجرم ثابت کرتا تھا۔ زیادہ تر سامان مال مسروقہ تھا۔ کچھ چیزیں صدیق گوندل نے فوراً پہچان لیں اگرچہ اسے چھانگا مانگا کے تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا تاہم اس دوران میں ڈکیتی کی تین چار وارداتیں اس کے تھانے کی حدود میں ہو چکی تھیں۔ تمام تر مال مسروقہ کے ساتھ "سائیں اینڈ کمپنی" کو چھانگا مانگا

تھانے میں پہنچادیا تھا۔ نظامو اور کرمو کی گرفتاری کے لیے چند ہوشیار قسم کے پولیس اہلکار جنگل ہی میں ڈیرے کے آس پاس ڈیوٹی لگا دی گئی۔

سائیں نے تھوڑی سی ”خاطر تواضع“ کے بعد زبان کھول دی۔

اس کا اصل نام عبدالغفور تھا۔ دس سال قبل وہ چھانگا مانگا کے جنگل میں آ کر بیٹھا تو دیکھتے دیکھتے اس نے آس پاس کے علاقوں میں اپنی خاصی ساکھ بنالی تھی۔ درحقیقت وہ مفرور قیدی تھا۔ اسے قتل کے ایک مقدمے میں سزائے عمر قید ہو گئی تھی تاہم دس سال پہلے شیخوپورہ کی جیل سے فرار ہو گیا تھا۔

چھانا مانگا کے جنگل میں ڈیرا جمانے کے بعد سائیں نے اپنا ایک گروہ بنالیا۔ کرمو، نظامو، کریمو اور گاموں اس کے دست و بازو تھے۔ وہ چورا چکاری، نوسر بازی سے لے کر ڈکیتی تک وارداتیں کرتے تھے اور سائیں ان کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ چھانگا مانگا کا تھانہ انچارج صدیق گوندل بہت خوش تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسا کیس اس کے ہاتھ آ گیا تھا جس سے اس کا ریکارڈ بہت بہتر ہو سکتا تھا۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

”ملک صاحب! یہ سب کچھ آپ کی مہربانی سے ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو بھی ہوا اسے بھول جائیں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ یہ سب کچھ آپ نے کیا ہے۔ سائیں اور اس کے دو گماشتے آپ کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ انشاء اللہ گاموں اور کریمو بھی بہت جلد حوالات میں ہوں گے۔ سائیں اور کرمو نظامو وغیرہ تو اپنے جرائم کا اقرار کر چکے ہیں۔ آپ کے لیے کیس کے باقی مراحل بہت آسان ثابت ہوں گے۔“

”ملک صاحب! میں آپ کے اس بے لوث تعاون کو عمر بھر یاد رکھوں گا۔“ صدیق گوندل نے ممنونیت سے کہا۔

میں نے کہا۔ ”تعاون تو آپ نے بھی بہت کیا ہے گوندل صاحب۔“

”لیکن آپ کو اس کا فائدہ کیا پہنچا۔“ وہ قدرے اداس ہو گیا۔ ”آپ کے مطلوبہ نامعلوم قاتل کا تو کوئی سراغ نہیں مل سکا۔“

میں نے یاد دہانی کے انداز میں کہا۔ ”آپ غالباً ایک بات بھول رہے ہیں!“

”وہ کیا؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”غزالہ“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا غزالہ؟“

میں نے اپنی جیب میں سے غزالہ کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر نکال کر صدیق گوندل کو دکھائی اور کہا۔ ”سائیں کے تہ خانے کی تلاشی کے دوران میں، یہ تصویر میں نے حاصل کر لی تھی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سائیں کا وہ پستہ قامت ”کلائنٹ“ اسی لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اب یہ لڑکی مجھے کسی پستہ قامت شخص تک پہنچائے گی۔“

”مگر آپ اس لڑکی تک کیسے پہنچیں گے؟“

”اسی تصویر کے ذریعے“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور تصویر الٹ دی۔ ”یہ دیکھیں، تصویر کے پیچھے فوٹو اسٹوڈیو کی مہر لگی ہوئی ہے جس میں دکان کا مکمل پتہ درج ہے۔ باقی معلومات فوٹوگرافر خود فراہم کرے گا۔“

”ہوں“ صدیق گوندل کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا مطلوبہ بندہ پتوکی کے ریلوے اسٹیشن پر واردات کر کے روپوش ہوا ہے یا فرار ہوا ہے۔ سائیں کے مطابق اس کا پستہ قامت کلائنٹ بھی پتوکی کا رہنے والا ہے اور یہ ”بھولا فوٹو اسٹوڈیو“ بھی پتوکی ہی میں واقع ہے۔ اس زنجیر کی کڑیاں آپس میں ملتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں خاص طور پر نامعلوم قاتل اور سائیں کے کلائنٹ میں قدر مشترک پستہ قامتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو کڑیاں کم ہیں وہ پتوکی جا کر پوری ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ بہت جلد میں اس زنجیر کو مکمل کر لوں گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

”ایک بات کا خیال رکھیں صدیق صاحب۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”سائیں کے مطابق، اس کا کلائنٹ ایک ہفتے بعد اس کے پاس آنے والا تھا، کاجل لینے کے لیے۔ آپ نے جن کانسٹیبلوں کو ڈیرے کے آس پاس گاموں اور کریمو کی گرفتاری کے لیے تعینات کیا ہے انہیں پستہ قامت راج کپور ملد کا موچھیں والے اس چھ انگلی شخص کے بارے میں بھی ہوشیار کر دیں۔ اگر میں ایک ہفتے کے اندر اس کی گردن کی پیمائش نہ کر سکا تو ممکن ہے وہ یہاں گرفتار ہو جائے!“

”آپ اس طرف سے تو بالکل ہی بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔“ صدیق گوندل تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ میری مستعدی سے یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ آپ نے میری ترقی کا اتنا سامان کر دیا ہے۔ اب مجھے بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں مارنا ہیں نا۔“

تھوڑی دیر کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے۔

چھانگا مانگا کے تھانے کی حوالات میں سائیں سے میں نے خاصی تفصیلی پوچھ تاچھ کی تھی۔

وہ اپنے کلائنٹ اور غزالہ کے بارے میں جو کچھ بتا چکا تھا اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا ورنہ اس نے جہاں اتنا کچھ قبول کیا تھا وہاں ان معمولی معلومات کو چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔ اسے اس بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ اس کے پستہ قامت کلائنٹ نے اسے جو پانچ سو روپے دیے تھے وہ اس نے کہاں سے حاصل کیے تھے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ چھانگا مانگا کے جنگل میں سے ہمیں جو شکستہ بریف کیس ملا تھا اس کا کوئی تعلق واسطہ اس کے کلائنٹ سے بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال، میں جب واپس اپنے تھانے پتوکی پہنچا تو خاصا مطمئن تھا۔

اگلے روز میں نے حوالدار مبارک علی کو ساتھ لیا اور سیدھا ''بھولا فوٹو اسٹوڈیو'' پہنچ گیا۔ فوٹو گرافی کی مذکورہ دکان پتوکی کے مین بازار کے آغاز ہی میں تھی۔ دکان کا مالک فوٹو گرافر نذیر بھولا اس وقت وہاں موجود تھا۔ ہم سرکاری لباس میں تھے اس لیے وہ فوراً ہماری آؤ بھگت کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

''کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے بھولا جی۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں چند اہم قسم کے سوال تم سے پوچھنے آیا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ تم پورا تعاون کرو گے۔''

وہ فدویانہ انداز میں بولا۔ ''کیوں نہیں ملک صاحب۔ میں آپ کا خادم۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''تم کسی غزالہ نامی لڑکی کو جانتے ہو؟''

وہ ذہن پر زور دینے کے بعد نفی میں گردن ہلانے لگا۔ ''نہیں جناب، میں کسی غزالہ سے واقف نہیں ہوں۔''

''یہ تصویر تو تم پہچان ہی لو گے؟'' میں نے اپنی جیب میں سے غزالہ کی تصویر نکال کر اس کی جانب بڑھا دی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''بالکل بالکل۔ جناب، یہ تصویر میرے ہی اسٹوڈیو کی بنی ہوئی ہے بلکہ یہ تصویر میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کھینچی تھی۔'' پھر وہ تصویر کو پلٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھیں، میرے اسٹوڈیو کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔''

میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ غزالہ کی تصویر ہے۔''

''آپ کہہ رہے ہیں تو یقیناً یہ غزالہ ہی ہو گی جناب۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ میرے اسٹوڈیو میں تصویر بنوانے آئی

تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کے باپ کو جانتے ہو؟''

''نہیں بھلا کون نہیں جانتا ملک صاحب!'' وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ''ظفر اقبال خان سے تو آپ بھی واقف ہوں گے۔''

''اچھا'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ظفر اقبال خان تو اس علاقے کی خاصی معروف شخصیت ہے۔ تو غزالہ خان صاحب کی بیٹی ہے!''

بھولا نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''جناب! آخر معاملہ کیا ہے۔ کہیں کوئی واردات شاردات تو نہیں ہو گئی؟''

''واردات تو ہوئی ہے بھولا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور پوچھا۔ ''تم غزالہ کے بارے میں اور کچھ جانتے ہو؟''

وہ محتاط لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو اس کا نام بھی آپ ہی سے معلوم ہوا ہے جناب ورنہ میں تو صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ خان صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔''

میں نے بھولا فوٹو گرافر کے انداز میں ایک بے چینی سی محسوس کی۔ خاص طور پر جب میں نے کسی واردات کا ذکر کیا تھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''غزالہ نے یہ تصویر کتنا عرصہ پہلے تم سے بنوائی تھی؟''

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''چند روز پہلے کی بات ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا۔ ''مگر یہ تصویر آپ کے پاس کیسے آ گئی۔ خان صاحب کی بیٹی تو خیریت سے ہے نا!''

''ہم ابھی یہاں سے سیدھے اس کی خیریت معلوم کرنے ہی جائیں گے۔'' میں نے ذو معنی لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے اس تصویر کی کتنی کاپیاں بنائی تھیں؟''

بھولا نے بتایا ''چھوٹے سائز کی تصویروں کی عموماً تین کاپیاں بناتا ہوں لیکن اگر کوئی خصوص بڑے سائز میں تصویر بنوانا چاہے تو اس کے آرڈر کے مطابق ہی میں تصویریں تیار کرتا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آٹھ بائی پانچ انچ کی تصویر ہے۔ خان صاحب کے آرڈر کے مطابق میں نے اس کی دو کاپیاں تیار کی تھیں؟''

''اور وہ دونوں تصویریں تم نے خان صاحب کو دے دی تھیں؟''

''جی ہاں بالکل'' وہ قطعیت سے بولا۔

''کیا تم اپنے گاہکوں کو تصویر کا نیگیٹو بھی دے دیتے ہو؟''

اس نے بتایا۔ ''چھوٹی تصویروں کے ساتھ تو عموماً دے دیتا ہوں لیکن بڑی تصویروں کا نیگیٹو میں اپنے پاس محفوظ رکھتا ہوں البتہ اگر کوئی اصرار کرے تو میں تھوڑی رقم کے عوض وہ نیگیٹو دے بھی دیتا ہوں۔''

''اس تصویر کا نیگیٹو تمہارے پاس محفوظ ہے یا خان صاحب لے گئے؟''

وہ گڑبڑا گیا' بولا۔ ''خان صاحب لے گئے تھے..... نہیں' شاید میرے ہی پاس رکھا ہوا ہے۔ ٹھہریں میں چیک کرتا ہوں۔''

''کیا تمہاری یادداشت اتنی ہی خراب ہے کہ چند روز پہلے کی بات بھی تمہیں پوری طرح یاد نہیں۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''یاد آ گیا' یاد آ گیا۔'' وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''نیگیٹو میرے پاس ہی رکھا ہوا ہے۔ خان صاحب نے کہا تھا کہ اگر تصویر پسند آ گئی تو وہ اس کا ایک آدم قد پرنٹ بھی بنوائیں گے۔''

''آدم قد!'' میں نے زیرِ لب دہرایا۔ ''مگر یہ تصویر تو کلوز اپ میں ہے؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا مطلب ہے' وہ خاصے بڑے سائز میں تصویر بنوانا چاہتے تھے۔''

''ٹھیک ہے'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نذیر بھولا'' میں نے فوٹو گرافر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے' تم نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہوگی۔''

''آپ نے جو پوچھا' میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ اگر کوئی خاص بات میرے پوچھنے سے رہ گئی ہو تو وہ بھی بتا دو۔ خاص طور پر اس تصویر کے حوالے سے؟''

''نہیں جناب' اور کوئی بات نہیں ہے۔''

ہم بھولا فوٹو اسٹوڈیو سے نکل کر ظفر اقبال خان کے گھر کی جانب چل پڑے جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں ظفر اقبال کو غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ ابھی تک ہماری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک صاحبِ ثروت اور معروف کاروباری شخص تھا۔ جب ہم اس کی شاندار رہائش گاہ پر پہنچے تو وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ خان صاحب دو روز کے لیے ملتان گئے ہوئے ہیں۔ تاہم غزالہ کی ماں کنیز فاطمہ نے ہماری آمد کا مقصد جاننے کے لیے

ہمارے لیے سجایا ڈرائنگ روم کھلوا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

کنیز فاطمہ کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ وہ پروقار شخصیت کی مالک تھی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''ملک صاحب! ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائے۔ یہاں تو اکثر آپ کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔''

مجھے حیرت ہوئی' پوچھا۔ ''کس سلسلے میں میرا تذکرہ ہوتا رہتا ہے؟''

''وہ ہماری غزالہ ہے نا' وہ آپ کی مداح ہے۔'' کنیز فاطمہ نے بتایا۔

یہ ایک عجیب انکشاف تھا میرے لیے۔ میں نے کہا۔ ''لیکن وہ مجھے کیسے جانتی ہے؟''

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی اسے یہاں بلاتی ہوں۔'' پھر وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔

حوالدار مبارک علی نے مجھ سے کہا۔ ''یہ کیا قصہ ہے ملک صاحب؟''

''قصہ تو مجھے بھی معلوم نہیں بھئی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دیکھتے جاؤ' آگے آگے کیا ہوتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد کنیز فاطمہ اپنی اکلوتی بیٹی غزالہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ غزالہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ بلیک اینڈ وہائٹ تصویر میں اس کی خوبصورتی کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کی عمر کم و بیش بائیس سال رہی ہوگی۔

''یہ ہیں ملک صفدر حیات صاحب!'' کنیز فاطمہ نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے غزالہ کو بتایا۔

غزالہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ ہمارے علاقے میں تعینات ہیں' مجھے ایک بے قراری سی لگی ہوئی ہے۔ ابا جی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی روز مجھے آپ کے پاس لے چلیں گے جب کہ میرا اصرار یہ تھا کہ ہم گھر پر آپ کی دعوت کریں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آپ خود ہی یہاں تشریف لے آئے ہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اپنے سامنے آپ کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔''

اس دوران میں کنیز فاطمہ ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی تھی۔ میں نے غزالہ سے پوچھا۔ ''آپ مجھے کس طرح جانتی ہیں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ پہلے ہماری کبھی ملاقات ہوئی ہو!''

''ہم آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔'' اس نے میری بات کی تائید میں کہا۔ ''اور جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ میں آپ کو کیسے جانتی ہوں تو اس کے لیے آپ کا وہ کارنامہ ہی کافی ہے۔''

''کون سا کارنامہ بھئی؟'' میں واقعتاً حیران ہو رہا تھا۔

غزالہ نے پوچھا۔ ''چند سال پہلے آپ رینالہ خورد کے ایک تھانے میں تعینات تھے نا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے سوال کیا۔ ''پھر تو آپ کو تاجی والا واقعہ بھی یاد ہوگا!''

''کون تاجی اور کیسا واقعہ؟'' وہ لڑکی مجھے حیران پر حیران کیے جا رہی تھی۔

غزالہ نے بتایا۔ ''وہی تاجی جس کو غنڈوں نے اغوا کر لیا تھا اور آپ کی کوششوں سے نہ صرف تاجی بہ عزت و خیریت گھر واپس لوٹ آئی تھی بلکہ آپ نے اغوا کنندگان کو بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا تھا۔ تاجی کو آپ نے ''اناڑی'' سے برآمد کیا تھا۔''

وہ پورا واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ان دنوں میں رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) کے ایک تھانے میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اناڑی (ضلع اوکاڑہ) کے ایک دیہات میں اغوا کنندگان سے اچھی خاصی مار ماری بھی ہوئی تھی لیکن حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ ان واقعات سے غزالہ کا کیا تعلق تھا؟ یہ سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

''آپ کو ان تمام واقعات کا علم کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''میں ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے پاس رینالہ خورد گئی ہوئی تھی اور تاجی میری وہاں کی سہیلیوں میں سے ایک ہے۔ اتفاق سے میری وہاں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ میرے ماموں کو تو جانتے ہوں گے۔ افضل خان اور ان کا نام ہے؟''

میں رینالہ خورد کے زمیندار افضل خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہاں تعیناتی کے دوران میں ایک دو مرتبہ اس سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ میں نے غزالہ کو بتایا کہ وہ تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے ہیں۔

''بس آپ کی بہادری اور جرأت مندی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔'' وہ عقیدت مندانہ انداز میں بولی۔ ''آپ سے روبرو ملاقات کی بڑی خواہش تھی جو بغیر کسی کوشش کے خود بخود پوری ہو گئی۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتی ہوں۔''

اسی وقت اس کی ماں ایک ملازم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ملازم کے ہاتھ میں

لدی پھندی کنگ سائز ٹرے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہماری خاطر مدارات کا اچھا خاصا انتظام ہو چکا تھا۔

کنیز فاطمہ نے ملازم کے جانے کے بعد کہا۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے ذرا کچھ کھا پی لیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے خواہ مخواہ اتنا تکلف کیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔''

''ابھی تو آپ کو دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا ہے جناب۔'' غزالہ نے کھانے پینے کی اشیاء برتنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تکلف تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور ایک نہایت ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔''

''لیکن خان صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔'' کنیز فاطمہ نے کہا۔

''دراصل خان صاحب سے زیادہ غزالہ میری مدد کر سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک اہم معاملے میں ان سے تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

غزالہ نے میرے چہرے سے بھانپ لیا کہ معاملہ گمبھیر ہے' سنجیدگی سے بولی۔ ''خیریت تو ہے نا ملک صاحب؟''

''خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔'' میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ''قتل کے ایک کیس کو حل کرنے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔''

''میرا تعاون!'' غزالہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماں کی جانب دیکھا۔ ''قتل کے کسی معاملے سے بھلا میرا کیا واسطہ؟''

میں نے کہا۔ ''میں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ اس قتل میں ملوث ہیں۔ مجھے تو صرف آپ کا تعاون چاہیے۔ اس کیس کی چند کڑیاں غائب ہیں' میں انہیں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے غزالہ اس سلسلے میں مجھے مفید معلومات فراہم کر سکتی ہے۔'' آخری جملہ میں نے کنیز فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھی نہیں' آخر غزالہ قتل کے کسی معاملے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہے۔ کس کا قتل ہوا ہے؟''

''رانا مختار حسین کا قتل'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جسے ریلوے اسٹیشن پر قتل کیا گیا تھا۔'' کنیز فاطمہ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بالکل وہی۔''

''لیکن غزالہ کا اس معاملے سے کیا واسطہ؟'' کنیز فاطمہ کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی جب کہ غزالہ سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی جیب میں سے غزالہ کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر نکال کر میز پر رکھ دی اور باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس تصویر کو تو آپ پہچان ہی گئی ہوں گی؟''

ان دونوں نے اثبات میں سر ہلایا غزالہ نے کہا۔ ''یہ میری تصویر ہے۔''

''یہ تصویر آپ کے پاس کیسے پہنچی؟'' کنیز فاطمہ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ ایک لمبا چکر ہے۔ فی الحال آپ یہ بتائیں کہ بھولا فوٹو اسٹوڈیو سے آپ نے ایسی جو دو تصویریں بنوائی تھیں وہ کہاں ہیں؟''

'ایک تو میرے کمرے میں لگی ہوئی ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''دوسری رینالہ خورد میں ماموں کے گھر میں لگی ہے۔ دونوں تصویریں فریم شدہ ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ٹھہریں' یہاں والی تصویر میں ابھی لا کر آپ کو دکھاتی ہوں۔''

ایک منٹ کے اندر اندر وہ اپنی فریم شدہ تصویر لے کر آ گئی۔ فریم اگرچہ خاصا بڑا تھا تاہم اس کے اندر تصویر کا سائز آٹھ بائی پانچ انچ ہی تھا اور یہ بالکل ہو بہو ویسی ہی تصویر تھی جیسی مجھے سائیں کے تہ خانے سے ملی تھی یعنی دونوں تصاویر ایک ہی نیگیٹو سے تیار کی گئی تھیں۔

کنیز فاطمہ نے کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ایک فریم میرے بھائی کی حویلی میں بھی ہے۔ وہ تصویر میری بھابی نے منگوائی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس وقت بھی وہ تصویر رینالہ خورد والی حویلی میں ہی موجود ہو گی؟''

''بالکل موجود ہے ملک صاحب'' کنیز فاطمہ پر وثوق لہجے میں بولی۔ ''ابھی میں کل ہی تو وہاں سے آئی ہوں۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''

میں نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' فوٹو گرافر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے یہ تصویریں دو سے زیادہ بنائی تھیں۔''

''ہم نے تو دو ہی بنوائی تھیں۔'' غزالہ نے کہا۔

کنیز فاطمہ نے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔ غزالہ کی یہ تیسری تصویر آپ کے پاس کیسے پہنچی؟''

میں نے کنیز فاطمہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے غزالہ سے کہا۔ ''غزالہ! اب میں تم سے جو سوال کرنا چاہتا ہوں اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ پتہ نہیں' مجھے تمہاری والدہ کے سامنے یہ بات پوچھنا چاہیے یا نہیں لیکن میں حالات سے مجبور ہوں اور میرا خیال ہے جب تم بے خبر ہو تو اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔''

''ملک صاحب! ہم ماں بیٹی آپس میں سہیلیوں کی طرح ہیں۔'' کنیز فاطمہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ غزالہ سے جو کچھ بھی پوچھنا چاہتے ہیں' میری موجودگی میں بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''غزالہ تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو.....'' میں نے اتنا کہنے کے بعد اس کے چہرے پر نظر جمائی اور نہایت ہی معتدل لہجے میں اپنی بات آگے بڑھا دی۔ ''جس کی عمر پچیس اٹھائیس سال کے درمیان ہو۔ بال گھونگریالے' ناک موٹی' کان چھوٹے' تنگ پیشانی اور بائیں گال پر مسا ہو۔ اس کے بائیں ہاتھ کی چھنگلی ڈبل ہو اور مونچھیں.....''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔ ''میں اس خبیث شخص کو اچھی طرح جانتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں نفرت جھلکتی تھی۔

''کون خبیث' میری بچی؟'' کنیز فاطمہ نے بیٹی سے پوچھا۔

''امی! وہی خوشیا۔'' غزالہ نے ناگواری سے بتایا۔ ''میں نے آپ کو اس کمینے کی حرکت کے بارے میں سب کچھ بتایا تو تھا۔ وہی ٹھگنا مردود۔''

غزالہ کی زبان سے خوشیا کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ سائیں نے اپنے کلائنٹ کا نام بھی خوشیا ہی بتایا تھا۔ ایک خاص بات اور..... یہ تھی کہ میں نے غزالہ کو اپنے مطلوبہ شخص کے قد کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا اس کے باوجود اس نے خوشیا کو ٹھگنا بتایا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم انکشاف تھا۔ سائیں کے مطابق اس کا کلائنٹ خوشیا چتو کی کار رہنے والا تھا اور غزالہ نامی کسی لڑکی کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا تھا۔ اسی تناظر میں' میں نے غزالہ سے پوچھا۔

''خوشیا نامی اس ٹھگنے شخص کو تم کس طرح جانتی ہو؟''

غزالہ نے اپنی ماں کنیز فاطمہ کی طرف دیکھا' وہ بولی۔ ''ملک صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جہاں تک میری سوچ پرواز کر سکتی ہے' میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ رانا مختار کے قتل کے سلسلے میں آپ کو خوشیا کی تلاش ہے!''

میں نے حیرت سے اس ذہین عورت کی جانب دیکھا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی سوچ کی پرواز بالکل درست سمت میں ہے۔'' پھر میں غزالہ سے مخاطب ہوا۔ ''تم خوشیا کے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں۔ تم نے جس انداز میں اسے خبیث' کمینہ اور مردود کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی ذہنی اذیت پہنچائی ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''پہلے آپ یہ بتائیں؟ آپ کو میری یہ تصویر کہاں سے ملی؟''

''ایک ماہر سفلیات کے ڈیرے سے۔'' میں نے حقیقت کو چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ ''خوشیا نے یہ تصویر اس ماہر کو اس لیے دی تھی کہ وہ ایک ایسا عمل کرے جس سے تم اس کی مطیع بن جاؤ۔''

''مگر یہ تصویر خوشیا کے ہاتھ کیسے لگی؟''

''اس کا پتہ بھی چل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تو وہ تفصیل بتاؤ جس کی وجہ سے تم خوشیا سے نفرت کرتی ہو؟''

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اپنے خیالات کو مجتمع کرتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں خوشیا کے کرتوت بتانے لگی۔ میں یہاں پر غزالہ کے بیان کا خلاصہ تحریر کرتا ہوں۔

غزالہ ایک روز اپنی ماں کے ساتھ سینڈل خریدنے کے لیے مین بازار میں گئی۔ جوتوں کی ایک بڑی دکان پر اس نے آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد اپنے لیے ایک خوبصورت سینڈل پسند کر لی۔ اس دوران میں سیلز مین خوشیا اس کے سامنے سینڈلوں کے درجن بھر ڈبے پھیلائے بیٹھا رہا۔ سینڈل کے انتخاب کے دوران میں دوپٹہ سنبھالتے ہوئے یا بال درست کرتے ہوئے غزالہ کے کان کی ایک طلائی بالی وہیں کھلے ہوئے ڈبوں میں کہیں گر گئی۔ غزالہ کو جس کا مطلق احساس نہ ہوا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر آ گئی۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت پستہ قامت خوشیا ان کے گھر پہنچ گیا اور مذکورہ بالی کنیز فاطمہ کے حوالے کر دی۔ کنیز فاطمہ نے اس کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن خوشیا نے اس واقعے کے سہارے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس واقعے کے بعد جب بھی غزالہ سے اس کا سامنا ہوتا' وہ مسکرا کر اسے دیکھتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے غزالہ کو سلام بھی کیا۔ غزالہ نے خوشیا کی اس حرکت کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ چونکی تو وہ اس روز جب ایک مرتبہ خوشیا نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' خوشیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

کہا۔

غزالہ سمجھی' شاید وہ بالی کی بازیابی کے سلسلے میں کسی انعام وغیرہ کا طلبگار ہے۔ اس نے رک کر پوچھا۔ ''ہاں بولو' کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا' کیسے کہوں۔''

''ایسے ہی کہو جیسے کہہ رہے ہو..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا' کیسے کہوں۔'' غزالہ نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف لیتے ہوئے تجویز کیا۔

وہ بولا۔ دراصل بات بڑی منہ چھوٹا.....''

غزال نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو' میں تمہاری مشکل آسان کر دیتی ہوں۔'' پھر وہ اپنے پرس سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لو' یہ تمہارا انعام ہے۔ تم نے میری کھوئی ہوئی بالی گھر پہنچا کر ایک اچھا کام کیا تھا اس کے لیے تم واقعی انعام کے مستحق ہو۔''

خوشیا نے نوٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ مجھے انعام نہیں' آپ کی محبت چاہیے۔''

''محبت!'' غزالہ نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''یہ بکواس نہیں ہے حسن کی ملکہ'' وہ بے خودی کے سے انداز میں گویا ہوا۔ ''مجھے واقعی تم س محبت ہو گئی ہے۔ اگر جواباً تم بھی مری محبت کا جواب محبت سے دو تو میری زندگی بن جائے گی۔''

''تم دفع ہوتے ہو یہاں سے یا میں جوتی اتاروں۔'' غزالہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''آپ یقین کریں..... میں آپ کے بغیر زندگی کا تصور.....''

''اپنی ناپاک زبان بند رکھو دو کوڑی کے ملازم'' وہ دہاڑی ''اور آئندہ اگر تم کبھی میرے راستے میں آئے تو اتنے جوتے لگواؤں گی کہ آئینے میں خود کو پہچان نہیں سکو گے۔''

اتنا کہہ کر غزالہ آگے بڑھ گئی۔ خوشیا بری طرح ذلیل ہوا تھا تاہم اس نے غزالہ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غزالہ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ جب تک وہ اسے کوئی سنگین سبق نہیں سکھائے گی وہ اپنی اوچھی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ غزالہ نے اس واقعے کے حوالے سے گھر میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے اپنی ایک راز دار سہیلی کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا اور ایک ایسے موقع پر وہ دونوں خوشیا کے سامنے آ گئیں جب وہ بھرے بازار میں ایک طرف جا رہا تھا۔

غزالہ کو سامنے دیکھ کر خوشیا ایک مرتبہ پھر اس سے اظہارِ عشق کرنے لگا۔ غزالہ نے اس سے

پوچھا۔ ''کیا تمہیں واقعی مجھ سے عشق ہے؟''

''چاہے جتنی بڑی قسم لے لو' میں تیار ہوں۔''

وہ دونوں تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شرارت کے موڈ میں تھیں۔ غزالہ کی سہیلی نے استفسار کیا۔ ''تم غزالہ کی خاطر کیا کر سکتے ہو؟''

''یہ جو بھی کہے' میں کرنے کو تیار ہوں۔''

''غزالہ کی محبت میں جان دے سکتے ہو؟''

''یہ حکم تو دے۔''

''زہر کھا سکتے ہو؟''

''بالکل کھا سکتا ہوں۔''

''اور جوتے؟''

''وہ بھی......'' وہ روانی میں بول گیا پھر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' جلدی سے بولا۔ آپ کیوں مذاق کرتی ہیں!''

''ہم مذاق نہیں کر رہیں۔'' دونوں نے بہ یک زبان کہا۔ ''ہم واقعی تمہیں جوتے مارنے والی ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سینڈلیں اتار لیں اور خوشیا کی مرمت کرنے لگیں۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی اس ''شغل'' میں شامل ہو گئے۔ سب کے علم میں یہی بات تھی کہ خوشیا نے خان صاحب کی بیٹی کے ساتھ بھرے بازار میں بدتمیزی کی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں خوشیا کی بری حالت ہو گئی۔ وہاں سے دم دبا کر فرار ہونے سے پہلے اس نے غزالہ کو دھمکی دی۔

''غزالہ! میں اس بے عزتی کو بھولوں گا نہیں۔'' اس کے لہجے میں انتقام کے شعلے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ''تم دیکھ لینا' ایک روز میں تمہیں اپنے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کر دوں گا۔''

اس روز کے بعد غزالہ کو خوشیا کی شکل نظر نہ آئی۔ اس نے بھی شکر بھیجا کہ جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔ اس روز گھر آ کر غزالہ نے اپنی ماں کو پورا واقعہ سیاق و سباق کے ساتھ سنا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خان صاحب کو کچھ نہ بتایا جائے۔ ماں بیٹی بہت سے معاملات میں ایک دوسرے کی راز دار تھیں اس لیے یہ خبر ظفر اقبال خان تک نہ پہنچی پھر ویسے بھی اس روز کے بعد سے خوشیا کی طرف سے کوئی نازیبا حرکت سامنے نہیں آئی تھی اس لیے بھی غزالہ مطمئن تھی۔

غزالہ پوری کہانی بیان کر چکی تو میں نے پوچھا۔ ''ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ خوشیا تمہارے

ملے میں واقعی سنجیدہ تھا یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ بولی۔ ''ملک صاحب! وہ اس سلسلے میں عادی مجرم ہے۔ میں پہلے بھی اس کے کئی قصے سن چکی ہوں کئی لڑکیوں سے اظہار محبت کر چکا ہے اور بارہا بے عزت بھی ہو چکا ہے اول درجے کا آوارہ ہے وہ شخص۔''

''پھر تو تم نے اس کے ساتھ بالکل۔ ''مناسب'' سلوک کیا تھا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

کنیز فاطمہ نے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اس نامراد نے میری بچی پر کوئی کالا جادو تو نہیں کروا دیا۔ آپ بتا رہے تھے نا' وہ کسی ماہر سفلیات کے پاس گیا تھا؟''

''کسی وہم میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے خاتون۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''وہ کال پیر فرتوت اس وقت حوالات کی ہوا کھا رہا ہے اور عنقریب جیل کی ہوا میں سانس لیتا ملے گا۔ میں نے اس کا سارا زہر نکال دیا ہے۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' وہ دعائیہ انداز میں بولی۔

میں نے غزالہ سے پوچھا۔ ''خوشیا کے گھر کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

اس نے نفی میں جواب دیا' میں نے سوال کیا۔ ''وہ کون سی دکان پر سیلز مین ہے۔''

''فرید بوٹ ہاؤس۔''

''کیا یہ دکان بھی مین بازار میں ہی ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کنیز فاطمہ نے کہا۔ ''ملک صاحب! دوپہر کا کھانا میں آپ کے لیے تیار کروا رہی ہوں۔''

''اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''کھانا مجھ پر ادھار رہا۔ خان صاحب ملتان سے واپس آ جائیں پھر میں آپ کو یہ زحمت ضرور دوں گا۔ فی الحال تو میں خوشیا کی گرفتاری کے لیے بے چین ہوں۔''

وہ دونوں ہمیں روکتی ہی رہ گئیں لیکن اب ہم وہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم چوک کے مین بازار میں تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ''فرید بوٹ ہاؤس'' ''مختار کلاتھ ہاؤس'' سے متصل تھی۔

وہ دوپہر کا وقت تھا اور رانا افتخار حسین اپنی دکان پر موجود تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے

سلام کیا۔ میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرید بوٹ ہاؤس میں داخل ہو گیا۔

دکان کے مالک بابو فرید سے میں نے خوشی محمد عرف خوشیا کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولا۔ ''خوشیا دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا ہے۔ اسے گھر پر کوئی ضروری کام تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھولا اسے بلانے آیا تھا۔''

میں نے فوراً سوال کیا۔ ''بھولا فوٹو گرافر؟''

''جی ہاں' جی ہاں وہی'' فرید نے جواب دیا۔ ''دونوں بڑے گہرے دوست ہیں۔''

بابو فرید احمد کے جواب نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی میں نے اگلا سوال کیا۔ ''خوشیا کا گھر کس طرف ہے؟''

''وہ پرانی منڈی پتوکی میں رہتا ہے۔''

''ذرا تفصیل سے بتائیں۔''

اس نے خوشیا کے گھر کی لوکیشن بتائی پھر پوچھا۔ ''خیر تو ہے نا تھانے دار صاحب۔ آپ یہ پچھ پرتیت کس سلسلے میں کر رہے ہیں؟''

اسی اثنا میں رانا افتخار حسین بھی وہاں پہنچ گیا۔ میرے چہرے سے ہویدا جوش کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! لگتا ہے' کوئی نہایت ہی اہم نکتہ آپ کے ہاتھ آ گیا ہے۔''

میں نے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے کہا۔ ''افتخار حسین! ہمیں ابھی اور اسی وقت پرانی منڈی میں خوشیا کے گھر پہنچنا ہے۔''

وہ صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہی فوراً تیار ہو گیا۔ ''آئیں ملک صاحب میرے پاس سواری کا انتظام موجود ہے۔''

بابو فرید احمد ہکا بکا ہماری صورتیں دیکھتا رہ گیا اور ہم آنِ واحد میں اس کی دکان سے رخصت ہو گئے۔

خوشیا کا گھر آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا اور مجھے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق وہ وہاں اپنی بوڑھی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں اندھی بہری اور ٹانگوں سے معذور ایک ضعیف عورت تھی جو قبر میں ٹانگیں لٹکائے اپنی موت کا انتظار کر رہی تھی۔

پہلی دستک کے جواب میں اندر خاموشی رہی حالانکہ میں نے بڑے دھیمے انداز میں دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ محسوس کر لی تھی۔ دوسری دستک پر اندر کچھ کھسر پھسر محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے ایک پٹ میں ہلکی سی جنبش بھی ہوئی تھی۔

تیسری مرتبہ میں نے قدرے زور سے دستک دی۔ اس بار بھی دروازہ نہیں کھلا تاہم بند دروازے کے پیچھے کسی کی سرگوشی سنائی دی اس سرگوشی میں سوال کیا گیا تھا۔ ''باہر کون ہے؟''

''پولیس یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' جواب دینے والے نے قدرے دھیمی آواز میں کہا اور میں نے وہ آواز فوراً پہچان لی۔

وہ فوٹو گرافر نذیر بھولا کی آواز تھی۔

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بھولا اس وقت خوشیا کے گھر کے اندر موجود تھا۔ بابو فرید نے مجھے بتایا تھا کہ بھولا ہی اسے دکان سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تو اس کا مقصد یہ ہوا کہ وہ دونوں کسی سنگین معاملے میں ملوث تھے..... اور وہ معاملہ رانا مختار حسین کے قتل سے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے جواں سال حوالدار کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے دائیں کندھے کی ایک ہی ضرب سے دروازے کے قبضے اکھاڑ دیے۔ رہی سہی کسر افتخار حسین نے پوری کر دی۔ اگلے ہی لمحے ہم خوشیا کے گھر کے اندر تھے۔ وہ دونوں گھر کی عقبی دیوار کو پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ ہم نے انہیں دبوچ لیا۔

چند زور دار لات مکے اور جان دار ٹھڈے کھانے کے بعد انہوں نے مزاحمت ترک کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی کلائیوں میں ہتھ کڑی پہنا دی گئی۔

تھانے پہنچنے کے بعد ہمیں ان پر زیادہ ''محنت'' نہیں کرنا پڑی۔ وہ دونوں عادی مجرم نہیں تھے۔ بھولا فوٹو گرافر نے بس اس حد تک خوشیا کی مدد کی تھی کہ اسے غزالہ کی ایک تصویر فراہم کر دی تھی جو کہ اس سفلی عمل کے لیے ضروری تھی۔ آج صبح جب میں نے بھولا سے تصویر کے سلسلے میں پوچھ گچھ کی تھی تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کہیں گڑبڑ ہو چکی تھی اسی لیے وہ خوشیا کو دکان سے گھر لے گیا تھا کہ بچاؤ کا کوئی منصوبہ بنایا جائے مگر ان کی بدقسمتی کہ ہم بروقت وہاں پہنچ گئے۔

تھوڑی سی سختی کے بعد خوشیا نے اپنا ہر جرم قبول کر لیا تھا۔ اس نے وقوعہ کے روز مقتول کو بابو فرید سے یہ کہتے ہوئے سن لیا تھا کہ اس رات وہ ایک بھاری رقم لے کر لاہور جا رہا تھا۔ مقتول اور فرید میں گہرے مراسم تھے اور دونوں ایک دوسرے کی دکان پر گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ خوشیا نے رقم والی بات سنی تو اس نے مختار حسین کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا اسے فوری طور پر رقم کی ضرورت تھی تاکہ سائیں سے وہ عمل کروا سکے خوشیا کو اندازہ نہیں تھا کہ بریف کیس میں سے اس کی توقع سے کہیں زیادہ رقم برآمد ہو گی۔ اس نے کسی بہانے سے مقتول کو پلیٹ فارم کے

ویران حصے کی طرف بلایا پھر موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ ازاں بعد وہ بریف کیس کے ساتھ اسی ٹرین میں چنوکی سے چھانگا مانگا پہنچا جس ٹرین کے انتظار میں مقتول پلیٹ فارم پر موجود تھا۔

خوشیا کی نشاندہی پر باقی ماندہ رقم بھی برآمد کی لی گئی تاہم اس وقت تک وہ دس ہزار روپے میں سے کم و بیش ایک ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔ پانچ سو روپے تو اس نے سائیں ہی کو دے دیے تھے۔

خوشیا کا مقدمہ صرف چھ ماہ تک زیرِ سماعت رہا پھر اسے سزائے موت سنا دی گئی۔ اس چھ ماہ کے عرصے کے دوران ہی میں اس کی ماں کی مشکل بھی آسان ہوگئی۔ ماں کی میت کو کندھا دینا شاید اس کے نصیب ہی میں نہیں تھا۔

کہتے ہیں، محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے لیکن محبت کے معاملے میں اس سلسلے میں، میں تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ محبت ایک پاکیزہ اور خالصتاً خدائی جذبہ ہے۔ محبت کے حصول کے لیے جو لوگ غلط راہوں کی مسافرت اختیار کرتے ہیں انہیں بالآخر ایک روز بری طرح پچھتانا پڑتا ہے۔ عشق کاذب کا انجام ہمیشہ عبرت ناک ہوتا ہے۔

❀ ❀ ❀

زیرِ ماضی

گورنر جنرل پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا کے سرکاری اعلان کے مطابق تیرہ اکتوبر انیس سو پچپن عیسوی کی نصف شب کے بعد یعنی چودہ اکتوبر کو "مغربی پاکستان" وجود میں آیا۔ اسی طرح مشرقی بنگال کا نام تبدیل کر کے "مشرقی پاکستان" رکھ دیا گیا۔ اس "ون یونٹ بل" کی منظوری دستور ساز اسمبلی نے تیس ستمبر کو دی تھی۔ "ون یونٹ" کے تحت سرکاری ملازمین کی بین الصوبائی "شفلنگ" کی گئی چنانچہ کچھ عرصے کے لیے مجھے بھی پنجاب سے بلوچستان بھیج دیا گیا۔ زیرِ نظر واقعہ اسی دور کا ہے۔

ان دنوں میں پشین کے علاقے میں تعینات تھا۔ اب تو شاید پشین (PISHIN) کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا ہے مگر اس زمانے میں یہ اتنا آباد نہیں تھا۔ ایک روز حسبِ معمول میں تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ منظاری (MANZARI) نامی گاؤں میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آ چکا ہے، میں نے فوراً شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

میرے استفسار پر اے ایس آئی خان شاہ نے مذکورہ افسوسناک واقعے کی تفصیل بیان کر دی۔ اس کے مطابق، گزشتہ رات منظاری کے ایک گھر میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس سوختہ مکان میں تین جیتے جاگتے انسان بھی رزقِ آتش بن گئے تھے جن کی کوئلا لاشیں گھر کے اندر ہی موجود تھیں..... نشانِ عبرت کی صورت!

اے ایس آئی کی بات پوری ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "خان شاہ! اس واقعے کی اطلاع کس نے دی ہے؟"

"منظاری کے ایک رہائشی بخت واحد نے" اے ایس آئی نے جواب دیا۔ "وہ اس وقت تھانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔"

"وقوعہ پر کوئی کارروائی ڈالی گئی؟"

"نہیں جناب" خان شاہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تو اب چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ ایسا کرو' تم اے ایس آئی گل زمان کو میرے پاس بھیج دو۔" خان شاہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے مزید کہا۔ "اور جاتے جاتے بخت واحد کو بھی اندر بھیج دو۔"

"یس سر!" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد بخت واحد نامی وہ شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی عمر کا تخمینہ میں نے پینتیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ وہ اپنی وضع قطع سے ایک شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اپنی تیز نگاہی سے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھوٹ بولنے کی "صلاحیت" سے محروم تھا۔ وہ منظاری کا ایک غریب رہائشی تھا۔

بخت واحد کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ منظاری کے آتش زدہ گھر میں ہلاک ہونے والے تین افراد میں تینتالیس سالہ بیگم جان' انیس سالہ زری اور تیئیس سالہ امیر گل شامل تھے۔ زری بیگم جان کی بیٹی اور امیر گل اس کا شوہر یعنی بیگم جان کا داماد تھا۔ یہ کنبہ ان تین افراد پر مشتمل تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے گویا مکینوں کی رخصتی کے ساتھ ہی وہ گھر' مکان میں بدل گیا تھا..... ایک آتش خوردہ مکان!

آتشزدگی کی وجوہات ابھی تک سامنے نہیں آ سکی تھیں۔ گاؤں کے تمام باسی حیرت زدہ تھے کہ بیٹھے بٹھائے بیگم جان کے گھر کو کس کی نظر کھا گئی۔ میں بخت واحد سے سوال و جواب میں مصروف تھا کہ اے ایس آئی گل زمان بھی میرے پاس آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں گل زمان اور دو کانسٹیبلز کے ہمراہ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ بخت واحد بھی ہمارے ساتھ تھا اور ہم سب اونٹوں پر سوار تھے۔

بیگم جان کا مکان الگ تھلگ مقام پر بنا ہوا تھا' یہی وجہ تھی کہ وہاں بھڑکنے والی آگ نے دیگر مکانات کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو لوگوں کا ایک جم غفیر ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مجمع "پولیس' پولیس" پکارتے ہوئے چھٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم اونٹوں سے اتر کر مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی چند معزز چہرہ افراد بھی اندر پہنچ گئے۔ وہ مکان سے زیادہ راکھ کا ایک ڈھیر دکھائی دیتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے تینوں لاشوں کا بغور معائنہ کیا۔ وہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔

میر گل اور اس کی بیوی زری کی لاشیں ایک کمرے میں پڑی ملیں جب کہ بیگم جان کی لاش دوسرے کمرے سے دستیاب ہوئی۔ میری ماہرانہ نظر نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک نہایت اہم بات نوٹ کر لی۔ ان تینوں بدنصیبوں کو حوالۂ آتش کرنے سے پہلے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا۔ ان کے سینے اور پیٹ پر مجھے ایسے آثار ملے جیسے انہیں خنجر یا اسی قسم کے کسی تیز دھار آلے سے وقت کے گھاٹ اتارا گیا ہو۔ اس سے ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی تھی کہ قاتل یا قاتلوں نے ہی مکان کو آگ بھی لگائی تھی تاکہ مکینوں کے ساتھ ساتھ مکان بھی نابود ہو جائے۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ حملہ آور ان تینوں سے خاصی گہری دشمنی رکھتے تھے اور یہ دشمنی نکالنے کے لیے انہوں نے درندگی کی آخری منزل کو چھو لیا تھا۔

میں نے تینوں لاشوں کو الٹ پلٹ کر تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد چادروں سے ڈھک دیا اور جائے وقوعہ کا جائزہ لینے لگا۔ اے ایس آئی گل زمان میری حرکات و سکنات سے معاملات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"ملک صاحب! اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچ سکے ہیں جیسا میں سوچ رہا ہوں!"

"تم کیسا سوچ رہے ہو؟" میں نے اپنے کام میں تعطل پیدا کیے بغیر سوال کیا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "یعنی یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ....."

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا۔ "بلکہ سے تمہاری کیا مراد ہے گل زمان؟"

"میرے خیال میں یہ تہرے قتل کی ایک واردات ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے' ہم ایک ہی خطہ پر سوچ رہے ہیں۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ان تینوں کو قتل کرنے کے بعد ہی مکان کو آگ لگائی گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے۔"

"وہ..... وہ کیا ہے ملک صاحب!"

گل زمان کی تیز آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی نگاہ کے تعاقب میں' میں نے بھی دوڑائی اور ایک چیز پر پہنچ کر میری نظر ساکت ہو گئی۔ مذکورہ چیز امیر گل و زری کی لاشوں کے نزدیک ہی پڑی تھی..... اور وہ آہنی چابیوں کا ایک گچھا تھا۔

میں نے اپنی دستی چھڑی کے ذریعے وہ گچھا زمین سے اٹھالیا۔ تمام کی تمام چابیاں اکٹھی تھیں چنانچہ آگ نے محض ان کا رنگ تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ فولادی چھلا بھی سلامت تھا جس میں تین عدد چابیاں پروئی گئی تھیں۔ ان تین چابیوں کے علاوہ سب سے حیرت انگیز وہ ننھی سی مورتی تھی جو چھلّے میں ایک زنجیر کے ساتھ منسلک تھی جیسا کہ عام طور پر ہر "کی رنگ" کے ساتھ کوئی نہ کوئی نمائشی ٹیگ وغیرہ ہوتا ہے۔ مذکورہ مورتی تانبے کی بنی ہوئی تھی اور وہ ایک برہنہ عورت کی مورتی تھی جس کی پشت پر انگریزی حرف "R" کندہ تھا۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس چابیوں کے گچھے کا تعلق مقتولین سے نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وثوق کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی برہنہ عورت کی مورتی اپنے پاس کیوں رکھنے لگا تھا۔ ان لوگوں کا آپس میں ایسا رشتہ تھا کہ اس قسم کی مورتی کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری اور منطقی وجہ یہ تھی کہ اگر چابیوں کا وہ گچھا انہی تین میں سے کسی کا تھا تو پھر مورتی کی پشت پر انگریزی حرف "B" یا "Z" یا "A" ہونا چاہیے تھا' علی الترتیب بیگم جان یا زری یا امیر گل کے نام کے حوالے سے۔ اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ گچھا کسی ایسے شخص کی ملکیت تھا جس کا نام "R" سے شروع ہوتا ہو..... اور وہ عیاش طبع بھی ہو۔ ایسا ہی کوئی شخص قاتل یا قاتلوں کا ساتھی ہوسکتا تھا۔

میں نے جیبی رومال کی مدد سے چابیوں کا وہ گچھا اپنے پاس محفوظ کرلیا تاہم اس سے پیشتر میں نے وہاں موجود تمام افراد کو فرداً فرداً وہ گچھا دکھا کر ایک سوال پوچھا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ گچھا کس کا ہے؟"

ہر شخص نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ایک ہی جواب دیا تھا۔ "نہیں' ہم اس گچھے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

تھوڑی ہی دیر میں' اے ایس آئی گل زمان کی مدد سے میں نے جائے واردات کا نقشہ تیار کرلیا اور تینوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد میں نے موقع پر موجود افراد سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کیا۔

ایک گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے بعد صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ بیگم جان کو منظاری آئے ہوئے بہ مشکل ایک سال ہوا تھا اور زری کی شادی چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ امیر گل چونکہ بالکل اکیلا تھا اس لیے وہ ماں بیٹی کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ ان تینوں کی پورے گاؤں میں کسی سے دشمنی تو کیا' ہلکی ناراضی بھی نہیں تھی۔ وہ انتہائی امن پسند اور صلح جو انسان تھے۔ ایسے شریف لوگوں کو جب کوئی

جان لیوا حادثہ پیش آجائے تو پولیس کے لیے کیس خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ حادثے کے ذمے دار افراد تک پہنچنا قدرے پیچیدہ اور ٹف ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ باقاعدہ ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

منظاری کی کرتا دھرتا شخصیت' ابراہیم خان ہمیں اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے گیا اور درخواست کی کہ باقی ماندہ پوچھ پڑتال اس کے مہمان خانے میں بیٹھ کر کی جائے۔ اس وقت دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ دونوں کانسٹیبلو کو میں نے لاشوں کے ساتھ اسپتال روانہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میں اے ایس آئی کے ساتھ ابراہیم خان کی بیٹھک میں آ بیٹھا۔

ابراہیم خان ایک وضع دار اور خوش اخلاق انسان تھا۔ اس نے خالص دودھ اور کھجوروں سے ہماری خاطر تواضع کی اور میرے استفسار پر بیگم جان وغیرہ کے بارے میں بتانے لگا۔ پندرہ بیس منٹ میں اس نے جو معلومات مجھے فراہم کیں وہ میری تفتیش کے لیے ناکافی تھیں۔ وہ امیر گل کے بارے میں تو بخوبی جانتا تھا کیونکہ وہ منظاری ہی کا رہنے والا تھا تاہم بیگم جان اور زری کے پس منظر سے وہ پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ بیگم جان کو اس علاقے میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

ابراہیم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "ملک صاحب! مجھے تو یہ کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ لگتا ہے!"

"کیسی پرانی دشمنی اور کس سے دشمنی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "ذرا کھل کر بتائیں خان صاحب!"

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھیں ملک صاحب! امیر گل کے بارے میں تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھلا انسان تھا۔ اس کا کوئی دشمن ہو ہی نہیں سکتا لیکن بیگم جان اور اس کی بیٹی زری کے بارے میں' میں زیادہ نہیں جانتا۔"

"لیکن موقع کے گواہوں کے بیانات میں ایک بات میں نے خاصی مشترک پائی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اور وہ یہ کہ بیگم جان اور زری کا کبھی کسی شخص سے کوئی تنازع نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیشہ متوازن اور قابلِ تعریف رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔"

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں ملک صاحب۔ لوگوں کی عمومی رائے یہی ہے اور میں بھی ابتدائی رائے میں بیگم جان اور زری کے بارے میں انہی خیالات کا اظہار کروں گا۔"

''پھر گڑبڑ کہاں ہے؟'' میں نے استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔

ابراہیم خان نے بتایا۔ ملک صاحب! آپ نے شاید میری پہلی بات پوری توجہ سے نہیں سنی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کسی پرانی دشمنی کا ذکر کیا تھا۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ بیگم جان اور زری کی یہاں آمد سے قبل کسی شخص یا اشخاص سے کوئی دشمنی ہو سکتی تھی۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے!''

''ہاں' واقعی ممکن تو نہیں ہے۔'' میں نے تائیدی نظر سے ابراہیم خان کو دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''بیگم جان منظاری آنے سے پہلے کہاں رہتی تھی؟''

''میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آگ کی نذر ہو جانے والا مکان بیگم جان کی ملکیت تھا یا کرائے وغیرہ کا تھا؟''

''میں نے سنا ہے' اس نے یہ گھر خریدا تھا۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' وہ یہاں مستقل قیام کا ارادہ رکھتی تھی مگر یہ گتھی کیسے سلجھے گی کہ وہ منظاری آنے سے پہلے کہاں رہتی تھی؟''

''اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔'' بیٹھک میں موجود ایک شخص نے درخواست آمیز لہجے میں کہا۔

میں فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''افسر خان'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں' اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''جناب! میں جانتا ہوں کہ بیگم جان اور اس کی بیٹی یہاں آنے سے پہلے کہاں رہتی تھیں۔'' افسر خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے بے اختیار پوچھا۔ ''کہاں رہتی تھیں؟''

''نیو قلعہ بازئی (NEW QILA BAZAI) میں'' افسر خان نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

ابراہیم خان نے سوال کیا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں یہاں آنے سے پہلے نیو قلعہ بازئی میں رہتی تھیں؟''

''پکا یقین ہے خان صاحب!'' افسر خان کا انداز دوٹوک تھا۔

''تم کام کیا کرتے ہو افسر خان؟'' میں نے پوچھا۔

''جانوروں کی خرید و فروخت کرتا ہوں جناب۔'' افسر خان نے کہا۔ ''اسی لیے گاؤں گاؤں گھومنا پڑتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ انہیں نیو قلعہ بازئی میں دیکھا تھا۔ ایک بار تو بیگم جان نے مجھ سے ایک بکری خریدنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سودا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ میری بکری کی بہت ہی کم قیمت لگا رہی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے' دشمنی کا تعلق نیو قلعہ بازئی سے ہو سکتا ہے۔''

ابراہیم خان نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ ان تینوں کو باقاعدہ قتل کرنے کے بعد مکان سمیت نذر آتش کیا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ مگر یہ سنگین واردات کون کر سکتا ہے؟''

''یہ جاننے کے لیے آپ کو اپنی تفتیش کا دائرہ ذرا اور وسیع کرنا ہوگا ملک صاحب۔'' ابراہیم خان نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے' منظاری سے نیو قلعہ بازئی کی جانب۔''

''میں آپ کا مطلب بخوبی سمجھ رہا ہوں خان صاحب۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''ارادہ نیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں پہلی فرصت میں نیو قلعہ بازئی کا رخ کرنا پسند کروں گا۔'' پھر میں نے افسر خان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ اور افسر خان! تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

''جو حکم صاحب کا'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

اے ایس آئی گل زمان جو تھوڑی دیر پہلے بیٹھک سے اٹھ کر باہر گیا تھا' واپس اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اس کے ساتھ ایک مقامی دیہاتی بھی نظر آ رہا تھا جس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ پندرہ سولہ سال کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔

اے ایس آئی نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ''ملک صاحب! ایک اہم خبر ہے۔''

''وہ کیا بھئی؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''یہ ملک یار خان ہے۔'' اے ایس آئی نے نوجوان کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا ''اہم خبر اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوئی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''کل شام کے وقت دو اجنبی مسافروں نے ملک یار سے بیگم جان کے گھر کے بارے میں تصدیق کی تھی جناب۔''

''اوہ' یہ تو واقعی بڑی سنسنی خیز خبر ہے۔'' ابراہیم خان نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''دو اجنبی مسافر..... بیگم جان.....؟''

میں نے ملک یار خان نامی نوجوان سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ' کل شام کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

ایک لمحے کے توقف سے ملک یار نے بتایا۔ ''میں کل شام بیگم جان کے گھر کے نزدیک سے گزر رہا تھا تو میں نے وہاں دو اجنبی افراد کو کھڑے دیکھا۔ ان کے چہرے پر مجھے الجھن نظر آئی تو میں ان کے قریب چلا گیا اور ان سے ان کی پریشانی کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بیگم جان کے گھر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا' کیا یہ صابرہ کا گھر ہے؟ میں نے کہا' نہیں یہ صابرہ کا نہیں بلکہ بیگم جان کا گھر ہے۔ ان میں سے ایک جلدی سے بولا۔ ''ہاں ہاں' ہم بیگم جان کے بارے میں ہی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بہت دور سے اسے ملنے آئے ہیں۔ میں نے کہا' اگر آپ بیگم جان کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں تو وہ یہی گھر ہے۔ اس پر انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت میں بہت جلدی میں تھا اس لیے ان اجنبی افراد کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور اپنے گھر آ گیا۔''

''صابرہ..... بیگم جان۔'' میرے ذہن میں انہی دو الفاظ کی تکرار ہو رہی تھی۔ ملک یار خان کی بات ختم ہوئی تو میں نے افسر خان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''افسر خان! تم بیگم جان کو نیو قلعہ بازئی کی رہائشی کے طور پر بھی پہچانتے ہو۔ کیا وہاں کے لوگ بیگم جان کو صابرہ کے نام سے جانتے تھے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' وہ وہاں بھی بیگم جان ہی تھی۔''

''پھر اجنبی مسافروں نے ''صابرہ'' کا ذکر کیوں کیا!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

ابراہیم جان نے کہا۔ ''ممکن ہے' غلطی سے ان کے منہ سے بیگم جان کے بجائے صابرہ نکل گیا ہو!''

میں نے ابراہیم خان کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے براہِ راست ملک یار خان سے سوال کیا۔ ''ملک یار! کیا تم مجھے ان دو افراد کے حلیے بتا سکتے ہو جو کل شام تم نے بیگم جان کے گھر کے پاس کھڑے دیکھے تھے؟''

وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے' میں نے دو تین منٹ ان سے بات چیت کی تھی اور نظر بھر کر ان کا جائزہ بھی لیا تھا اس لیے ان کا حلیہ بیان کر سکتا ہوں۔'' وہ چند لمحات

کے لیے سانس لینے کو رکا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ ''ان میں سے ایک دراز قامت تھا۔ قد لگ بھگ ساڑھے چھ فٹ' عمر ستائیس سال کے قریب' رنگ گورا' چہرہ لمبوترا' باریک مونچھیں اور جسم صحت مند۔ اس نے اپنا نام کبیر خان بتایا تھا۔''

میں اپنی جیبی ڈائری میں تفصیل درج کر رہا تھا۔ یار خان نے جملہ مکمل کیا تو میں نے پوچھا۔ ''اور دوسرا اجنبی مسافر کیسا تھا؟''

''دوسرے نے اپنا نام اشرف خان بتایا تھا۔'' ملک یار خان نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ سانولی رنگ اور پستہ قامت کا مالک تھا۔ چہرہ گول جس پر گھنی داڑھی مونچھیں' جسم موٹا' عمر کم و بیش تیس سال اور..... اور اس کے چہرے کی سب سے واضح شناخت یہ ہے کہ وہ ایک آنکھ سے کانا تھا۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بیان سے لگتا ہے کہ تم نے دو تین منٹ میں ہی ان کا مکمل ایکسرے کر لیا تھا۔''

''میں اسے اپنے لیے تعریف سمجھوں گا۔'' ملک یار خان نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ اس میں میری قوتِ مشاہدہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ پورا گاؤں میری اس صلاحیت سے واقف ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے اس نے حاضرینِ محفل کی طرف تصدیقی نظر سے دیکھا اور اسے مثبت ردِعمل موصول ہوا۔ میں نے تہ دل سے اس کی صلاحیت کو سراہتے ہوئے کہا۔

''ملک یار خان! میں تمہارے اس رضا کارانہ تعاون کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

وہ اپنی عزت افزائی کو نظر انداز کرتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ''ایک بات تو میں بھول ہی گیا تھا تھانے دار صاحب۔''

''وہ کیا بات ہے یار خان؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''میں نے ان دونوں سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔''

''پھر انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

''نیو قلعہ بازئی سے۔'' ابراہیم خان اچانک بول اٹھا ''یہی بتایا تھا نا انہوں نے..... ملک یار خان؟''

اپنی بات ختم کر کے اس نے اشتیاق آمیز سوالیہ نظر سے نوجوان یار خان کو دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے متحمل لہجے میں گویا ہوا۔

''نہیں خان صاحب! انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کلی کمال زئی (KILLI KAMAL ZAI) سے آئے۔''

یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ اس سے پہلے میں معلوم کر چکا تھا کہ منظاری آنے سے قبل بیگم جان وزری نیو قلعہ بازئی میں رہتی تھیں۔ کلی کمال زئی سے مہمانوں کی آمد کا مطلب یہ تھا کہ بیگم جان کے کچھ رشتے دار وہاں رہتے ہوں گے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جب سے بیگم جان نے منظاری میں رہائش اختیار کی تھی' کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس پس منظر میں گزشتہ روز دو اجنبی مسافروں کا بیگم جان کے گھر آنا بہت اہم ہو جاتا تھا اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ دوسری صبح بیگم جان اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوگئی تھی..... اور ان پر دیکھے مسافروں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس اندوہناک سانحے میں ان اجنبی مسافروں کا ہاتھ ہوسکتا تھا۔ اسی سلسلے میں مجھے تصدیق کرنا تھی۔

میں نے ابراہیم خان سے پوچھا۔ ''آپ کا خاندان تو سال ہا سال سے منظاری میں آباد ہے اور آپ آس پاس کے علاقوں کی بھی خاصی خبر رکھتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے' اجنبی مسافروں کبیر خان اور اشرف خان نے کسی غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا؟''

''ایسا ممکن ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''مجھے تو ان کے نام بھی فرضی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرا اکثر کلی کمال زئی آنا جانا رہتا ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے کم و بیش ہر فرد سے میں واقف ہوں۔ میری معلومات کے مطابق وہاں کوئی ایک آنکھ سے محروم شخص نہیں پایا جاتا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا بیان قابل غور ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں کلی کمال زئی کے بجائے کسی اور علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنا کام کرتے ہی رفو چکر ہوگئے۔''

''واقعاتی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہرے قتل اور آتش زدگی کے واقعے میں دونوں پوری طرح ملوث ہیں۔'' ابراہیم خان نے کہا۔ ''چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کبیر خان واشرف خان فرضی نام ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب! آپ کی بات میں وزن ہے مگر ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''کون سی بات ملک صاحب؟'' ابراہیم خان نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''قتل کا محرک!''

''قتل کا سبب کوئی دیرینہ دشمنی ہوسکتا ہے!''

''ہاں' ہوتو سکتا ہے۔'' میں نے تائید کی پھر کہا۔ ''اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ بیگم جان اور اس کے لواحقین کو کسی پرانی چپقلش کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیگم جان نے اپنے دشمنوں کو گھر میں کیوں گھسنے دیا۔ وہ دونوں شام کے وقت بیگم جان کے گھر کے سامنے دیکھے گئے تھے۔ آتش زدگی والا واقعہ دوسری صبح لوگوں کے علم میں آیا۔ اس کا مطلب ہے' وہ دونوں لگ بھگ پوری رات بیگم جان کے ''مہمان'' بنے رہے۔ پہلے ان تینوں کو قتل کیا پھر مکان کو نذر آتش کر کے اڑان چھو ہوگئے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ بیگم جان نے ان اجنبی جان کے دشمنوں کے خلاف کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کیوں نہیں کیا۔'' ایک لمحے کو میں سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بیگم جان کے لیے وہ دونوں اجنبی نہیں تھے لہٰذا وہ ان کی طرف سے بے فکر تھی۔''

ابراہیم خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''یہاں میں آپ کی بات سے تھوڑا اختلاف کروں گا ملک صاحب!'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''اس بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ بیگم جان ان دونوں کی جانب سے بے فکر تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ انہیں اچھی طرح جانتی بھی ہو۔ دراصل ہماری پشتون روایات بڑی انوکھی قسم کی ہوتی ہیں ہم مسافروں کو مہمان کا درجہ دیتے ہیں اور جسے اپنے یہاں پناہ دے دیتے ہیں پھر اس کی طرف سے ہمارا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے۔ آپ نے ہماری مہمان نوازی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہوگا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''البتہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دونوں مسافر بیگم جان کے لیے یا تو بالکل اجنبی رہے ہوں گے یا پھر ان کا شمار دوستوں میں ہوتا ہوگا ورنہ وہ کسی دشمن کو یوں چپ چپاتے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیتی۔''

''آپ کی اس وضاحت کے بعد میں بھی ایک خیال ظاہر کروں گا۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''اور وہ یہ کہ ان دونوں کا شمار بیگم جان کے دوستوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ دوست' دوستوں کے لیے اپنی گردن کٹوا تو سکتے ہیں مگر ان کے سینے میں خنجر گھونپ کر انہیں اس طرح جلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ابراہیم نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''ان اجنبی مسافروں نے بہت بڑا ظلم کیا ہے جو کسی شقی القلب دشمن ہی کا کام ہوسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال کو آپ کے بیان سے بھی تقویت ملتی ہے۔'' اس نے چونک کر

سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ کلی کمال زئی میں کوئی کا ناشخص نہیں رہتا۔ گویا یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ان کے نام کبیر خان واشرف خان تھے اور نہ ہی ان کا تعلق کلی کمال زئی سے تھا۔''

''آپ بالکل صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں۔'' ابراہیم خان نے کہا۔

''لیکن اس کے باوجود بھی میں کلی کمال زئی سے ان کے بارے میں ضرور معلوم کرواؤں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

ابراہیم نے جلدی سے کہا۔ ''یہ سراسر قانونی معاملہ ہے اور آپ ہی اسے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ میں تو صرف اپنے معاملے کا خیال رکھ سکتا ہوں..... اور میرا معاملہ بالکل تیار ہے۔''

آخری جملہ اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔

''آپ کا معاملہ؟'' میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''جی ہاں' خالصتاً میرا معاملہ۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میرے لہجے میں الجھن تھی۔

ابراہیم خان نے وضاحت کی۔ ''لذتِ کام و دہن..... دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے ملک صاحب!''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے خان صاحب! اس وقت ہم ڈیوٹی پر ہیں۔''

''یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ آج آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں بلکہ آپ تو ہمارے صوبے میں بھی بالکل نئے ہیں۔ کھانے کے وقت پر آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں۔ یہ پشتون روایات کے منافی ہوگا۔'

ابراہیم خان نے اتنی محبت اور خلوص سے کھانے کی دعوت دی تھی کہ میں نے اس کے روایتی خلوص کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا۔

اسی وقت ابراہیم خان نے میرے اور اے ایس آئی گل زمان کے سوا تمام افراد کو وہاں سے رخصت کر دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں تو خود آپ کے پاس تھانے حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن اس واقعے نے آپ کو میرے ڈیرے تک پہنچا دیا۔''

''چلیں جیسے بھی سہی' ہماری ملاقات تو ہوگئی۔'' میں نے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ سجاتے

ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ جناب! ہماری ملاقات تو پچھلے مہینے ہی ہو جاتی لیکن میرے شوق نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی اور بعد میں پھر میں خاصا مصروف رہا اس لیے حاضری نہ دے سکا۔''

بات ختم کر کے وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلانے لگا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''خان صاحب! آپ نے ایسا کون سا شوق پال رکھا ہے جو آپ کے پاؤں کی زنجیر بھی بن جاتا ہے؟''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''جناب! شوق جو کوئی بھی ہو' جی کا جنجال اور جان کا وبال ہوتا ہے۔ اچھا خاصا مستعد آدمی شوق کے ہاتھوں ایک جگہ جم کر رہ جاتا ہے۔''

اس کی باتوں نے جذبہ تجسس کو بھڑکایا' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''ایسا کیا شوق ہے آپ کو؟''

''کرکٹ!'' ابراہیم خان نے بتایا۔

''کرکٹ۔'' میں نے غیر ارادی طور پر اس کے جواب کو دہرایا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ اس عمر میں کرکٹ کھیلتے ہیں خان صاحب؟''

''کھیلتا نہیں' صرف سنتا ہوں' ریڈیو پر۔ کبھی کبھار موقع ملے تو اسٹیڈیم جا کر دیکھتا ہوں۔''

''اوہ' اچھا۔'' میں نے مختصراً کہا۔

وہ بولا۔ ''خاص طور پر جب پاکستان کھیل رہا تو میں پورا میچ توجہ سے سنتا ہوں۔''

میں نے استعجابیہ نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے مزے لے لے کر بتایا۔ ''جن دنوں یہاں آپ کی تعیناتی ہوئی' پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان میچوں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے وہ تمام میچ ریڈیو پر سنے ہیں۔'' اس کا لہجہ خاصا انکشاف انگیز تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں پنجاب سے بلوچستان آنے کی تیاری کر رہا تھا' ان دنوں پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان پہلا ٹیسٹ میچ..... یعنی اس دورے کا پہلا ٹیسٹ میچ کراچی میں کھیلا جا رہا تھا۔ مذکورہ ٹیسٹ میچ پاکستان نے نیوزی لینڈ کے خلاف ایک اننگز اور ایک دن کی برتری سے جیت لیا تھا۔

ابراہیم خان نے ہمارے لیے اچھی خاصی ضیافت کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ کھانا بے انتہا لذیذ اور اشتہا انگیز تھا۔ ہم نے شکم سیر ہو کر کھایا اور ازاں بعد اونٹوں پر سوار ہو کر واپس تھانے آ گئے۔

دوسرے روز میں نے اے ایس آئی گل زمان کو دو کانسٹیبلو کے ہم راہ کلی کمال زئی روانہ کر دیا۔ یہ اہتمام حجت تھا۔ میں نے دونوں اجنبی مشکوک مسافروں کا حلیہ اور ان کے بارے میں دیگر تمام تفصیلات گل زمان کو ذہن نشین کروادی تھیں۔ اگرچہ مجھے کامیابی کی زیادہ امید نہیں تھی تاہم یہ کارروائی میرے فرائض کا حصہ تھی۔

اے ایس آئی کی کلی کمال زئی روانگی کے بعد میں نے افسر خان کو ساتھ لیا اور مقتول بیگم جان کے بارے میں میں چھان بین کرنے اس کی سابق رہائش واقع نیو قلعہ بازئی کی طرف چل پڑا۔ ہم دونوں الگ الگ اونٹوں پر سوار تھے۔ صحرائی سواری کا مجھے پہلے تجربہ نہیں تھا۔ چند مرتبہ صحرائی جہاز (اونٹ) پر بیٹھنے کا موقع تو ملا تھا تاہم باقاعدہ سواری کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ الغرض، اونٹ کی سواری میرے لیے خاصی خوشگوار تجربہ ثابت ہوئی تھی۔

ہمارا دو افراد کا مختصر سا قافلہ افسر خان کی رہنمائی میں سیدھا اس گھر کے سامنے جار کا جہاں لگ بھگ ایک سال قبل مقبول بیگم جان اور اس کی بیٹی زری رہتی تھی۔ افسر خان بھیڑ بکریوں اور دیگر جانوروں کی خرید وفروخت کے سلسلے میں کئی مرتبہ نیو قلعہ بازئی آچکا تھا۔ اس گاؤں کی آبادی بھی زیادہ نہیں تھی۔

میرے استفسار پر افسر خان نے بتایا۔ ”اب اس گھر میں مراد خان نامی ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے کنبے کے ساتھ رہتا ہے۔“

”چلو، دروازے پر دستک دو۔“ میں نے اونٹ سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ ”مراد خان سے بھی دو باتیں ہو جائیں۔“

افسر خان نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ مراد خان کے دروازے کی طرف جانے سے پہلے اس نے دونوں اونٹوں کو کھجور کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

تیسری دستک پر ایک دبلا پتلا سا شخص دروازے میں نمودار ہوا۔ ازاں بعد معلوم ہوا کہ وہی مراد خان تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے مراد خان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ تم سے ایک اہم معاملے میں پوچھ گچھ کرنا ہے۔ تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟“

”پولیس کے حوالے پر وہ تھوڑا سا بدحواس ہوا تاہم یہ بدحواسی مجرموں والی نہیں بلکہ سیدھے سادے لوگوں والی تھی جو پولیس کچہری کے ذکر پر ہی اُدھ موئے ہو جاتے ہیں۔ میں نے

اپنے لہجے میں حتی الامکان نرمی سمونے کی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مراد خان ہراساں ہونے کے بجائے سنبھل گیا اور ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے گھر کے اندر غائب ہو گیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم مراد کے گھر کے اندر ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میری خاطر مدارات کے لیے خاصا بے قرار نظر آتا تھا لیکن میں نے واضح الفاظ میں اسے منع کر دیا۔

”کسی قسم کے تکلف کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے جو کچھ پوچھوں اس کا سیدھا اور سچا جواب دینا۔ اگر تم نے تعاون کیا تو تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ بصورت دیگر تمہیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ پولیس کے ہاتھ کتنے لمبے اور اختیارات کتنے وسیع ہوتے ہیں؟“

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں تھانے دار صاحب۔ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے؟“

میں نے پوچھا۔ ”مراد خان! تم کتنے عرصے سے نیو قلعہ بازئی میں رہ رہے ہو؟“

”بہت عرصہ ہو گیا جناب۔“ وہ پرسوچ لہجے میں گویا ہوا۔ ”میرا باپ، دادا، پردادا...... سب یہیں رہتے آئے ہیں۔“

”تو یوں کہو نا، یہ تمہارا آبائی گاؤں ہے!“

وہ اثبات میں گردن ہلا کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔ ”تمہیں اس گھر میں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”تقریباً ایک سال“ اس نے جواب دیا۔

”یہ گھر تم نے کس سے خریدا ہے؟“

”بیگم جان سے۔“

”بیگم جان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“

”جتنا بھی جانتے ہو، بیان کرو۔“

وہ بولا۔ بیگم جان لگ بھگ نو سال پہلے اچانک ہمارے گاؤں میں وارد ہوئی تھی۔ کچھ ہی دن بعد اس نے یہ مکان خرید لیا اور اپنی بیٹی زری کے ساتھ یہاں رہنے لگی۔“ پھر وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا اور بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ”بس، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔“

میں نے پوچھا۔ ''مراد خان! نیو قلعہ بازئی آنے سے پہلے بیگم جان کہاں رہتی تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس کا لہجہ قطعی تھا۔

''تمہارے ہاتھ اپنا مکان بیچنے کے بعد وہ کہاں گئی تھی؟''

''مجھے کچھ خبر نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''بیگم جان اس گاؤں میں کم و بیش آٹھ سال رہی ہے۔ اس دوران میں تم نے ان ماں بیٹی کے حوالے سے کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''وہ دونوں بہت سلجھی ہوئی اور خوش اخلاق تھیں تاہم وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھیں۔'' مراد خان نے بتایا۔ ''وہ لیے دیے رہنا اور اپنے کام سے کام رکھنا پسند کرتی تھیں۔''

''ان سے کسی کی دشمنی بھی تھی؟''

''جی ہاں..... جی نہیں.....'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ایک جواب دو۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''پتہ نہیں' اسے دشمنی کہنا بھی چاہیے یا نہیں؟''

''کھل کر بتاؤ' کیا کہنا چاہتے ہو۔'' میں نے اسے گھورا۔

وہ بولا۔ ''جناب! میں خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''تم قانون کی نظر سے حقائق کو چھپا کر یقیناً بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔ اگر تم نے دروغ گوئی سے کام لیا تو میں تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا۔''

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر آپ میرا نام سامنے نہ لائیں تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ بس مجھے رستم خان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر اسے پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتایا ہے تو وہ میرا یہاں رہنا دوبھر کر دے گا۔ میں بہت کمزور ہوں جناب اور رستم خان ایک طاقتور بدمعاش ہے۔''

اپنے سیدھے پن میں مراد خان نے بہت سے انکشافات کر دیے تھے۔ میرا ذہن برق رفتار سے کام کر رہا تھا۔ رستم خان نامی غنڈے کا ذکر سنتے ہی میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا تھا کیونکہ رستم نام انگریزی حرف ''R'' سے شروع ہوتا تھا۔ برہنہ عورت کی مورتی والا وہ چاپیوں کا گچھا رستم خان کا بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں نے مراد کو راز داری برتنے کا یقین دلا دیا اور اسے تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تو وہ مجھے بہت سی اہم باتیں بتا دے گا۔ میں نے اس کی نفسیات کے پیش نظر نرم اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''مراد خان! تم اس وقت قانون کے محافظ اور اپنے علاقے کے سب سے زیادہ طاقتور شخص تھانے دار ملک صفدر حیات سے بات کر رہے ہو۔ رستم خان جیسے لچوں لفنگوں کو میں اپنے بوٹ کی نوک پر رکھتا ہوں لہٰذا قانون کی مدد کرتے ہوئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے ذرا توقف کر کے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ہماری ذات تک ہی محدود رہے گی۔ تمہارا نام میں پوشیدہ رکھوں گا اس لیے تم رستم خان کے بارے میں مجھے ایک ایک بات بتا دو۔''

اس نے بولنے سے پہلے ہچکچاہٹ آمیز نظر سے افسر خان کو دیکھا۔ میں اس کی نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''یہ اپنا ہی آدمی ہے مراد خان۔ اس سے کوئی پردہ نہیں۔''

''مگر یہ تو.....؟''

اس نے تفکر انگیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے مصلحت کے پیش نظر وضاحت کر دی۔ ''ہاں' افسر خان جانوروں کی خرید و فروخت کے پیشے سے وابستہ ہے لیکن در پردہ یہ پولیس کے لیے مخبری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''ویسے تمہاری تسلی کے لیے میں افسر خان کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے افسر خان کو باہر جانے کا اشارہ بھی کر دیا۔ میرے اس عمل سے مراد خان مطمئن نظر آنے لگا۔ افسر خان کے جانے کے بعد میں مراد خان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ہاں مراد خان!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم رستم خان کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟''

میرے سوال کے جواب میں مراد خان نے رستم خان کے بارے میں مجھے بتایا کہ رستم خان دو ڈھائی سال قبل نیو قلعہ بازئی آیا تھا۔ وہ گاؤں کے آخر میں ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ رستم خان کہاں سے آیا تھا اور اس کے خاندان کے باقی افراد کہاں تھے تاہم اس کے چال چلن اور حرکتوں سے سبھی واقف تھے۔ رستم خان کی شہرت ایک غنڈے اور بدمعاش کے طور پر تھی اور اس کا میل تال بھی اپنے ہی قبیل کے لوگوں سے تھا۔ گاؤں کا کوئی بھی شریف شخص رستم خان کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا۔

مراد خان خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''رستم خان کے بارے میں تو تم نے بتا دیا لیکن

بیگم جان سے اس کی کیا دشمنی تھی' اس بات کا تذکرہ نہیں کیا؟''

وہ بولا۔ ''میں نے عرض کیا ہے نا' میں نہیں جانتا اسے دشمنی کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔''

''تم اصل بات بتاؤ۔'' میں نے اسے کریدا۔ ''دوستی اور دشمنی کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔''

''جناب! سننے میں آیا ہے..... بلکہ یہ حقیقت ہے کہ رستم خان بیگم جان کی بیٹی زری کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہاں تھا مگر بیگم جان کو وہ داماد کی حیثیت میں قبول نہیں تھا۔'' مراد خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ایک بیگم جان ہی کیا' کوئی بھی شریف آدمی رستم خان جیسے آوارہ شخص کو اپنی فرزندی میں لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''اور زری کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''زری کے بارے میں.....!''

اس نے ادھورا جملہ بول کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔

''ہاں' زری کے بارے میں۔ کیا وہ بھی رستم خان کو ناپسند کرتی تھی یا.....''

اس مرتبہ میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا دیا۔ مراد نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔

''زری تو اسے سخت ناپسند کرتی تھی جناب! بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ رستم خان سے نفرت کرتی تھی۔ رستم خان نے دو تین مرتبہ زری کا راستہ روکنے کی بھی کوشش کی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''بیگم جان کے صاف انکار کے بعد رستم خان کا ردِعمل کیا تھا؟''

''اس نے غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔'' مراد خان نے بتایا۔ ''بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں بیگم جان کو دھمکیاں بھی دی تھیں۔''

میں نے قیاس کا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اور بیگم جان نے نہایت ہی راز داری اور خاموشی کے ساتھ اپنا مکان تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ شدتِ حیرت سے منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا پھر لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ''آ..... پ..... کو یہ باتیں..... کیسے پتہ چلیں؟''

''قانون سب جانتا ہے..... سب کچھ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''کیوں' ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

وہ اثبات میں سر جھٹکتے ہوئے گویا ہوا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' پھر تفصیل بیان کرنے لگا۔

''بیگم جان زری کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ رستم خان کی دھمکیاں ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت پکڑتی جارہی تھیں۔ بیگم جان کی پہلی کوشش تو یہی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے لیکن اس کوشش میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ رستم تو جیسے ہاتھ دھو کر زری کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ناچار بیگم جان نے چپ چپاتے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اس نے میرے ہاتھ مکان بیچنے کی جب بات کی تو ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ میں اس سودے کو خفیہ رکھوں۔ میں اس کی مجبوری اور نازک پوزیشن کو بخوبی سمجھتا تھا چنانچہ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ بے فکر ہو جائے۔ کسی کو اس کی رخصتی کی خبر نہیں ہوگی۔ بیگم جان نے سامان سمیت اپنا گھر بیچا تھا۔ میں نے جو دام لگائے اس نے منظور کر لیے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے بہت کم قیمت میں اس کا مکان مع سامان خرید لیا تھا مگر خدا گواہ ہے' اس میں میری بدنیتی شامل نہیں تھی۔ میں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس وقت میرے پاس اس سے زیادہ رقم تھی ہی نہیں۔''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا اور متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ کوئی خاص بات کرنا چاہ رہا ہوں مگر ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔

میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے مراد خان؟''

''میں آپ سے ایک بات کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''کیسی معذرت؟ کون سی بات؟''

اس نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ ''میں نے شروع میں آپ سے ایک جھوٹ بولا تھا' اس کی معذرت..... مگر یقین کریں' اس دورغ گوئی کے پیچھے میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا بلکہ میں نے اس کے لیے بیگم جان سے وعدہ کر رکھا تھا۔''

میں نے حوصلہ افزائی کے انداز میں کہا۔ ''گھمانے پھرانے کے بجائے دوٹوک انداز میں بتاؤ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ مجھے کچھ معلوم' بیگم جان یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کہاں گئی تھی۔ یہی میرا جھوٹ تھا..... اور یہ جھوٹ میں نے اس لیے بولا تھا کہ میں نے بیگم جان سے وعدہ کیا تھا' ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں بیگم جان کی نئی رہائش کا علم تھا؟'' میں نے اس کے

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اقراری انداز میں سر کو جنبش دی۔ ''بیگم جان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں سے سیدھی اپنی بہن کے پاس کوئٹہ جائے گی۔ بیگم جان کے مطابق' کوئٹہ میں ماہان نامی اس کی بہن رہتی تھی۔ وہ مستقل طور پر ماہان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی کیونکہ ماہان کو بیگم جان کی مدد کی اشد ضرورت تھی۔ خوفناک زلزلے نے ماہان کے گھر اور بچوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ گھر کے ملبے کے نیچے دب کر ماہان کا شوہر ہلاک ہو گیا تھا۔ ماہان خود بھی شدید زخمی ہوئی تھی۔ بیگم جان نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اسے فوراً بہن کی مدد کے لیے کوئٹہ روانہ ہو جانا چاہیے۔ شاید قدرت نے رستم خان سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔''

''کوئٹہ'' اور ''زلزلہ'' کے ذکر پر وہ خبر میرے ذہن میں تازہ ہو گئی جو میں نے ضلع جھنگ میں تعیناتی کے دوران میں اپنے سرکاری کوارٹر میں ریڈیو پر سنی تھی۔ وہ فروری پچپن عیسوی کی کوئی تاریخ تھی۔ غالباً اٹھارہ یا انیس۔ کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا تھا۔ مسلسل بارہ گھنٹے تک کوئٹہ شدید جھٹکوں کی زد پر رہا تھا۔ اس قدرتی آفت میں سینکڑوں مکانات منہدم ہوئے اور کئی سو افراد نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ زلزلے کے اختتام پر کوئٹہ ایک تباہ حال شہر کا منظر پیش کر رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ میں نے مراد خان سے پوچھا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ بیگم جان کی کوئٹہ روانگی کو تم نے راز رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تم خود ہی مجھے اس بارے میں بتا رہے ہو۔ اس عہد شکنی کی وجہ کیا ہے؟''

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میری خفیہ حس مجھے کسی خطرے کا اشارہ دے رہی ہے۔'' مراد خان نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سب ٹھیک نہ ہو۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے اس گڑبڑ کا تعلق یقیناً بیگم جان سے ہے۔ خدانخواستہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے' بیگم جان کو کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ کئی روز سے رستم خان بھی گاؤں میں نظر نہیں آ رہا۔ خدا خیر کرے۔'' وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے دعائیہ انداز میں بولا پھر کہا۔ ایسی نازک صورت میں قانون کے ساتھ تعاون کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ آپ میرے دروازے تک پہنچے ہیں اور بیگم جان سے متعلق کرید کرید کر پوچھ رہے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے..... میرے اندر کی آواز بھی یہی ہے کہ بیگم جان کسی مصیبت سے دوچار ہے۔''

میں نے مراد خان کو صورت حالات سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہ جانا پوری بات سننے کے بعد وہ تھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مم..... مگر وہ تو کوئٹہ گئی تھی..... آپ بتا رہے ہیں.....

وہ منظاری کے ایک گھر میں.....'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا!''

میں نے اس کی الجھن زدہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''مراد خان! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا ہے کہ رستم خان کافی دنوں سے غائب ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ' وہ کب سے دکھائی نہیں دیا؟''

وہ انگلیوں پر حساب کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو ایک ہفتے سے اسے نہیں دیکھا۔''

''رستم خان کا حلیہ بتاؤ؟''

مراد خان نے رستم خان کا جو حلیہ بیان کیا وہ کبیر خان یا اشرف خان کے حلیے سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ رستم کا قد میانہ' جسم متناسب' عمر پچیس کے لگ بھگ' بال گھنگریالے' دائیں گال پر مسا اور بائیں پاؤں میں لنگ تھا۔ یہ ایک واضح حلیہ تھا۔ اس تجزیے سے میں ایک نتیجے پر پہنچا..... اگر بیگم جان' زری اور امیر گل کے قتل میں رستم خان کا ہاتھ تھا تو پھر اس نے یہ کام کرائے کے قاتلوں یعنی اجنبی مشکوک مسافروں کبیر خان و اشرف خان سے کروایا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنی جیب سے برہنہ عورت کی مورتی والا چابیوں کا گچھا نکالا اور مراد خان کو دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟''

بغور گچھے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''پہلے اسے کہیں دیکھا؟''

''جی نہیں۔''

''اس گچھے کو دیکھ کر رستم خان کے حوالے سے ذہن میں کوئی بات آ رہی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ قطعیت سے بولا۔ ''بالکل نہیں جناب! میں نے چابیوں کے اس گچھے کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا۔ ''کیا اس گچھے کا رستم خان سے کوئی تعلق ہے؟''

''رستم خان سے تعلق ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''البتہ بیگم جان کو پیش آنے والے واقعے سے اس گچھے کا گہرا تعلق ہے۔ یہ گچھا ہمیں بیگم جان کے سوختہ مکان واقع منظاری سے ملا تھا۔''

''اوہ!'' مراد خان نے طویل سانس خارج کیا۔

میں چند لمحات تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس سوچ میں دیگر سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی موجود تھا کہ بیگم جان نے کوئٹہ جانے کے حوالے سے مراد خان سے غلط بیانی کیوں کی تھی۔ اس کی دو وجوہ سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ممکن تھا' وہ پہلے کوئٹہ ہی گئی ہو اور ازاں بعد کسی سبب منظاری میں آن بسی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ بیگم جان نے دانستہ مراد خان کو اپنے پروگرام سے آگاہ نہیں کیا ہوگا۔ وہ نہیں چاہتی ہوگی کہ کسی کو اس کی نئی رہائش کے بارے میں معلوم ہو۔

میں نے اچانک مراد خان سے پوچھا۔ ''یہ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رستم خان واپس کب آئے گا؟''

''میں تو اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''اس خبیث کے بارے میں کوئی بھی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ وہ پورا شیطان ہے۔ اچانک غائب ہو جاتا ہے اور ایسے ہی کسی روز چپ چپاتے ظاہر ہو کر نظر آنے لگتا ہے پھر کئی روز تک گاؤں ہی میں رہتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''گاؤں میں اس کا زیادہ میل تال کس کے ساتھ ہے؟''

''اس کے قماش کا یہاں ایک ہی شخص ہے۔'' مراد خان نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ ''اس شخص کا نام ہے' فلک شیر خان!''

''فلک شیر خان!'' میں نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔ ''فلک شیر کا گھر ٹھکانا کس طرف ہے؟''

''گاؤں کے وسط میں۔'' مراد خان نے جواب دیا۔ ''آپ کسی سے بھی پوچھیں گے تو پتہ چل جائے گا۔ ویسے تو میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں لیکن.....''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا مدعا جان لیا۔ میں نے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں کسی گمبھیر معاملے میں ملوث نہیں کریں گے۔ تم نے قانون کے ساتھ جو تعاون کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے لیکن ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا مراد خان!'' میں نے خاموش ہو کر تنبیہی نظر سے اسے گھورا اور کہا۔ ''اگر کسی مرحلے پر یہ ثابت ہوا کہ تم نے مجھ سے معاملے میں غلط بیانی کی ہے تو سمجھ لو پھر خیر نہیں ہوگی۔''

''خدا گواہ ہے تھانے دار صاحب' میں نے آپ کو ایک بھی بات غلط نہیں بتائی۔'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ چاہیں تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے سکتے ہیں۔''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''قسم کی ضرورت نہیں مراد خان البتہ وقت خود دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا..... اور اگر تمہارے فراہم کردہ دودھ میں پانی کا ایک قطرہ بھی ثابت ہوا تو اس ملاوٹ کی سزا تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھگتنا ہوگی۔''

''مجھے امید ہے' ایسا دن کبھی نہیں آئے گا۔'' وہ تیقن سے بولا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے کہا اور افسر خان کو پاس بلا لیا۔

پھر ہم مراد خان سے فلک شیر خان کے گھر کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ کر اس کے گھر سے باہر نکل آئے۔ ہم چند قدم آگے بڑھے تو افسر خان نے کہا۔

''ملک صاحب! نیو قلعہ بازئی کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں پھر میں اکثر یہاں آتا بھی رہتا ہوں۔ فلک شیر کا گھر تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' تم آگے آگے چلو۔''

کچھ ہی دیر کے بعد ہم فلک شیر کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہراساں ہوگئی اس کی سراسیمگی کی وجہ جلد ہی میری سمجھ میں آ گئی۔ میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا۔ ظاہر ہے' پولیس کو اپنے دروازے پر دیکھ کر کوئی بھی شریف آدمی خوف زدہ ہو سکتا ہے تاہم اس ادھیڑ عمر عورت کے بارے میں ازاں بعد ذرا مختلف انکشاف ہوا۔ اس کی گھبراہٹ بے معنی نہیں تھی۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ عورت دروازہ بند کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنی خواہش پر عمل کر پاتی' میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے پٹ میں اپنی ٹانگ پھنسا دی۔ اس طرح میرا ایک پاؤں گھر کے اندر تھا اور دونوں ہاتھ دروازے کے دونوں پٹوں پر۔

میں نے اس عورت کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ''فلک شیر خان کہاں ہے؟''

''وہ گھر میں نہیں ہے۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''کہاں گیا ہوا ہے۔''

''وہ بتا کر کہیں نہیں جاتا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''واپس کب تک آئے گا؟''

''یہ بھی اسی کو معلوم ہوگا!'' وہ بے اعتنائی سے بولی۔

''تمہیں کیا معلوم ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ کب گھر سے نکلا تھا' یہ تو تم جانتی ہی ہوگی۔ کیوں؟''

''وہ..... وہ..... صبح ہی.....''

اس کی بات مکمل ہونے سے پیشتر ہی گھر کے اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری ”ماں‘ کون ہے دروازے پر؟“

”پپ...... پولیس!“ اس عورت نے بے ساختہ کہا اور اندر کی جانب دوڑی۔

ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گھر میں داخل ہوگئے۔ جلد ہی اس شخص سے ہمارا آمنا سامنا ہوگیا جس نے ہراساں عورت کو ”ماں“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ سینتیس اڑتیس سال کا ایک کڑیل جوان تھا۔ چہرے پر کنگ سائز مونچھیں بھلی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا تاہم جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ میرے گھر میں بلا اجازت کیسے گھس آئے ہیں؟“

”ایسے!“ میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تم ہی فلک شیر ہو؟“

”ہاں“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”تم ہی سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے کہا پھر اپنا تعارف کروانے کے بعد اضافہ کیا۔ ”میں تم سے رستم خان کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ...... رستم خان“ فلک شیر نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟“

میں گفتگو کے دوران میں فلک شیر کو اپنی نگاہ میں تول رہا تھا اور اس کا موازنہ رستم خان‘ کبیر خان اور اشرف خان سے کر رہا تھا مگر وہ ان تینوں اشخاص کے حلیے سے مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر رستم خان نے ہی کبیر خان و اشرف خان کے ذریعے بیگم جان اور اس کے کنبے کو دردناک موت سے دوچار کیا تھا تو فلک شیر اس مذموم کارروائی میں ملوث نہیں تھا۔

میں نے فلک شیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”پوچھنا تو بہت کچھ ہے۔ کیا تمہارے گھر میں آرام سے بیٹھ کر گفتگو کرنے کی کوئی جگہ ہے؟“

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم ایک نیچی چھت والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فلک شیر کی ماں کا نام بخت آور معلوم ہوا وہ اپنے بیٹے کے لچھنوں سے بڑی حد تک واقف تھی اسی لیے پولیس کو دروازے پر دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ ہم اس کے سپوت کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ چھوٹے موٹے جرائم کے ذیل میں فلک شیر دو تین مرتبہ حوالات کی ہوا کھا چکا تھا۔

میں نے بات شروع کرنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ فلک شیر کو بیگم خان کے ساتھ پیش نے والے حادثے کے بارے میں بتا دوں۔ پوری بات سننے کے بعد وہ افسوسناک انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہ تو بہت برا ہوا جناب۔“

”اور یہ ”برا“ تمہارے لنگوٹیے یار رستم خان کا کیا دھرا ہے۔“ میں نے زہر خند لہجے میں ہیں اس کی تلاش ہے اور اس تلاش میں تم ہماری مدد کرو گے۔“

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بڑی متضاد باتیں بتائی ہیں۔ لیے اس میں سے بہت کچھ ناقابل یقین ہے۔“

”کیا ناقابل یقین ہے؟“ میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ ”اور کھل کر بتاؤ‘ کیا ...پایا جاتا ہے میری باتوں میں؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دیکھیں جناب! پہلی بات تو یہ کہ رستم خان زری سے کرتا تھا۔ وہ اسے المناک موت کے منہ میں کس طرح پھینک سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ محبت بڑا ظالم جذبہ ہے فلک شیر۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ...دار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ظرف کے حامل بھی ہوں ورنہ اکثر محبت‘ عداوت اور نفرت ...بدل جاتی ہے خاص طور پر جب کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی محبت کسی اور کو حاصل ہوگئی ...وہ محروم ہے اور کوئی دوسرا فیض یاب ہو رہا ہے۔ یک طرفہ محبت میں تو اس کے امکانات اور زیادہ ہوتے ہیں اور تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ رستم خان کی محبت یک طرفہ تھی۔ ...اسے قطعی ناپسند کرتی تھی بلکہ اسے تو رستم خان کی صورت ہی سے نفرت تھی۔ ان حالات میں ...ناکام و نامراد شخص انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتا ہے...... ...رستم خان جیسے غنڈے سے تو کچھ بھی بعید نہیں“ میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا ...ات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ بات بالکل بے وزن لگتی ہے کہ رستم خان کو زری سے ...تھی۔ محبت تو انسان کے دل میں گداز پیدا کرتی ہے‘ دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور محسوس ...نے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔ مجنوں کو تو لیلیٰ کے کتے سے بھی محبت تھی۔ پھر رستم کو زری سے یہ ...م کی محبت تھی کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بیگم جان کو خطرناک دھمکیاں دیتا تھا اور ...طرح سے ڈراتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ رستم خان زری کے حسن اور جوانی پر رال ٹپکا رہا ...نے جذبۂ ہوس کو محبت کا نام دے کر محبت کا مذاق اڑا رہا تھا۔“

میں خاموش ہوا تو فلک شیر نے کہا۔ ''میں رستم خان کی محبت یا ہوس کی وکالت یا مخالفت نہیں کروں گا تاہم ایک بات قابلِ غور ہے کہ آپ نے اجنبی مسافروں کا جو حلیہ اور نام بتائے ہیں ایسے افراد اس گاؤں میں ہیں اور نہ ہی میں نے انہیں اور کہیں دیکھا ہے۔ رستم خان کے جاننے والے تمام افراد سے میں واقف ہوں۔''

میں نے اس کی بات کو توجہ سے سنا اور کہا۔ اگر تم رستم خان کے تمام دوستوں اور دشمنوں سے واقف ہو تو پھر رستم خان سے بھی بخوبی آگاہ ہو گے؟''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ اس گاؤں میں تم رستم خان کے سب سے زیادہ قریب ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی پھر میں نے پوچھا۔ ''پھر تو تم یہ ضرور جانتے ہو گے کہ رستم خان اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ کافی دنوں سے نظر نہیں آیا۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ادھر میری آنکھوں میں دیکھو۔''

وہ چور نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے غصیلے انداز میں کہا۔ ''فلک شیر خان! اگر میں شرافت کے دائرے میں رہ کر تم سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں تو مجھے کڑک تھانے دار بننے کے لیے مجبور نہ کرو۔ پہلے تو تم حوالات کی ہوا کھا کر چھوٹ جاتے رہے ہو مگر اس مرتبہ ایسا نہیں ہو گا۔ میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔ تمہیں رستم خان کے شریکِ جرم کی حیثیت میں سیدھا جیل بھجوا دوں گا اور جانتے ہو نا تین سو دو کا معاملہ کتنا سخت ہوتا ہے پھر زندگی بھر جیل کی دیواروں کے پیچھے ''حق دوستی'' نبھاتے رہنا۔''

وہ خوف زدہ لہجے میں بولا ''جناب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی رستم کا ساتھ دیا ہے۔ آپ مجھ پر رحم کریں۔''

''کسی جرم کے بارے میں حقائق کی پردہ پوشی کرنا بھی ایک سنگین جرم ہے فلک شیر۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور تم قانون سے عدم تعاون کا مظاہرہ کر کے اس جرم کا ارتکاب کر رہے ہو۔''

وہ فوراً پٹری پر آ گیا۔ ''جناب! آپ یقین کریں کہ میں واقعی رستم کے بارے میں نہیں جانتا' وہ اس وقت کہاں ہو گا تاہم اس سلسلے میں' میں کچھ اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''چلو اندازہ ہی لگاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ فکر آمیز لہجے میں بولا۔ ''رستم خان جب بھی کافی دنوں کے لیے گاؤں سے غائب ہوتا ہے تو اس کی منزل پہاڑ خان کا ڈیرا ہی ہوتی ہے۔ ممکن ہے' وہ آج کل بھی وہیں پر ہو۔ میں بھی ایک بار اس کے ساتھ وہاں جا چکا ہوں۔''

''یہ پہاڑ خان کس سورما کا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

فلک شیر نے بتایا۔ ''اس شخص کا اصل نام تو حکمت خان ہے لیکن اپنے قد بت اور جثے کی وجہ سے پہاڑ خان مشہور ہو چکا ہے۔ وہ واقعی گوشت کے کسی پہاڑ کے مانند دکھائی دیتا ہے۔''

''پہاڑ خان کا جغرافیہ بیان کرو؟'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''جغرافیہ! یہ کیا ہوتا ہے جناب؟''

میں نے وضاحت کی ''پہاڑ کا پتہ ٹھکانا کیا ہے؟''

''اس کا ڈیرا تارا گندی (TARA GUNDI) میں ہے۔''

''شاباش'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ تم ہمیں وہاں تک پہنچاؤ گے۔''

''مم..... میں.....؟''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں ایک مرتبہ جانے کا اقرار کر چکے ہو۔ ہم تمہاری رہنمائی میں وہاں پہنچیں گے۔''

''اس طرح تو رستم خان میرا دشمن ہو جائے گا۔'' وہ..... جز بز ہو کر بولا۔

''اگر تم نے قانون کا ساتھ نہ دیا تو قانون تمہارا دشمن ہو جائے گا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قانون ہمیشہ مجرموں اور مجرموں کے دوستوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ رستم خان کے ساتھ دوستی نبھاتے ہو یا قانون کے ساتھ دشمنی کا کھاتا کھولتے ہو!''

وہ دہشت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تو مجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔''

''اب ایسی بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم رستم خان تک ہماری رہنمائی کر کے ایک نیک کام کرو گے۔ اگر تم رستم خان کو گرفتار کروانے میں ہماری مدد کرو گے تو میں تمہیں رستم کے شر سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دیتا۔ قانون پوری طرح تمہاری حفاظت کرے گا۔''

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پہاڑ خان کے ڈیرے سے کسی کو گرفتار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ اپنے علاقے کا بہت طاقتور بندہ ہے۔"

"قانون سے زیادہ طاقتور کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے پر اعتماد انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "ذرا یہ تو بتاؤ' تمہارا پہاڑ خان کرتا کیا ہے؟"

"ہر غیر قانونی کام" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "جوا' شراب' افیون چرس اور......"

"اور عورت کا دھندا؟" میں نے اس کے ادھورے جملے کو مکمل کر دیا پھر سخت لہجے میں کہا۔ "فلک شیر خان! تم ابھی پوری طرح مجھ سے واقف نہیں ہو۔ میں نے پنجاب کے گاؤں دیہاتوں میں بڑے بڑے سورماؤں کو نکیل ڈالی ہے۔ وہ ڈاکو اور لیٹرے جن کی دہشت اور وحشت سے لوگوں کے سانس خشک ہوتے تھے اور اجسام پسینہ اگلتے تھے' میں نے انہیں اپنے قدموں میں گڑگڑاتے ہوئے سنا ہے......اور رحم کی التجائیں کرتے ہوئے مشاہدہ کیا ہے۔ بڑے بڑے طرم خان چودھریوں کے شملے میں نے خاک میں رگیدے ہیں' صرف اس لیے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ غریب دیہاتیوں کی عزت و ناموس محفوظ تھی اور نہ ہی ان کی املاک و جائداد۔ میں نے ہمیشہ مظلوم کی داد رسی کی ہے...... اور ظالم کا دستِ ستم توڑا ہے۔ یہ تمہارا پہاڑ خان کیا بیچتا ہے میرے سامنے۔ میں اسے دیکھتے ہی دیکھتے دھول مٹی میں بدل دوں گا' اگر اس نے قانونی معاملات میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو۔"

میری بات ختم ہوئی تو فلک شیر پوری طرح مجھ سے متاثر ہو چکا تھا۔ میرے اندر کی سچائی لہجے سے جھلکتی تھی اس لیے میری بات میں اثر بھی تھا جس نے فلک شیر کو خاصا متاثر کیا تھا۔ کہتے ہیں' دل سے جو بات نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ دل کی اس بات میں اگر ضمیر کی روشنی بھی شامل ہو تو پھر یہ سونے پر سہاگا والی مثال بن جاتی ہے۔

"اب کیا ارادہ فلک شیر خان؟" میں نے خاموش فلک شیر کو مخاطب کیا۔

وہ فرمانبرداری سے بولا۔ "میں آپ کے ساتھ تارا گندی چلنے کو تیار ہوں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم کل یہاں سے روانہ ہوں۔"

"تم ایسا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟"

"اس لیے کہ اگر ہم ابھی روانہ ہوئے تو وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔" فلک شیر نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "فلک شیر! میں فرائض کی بجا آوری کے لیے رات و دن کا حساب نہیں کرتا۔

ری بات دھیان سے سنو۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "تم اسی وقت ہمارے ساتھ منظاری چلو گے۔ وہاں تھانے میں کچھ ضروری تیاری کرنے کے بعد ہم تارا گندی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

"لیکن جب تک تو رات کا اندھیرا پھیل چکا ہوگا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "آج کل چاندنی راتیں ہیں پھر میں نے سنا ہے کہ بلوچستان کے صحراؤں میں تاروں بھری رات کا سفر اپنا ایک منفرد مزہ رکھتا ہے۔ میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ کار سرکار بھی ہوگا اور تفریح طبع بھی۔"

فلک شیر نے میرے حتمی انداز کے بعد پھر کوئی اعتراض نہ کیا۔ کچھ دیر بعد ہم اس کے گھر سے باہر نکل آئے تاہم ہمارے ساتھ روانہ ہونے سے قبل اس نے اپنی ماں کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے۔ "سب ٹھیک ہے" کی تسلی دے دی تھی۔

ہم اونٹوں پر سفر کرتے ہوئے نیو قلعہ بازئی اور منظاری کے درمیان پہنچے تو اچانک مجھے نہ عورت کی مورتی والا وہ چابیوں کا گچھا یاد آ گیا جو اس وقت میری جیب میں موجود تھا۔ میں تذکرہ کی رِنگ کی فلک شیر سے تصدیق کرنا چاہتی۔ پتہ نہیں' اب تک میں اس بات کو کیسے اوش کیے بیٹھا تھا۔ میں نے مورتی والا گچھا اپنی جیب سے نکال کر فلک شیر کی طرف بڑھاتے ے کہا۔

"اس گچھے کو دیکھ کر تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟"

وہ گچھے کو اپنے ہاتھ سے میں لے کر تھوڑی دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ اس دوران میں ری نگاہ اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی تاہم میں نے اس کے چہرے پر غیر معمولی رات کو ابھرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اس گچھے سے ناواقف تھا اس نے جواب بھی میری توقع کے عین مطابق دیا۔

"تھانے دار صاحب!" وہ فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوا۔ "میں نے چابیوں کے اس گچھے کو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" ایک لمحے کو نگاہ اٹھا کر اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کس کا ؟"

"قاتل یا قاتلوں میں سے کسی کا۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"مگر آپ کا تو کہنا یہ ہے کہ بیگم جان اور اس کی بیٹی و داماد کے قتل میں رستم خان کا ہاتھ ؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''تو پھر؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''لیکن چابیوں کا یہ گچھا تو میں نے رستم خان کے پاس کبھی نہیں دیکھا۔''

''اس سے تم کیا مطلب اخذ کرتے ہو؟''

''یہی کہ اس واردات میں رستم خان ملوث نہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''ہوں'' میں نے گہری ہنکاری بھری اور چابیوں کا وہ گچھا اس کے ہاتھ سے لے لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے شاید بیگم جان کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کی تفصیل غور سے نہیں سنی۔ میں نے بتایا تھا کہ وقوعہ کی شام دو پراسرار اجنبی مشکوک مسافر بیگم جان کا پتہ پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ ممکن ہے' یہ واردات رستم خان نے اپنے خاص آدمیوں یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے کروائی ہو اور چابیوں کا یہ گچھا ان میں سے کسی کا ہو۔ رستم خان ہتھے چڑھ گیا تو سب کچھ واضح ہو جائے گا۔''

''آپ کی بات کو میں جھٹلاؤں گا نہیں'' فلک شیر خان نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے ذہن میں یہ سوال سر اٹھا رہا ہے کہ اگر یہ گچھا انہی دو افراد میں سے کسی کا ہے تو پھر اس کی مورتی کی پشت پر ''R'' کے بجائے ''K'' یا ''A'' ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے ان کے نام کبیر خان واشرف خان ہی بتائے تھے نا!''

''ہاں' نام تو ان دونوں نے یہی بتائے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے نام درحقیقت یہی ہوں۔ وہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے فرضی ناموں کا سہارا بھی تو لے سکتے ہیں۔''

''جی' ایسا ہو تو سکتا ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اور رستم خان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیسا خیال جناب؟''

''پہلی بات تو یہ کہ اس چابیوں کے گچھے کی مورتی کی پشت پر ''R'' کندہ ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے یہ کہ ممکن ہے' ان دو مشکوک مسافروں میں ایک رستم خان ہو' بدلے ہوئے بھیس میں؟''

فلک شیر خان چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر مدبرانہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ بات میرے حلق سے تو نہیں اتر رہی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''جب سے رستم خان سے میرا ملنا جلنا ہوا ہے اور ہم نے ایک ساتھ وقت گزارنا شروع کیا ہے' میں نے

چابیوں کا یہ گچھا اس کے پاس کبھی نہیں دیکھا۔ ازیں علاوہ آپ کے مطابق بیگم جان کو پیش آنے والا واقعہ ایک روز پہلے کا ہے جب کہ رستم خان سات آٹھ دن سے غائب ہے۔''

فلک شیر خان کے دلائل نے مجھے بھی الجھا دیا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ رستم خان آٹھ روز قبل قلعہ بازئی سے غائب ہو گیا ہو لیکن بات بعید از مکان تو نہیں تھی کہ اس دوران میں اس نے مضبوط منصوبہ بندی کی ہو اور وقوعہ کی رات شب خون مار کر بیگم جان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہو اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں بچا تھا۔

یہاں تک تو بات سمجھ میں آ رہی تھی لیکن فلک شیر خان نے چابیوں کا وہ گچھا رستم خان کے پاس دیکھنے سے انکار کیا تھا۔ اس پوائنٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم اس وقت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ رستم خان سے ملنے پر ساری صورتِ حالات واضح ہو جانا تھی۔ میں نے فلک شیر خان سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور ہم تھانے پہنچ گئے۔

تھانے میں ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہمارا قافلہ تاراگندی جانے کے لیے تیار تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ میں' اے ایس آئی خان شاہ' دو کانسٹیبلز اور فلک شیر خان' اس رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ ہم نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل ٹھیک ٹھاک پیٹ پوجا کر لی تھی۔ ہم حسب معمول اونٹوں پر سوار تاراگندی کی سمت رواں دواں تھے۔ میری توقع کے مطابق اے ایس آئی گل زمان کلی کمال زئی سے ناکام لوٹا تھا۔ کبیر خان واشرف خان نامی ان دو اجنبیوں کو پورے گاؤں میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا' گویا انہوں نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔

پوری راتوں کا چاند غروب آفتاب کے ساتھ ہی مشرقی افق پر جلوہ نما ہو چکا تھا۔ آسمان صاف اور جھلملاتے ہوئے تاروں سے مزین تھا۔ ہلکی ہوا کے جھونکے رات کی خنکی کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند خاصا اوپر آ گیا۔ اس کی نرم' ٹھنڈی اور روح پرور چاندنی نے حدِ نگاہ پھیلے صحرا کو جادو نگری میں بدل دیا تھا۔ فضا میں ایک عجیب سی کشش اور جذب کی کیفیت پائی جاتی تھی۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ چاند کی روشنی میں اضافہ ہو رہا تھا جو صحرا کی تاریکی کو اجال رہا تھا۔ میں اس سحر کار رات کے حسن میں ایسا کھویا کہ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھا۔ میں نے اتنی خوبصورت اور دل نشیں چاندنی رات اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

اچانک ایک پُردرد آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں خیالوں کی دنیا سے واپس ردِ عمل میں واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مخالف سمت سے ایک قافلہ آتے ہوئے دکھائی دیا۔

میں نے چند لمحے پہلے جو دردانگیز آواز سنی تھی وہ اسی گلے کی طرف سے آئی تھی۔ گلے کا ساربان ہجر و وصال کی کیفیات سے لبریز اور سوز و گداز میں گندھا ہوا ایک گیت گا رہا تھا۔ فرحت بخش ہوا کے جھونکے اس خوش گلو ساربان کی صدائے دل ہم تک پہنچا رہے تھے۔ وہ گیت مقامی زبان میں ہونے کے باوجود بھی میری روح کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ میری فرمائش پر اے ایس آئی خان شاہ اس گیت کا آسان ترجمہ کرنے لگا۔ خان شاہ کا شعری ذوق بلند تھا۔ ساربان نے گویا اپنا کلیجا نکال کر سپرد فضا کر دیا تھا۔ اس کی مدھر آواز اور الفاظ کا رچاؤ بس محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ پکار رہا تھا.....

تیری تلاش میں محو سفر ہیں ہم
گواہ آسماں ہمارا اور آسماں کے ہم

تیرے ہجر میں ہیں دل فگار
تجھے چاہنے کے ہیں گنہ گار

تیری دید کے ہیں منتظر
تیرے وصل کے ہیں طلب گار

ہمارے قافلے اور اس گلے کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا پھر ہم دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کے نزدیک سے گزر کر مخالف سمت میں اپنا سفر جاری رکھا۔ چاند کی چمک تاروں کی دمک سے ساربان کی آواز میں رچی بسی نغمگی کو دو آتشہ کر رہی تھی۔ اس گیت کے آخری الفاظ جو میری سماعت سے ٹکرائے' خان شاہ نے ان کا ترجمہ کچھ یوں کیا تھا۔

آکاش پر جتنے تارے ہیں
تیرے حسن کے نظارے ہیں
کوئی تیرا پتہ نہیں دیتا
حالانکہ ہم تمہارے ہیں
تیری تلاش میں محو سفر ہیں ہم
گواہ آسماں ہمارا اور آسماں کے ہم

ہم سحر انگیز اور دل فریب چاندنی رات میں سفر کرتے ہوئے بالآخر تارا گندی میں حکمت خان عرف پہاڑ خان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ پہاڑ خان میری توقع کے برخلاف ایک معقول آدمی ثابت ہوا۔ وہ جوا' شراب اور دیگر منشیات کے کاروبار میں ملوث ضرور تھا تاہم وہ یہ کام بہت

طریقے سلیقے سے ہاتھ پاؤں بچا کر کرتا تھا۔ فلک شیر خان کا وہ صورت آشنا تھا لیکن اس کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔ اس نے ہم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور فلک شیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''فلک شیرے! اس وقت میرے ڈیرے پر آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے لالہ۔'' فلک شیر نے ہماری جانب اشارہ کیا۔ ''ملک صاحب کو تم سے کوئی خاص بات کرنی ہے۔ رستم کے بارے میں۔''

پہاڑ خان واقعی گوشت پوست کا پہاڑ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروانا ضروری جانا۔

''مجھے ملک صفدر حیات کہتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''میں حال ہی میں اس علاقے کا تھانے دار مقرر ہوا ہوں۔''

''اوہ تھانے دار صاحب۔'' وہ پر جوش انداز میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کے بارے میں سن رکھا ہے۔ آپ خاصے مشہور آدمی ہیں۔ میں تو عنقریب خود آپ کی خدمت میں حاضری دینے والا تھا لیکن آج کل مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے چونکے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ آئیں' اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

ہم سب پہاڑ خان کی معیت میں اس کے ڈیرے کے ایک اندرونی کمرے میں جا بیٹھے۔ کمرے کی سیٹنگ اور سجاوٹ سے لگتا تھا' وہ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے طور پر بیک وقت استعمال ہوتا تھا۔ میں نے بغور کمرے کا جائزہ لینے کے بعد پہاڑ خان کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''پہاڑ خان! آج کل تمہاری مصروفیات زیادہ کیوں ہو گئیں۔ کیا کوئی نیا دھندا شروع کر دیا ہے؟''

''آپ ہمارے مائی باپ ہیں سرکار۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''جیسے دائی سے پیٹ' ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے جرم نہیں چھپایا جا سکتا' بالکل اسی طرح کسی تھانے دار سے اس کے علاقے کی حدود میں چھپا کر کچھ بھی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آپ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے تحفظ.....''

''بس بس' اس سے آگے ایک لفظ نہ بولنا پہاڑ خان۔''

میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی اور دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں ذرا دوسری قسم کا تھانے دار ہوں۔ کسی وہم و گمان یا خوش فہمی میں نہ رہنا۔ میں نے ہمیشہ مجرموں کی سرکوبی کی ہے' پشت پناہی یا تحفظ فراہم کرنا میرے لغت میں نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔''

وہ خوشامد آمیز لہجے میں بولا۔ ''جناب' آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا۔''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟''

وہ متامل انداز میں بولا۔ ''مطلب وطلب کو چھوڑیں سرکار۔ آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔ اس کا تاثر خوشگوار ہونا چاہیے۔ میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

یہ بات اس نے دوسری مرتبہ کہی تھی کہ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ مجھے اس کے انداز اور بیان نے تجسس میں مبتلا کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''پہاڑ خان! تم نے میرے بارے میں کیا سن رکھا ہے؟''

جواب میں وہ کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ اندرون پنجاب میں سرانجام دیے جانے والے میرے بیشتر کارناموں سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں فرض کی راہ میں اصولوں پر سودا کرنے کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ اس کا بیان ختم ہوا تو میں نے کہا۔

''پہاڑ خان! تم تو ایک انسائیکلو پیڈیا ہو۔''

''بس جناب! خیر خبر تو رکھنی ہی پڑتی ہے نا۔'' وہ انکسار آمیز لہجے میں بولا۔ ''اپنے پیشے سے متعلق ہر بات معلوم ہونی چاہیے۔''

''تم تو بہت خطرناک آدمی ہو بھئی۔''

''صرف دشمنوں کے لیے۔'' وہ مسکرایا۔ ''دوستوں کے لیے تو میں اپنی جان ہتھیلی پر سجائے پھرتا ہوں اور..... مجھے امید ہے' آپ سے میرے دوستانہ تعلقات ہی رہیں گے۔''

''میرے دوستانہ تعلقات؟'' میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''میں مجرموں سے دوستیاں نہیں کرتا پہاڑ خان۔''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ملک صاحب! جب میرا کوئی جرم آپ کی گرفت میں آئے گا تو

پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔ فی الحال تو آپ یہ بتائیں کہ رستم خان کے سلسلے میں آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

وہ صرف ذہین ہی نہیں بلکہ چالاک اور عیار شخص بھی تھا۔ ایسے لوگ مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں اور با آسانی قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس نے نہایت چالبازی سے میری توجہ رستم خان کی جانب مبذول کروا دی تھی۔ میں نے بھی دل میں سوچا' پہاڑ خان سے تو بعد میں نمٹا جائے گا۔ سرِدست رستم خان کا معاملہ بھگتانا چاہیے۔ میں نے پہاڑ خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''پہاڑ خان! تم رستم خان کو کب سے جانتے ہو؟''

''تقریباً دو سال سے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے' وہ اکثر تمہارے پاس آتا رہتا ہے؟''

''آپ نے بالکل درست سنا ہے۔''

''ایک ہفتے پہلے بھی وہ یہاں آیا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت وہ یہیں ہے نا!''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''پھر کہاں ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ''وہ ابھی تک واپس نیو قلعہ بازئی نہیں پہنچا۔ میں فلک شیر خان کو وہیں سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔''

پہاڑ خان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا ہوئے' ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کی گفتگو سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی سنگین نوعیت کا معاملہ پیش آ گیا ہے۔ کیا آپ مجھے اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے۔''

میں نے اس کی نرمی گفتار کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہ رستم خان کہاں ہے؟''

''ہوں۔'' پہاڑ خان نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تین روز پہلے وہ یہاں سے کلی عبداللہ جان (KILLI ABDULLAH JAN) گیا تھا' مجھے نہیں معلوم' وہ اس وقت کہاں ہوگا!''

''کلی عبداللہ جان!'' میں نے زیرلب دہرایا۔

پہاڑ خان نے کہا۔ ''پانچ روز قبل وہ کوئٹہ (QUETTA) گیا تھا لیکن اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی' وہاں سے اسے معلوم ہوا کہ اس کا مقصود کلی عبداللہ جان میں ہے لہٰذا اس نے اب وہاں کا رخ کیا ہے۔''

''پہاڑ خان! یہ کیا پہیلیاں ڈال رہے ہو؟'' میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ کھل کر کیوں نہیں بتاتے؟''

''آپ بھی تو اپنے پتے شو نہیں کر رہے؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کو رستم خان کی تلاش کس سلسلے میں ہے؟''

میں نے بحث مباحثے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے پوری تفصیل پہاڑ خان کے گوش گزار کر دی۔ حالات کی صورت سے آگاہ ہونے کے بعد اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! اس زنجیر کی کڑیاں ٹھیک طرح بیٹھ نہیں رہیں۔''

''کڑیوں کو بٹھانے' اٹھانے اور لٹانے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے وہ بتاؤ جو رستم خان کے بارے میں جانتے ہو۔ بالکل سچی اور کھری بات..... کلی عبداللہ جان اور کوئٹہ کے حوالے سے..... اور دیکھو' اگر تم نے دروغ گوئی سے کام لیا یا تفتیش کو کسی غلط رخ پر ڈالنے کی کوشش کی تو پھر سمجھ لینا' تمہارا حشر نشر بڑا اعبرت ناک ہوگا!''

''میں سمجھتا ہوں' اس معاملے میں مجھے جھوٹ بولنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔'' پہاڑ خان نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو الف سے یے تک پوری بات بتاتا ہوں۔''

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر ذہن میں خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کرتا رہا پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولنے لگا پہاڑ خان سے معلوم ہونے والی باتوں کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

پہاڑ خان کے مطابق کم و بیش ایک ہفتہ قبل رستم خان اس کے پاس آیا اور بتایا کہ بیگم جان اور زری کا سراغ اس نے لگا لیا ہے۔ پہاڑ خان نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا' بیگم جان نیو قلعہ بازئی سے سیدھی اپنی بہن ماہان کے پاس کوئٹہ گئی تھی۔ پہاڑ خان نے کہا' یہ لگ بھگ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ کیا اب تک وہ کوئٹہ ہی میں ہوگی؟ علاوہ ازیں کیا تم بیگم جان کی بہن ماہان کے

پتے سے واقف ہو؟ ان سوالات پر رستم خان نے بتایا' ایڈریس کے بارے میں بھی مجھے اشارے ملے ہیں اور جہاں تک یہ سوال ہے کہ وہ اب تک کوئٹہ میں ہوگی یا نہیں' یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑ خان' رستم کی زبانی زری اور اس کی محبت کی یک طرفہ داستان پہلے ہی سن چکا تھا۔ ایک بدمعاش ہمیشہ دوسرے بدمعاش کا ساتھ دیتا ہے چنانچہ پہاڑ خان نے اپنا ایک خاص آدمی رستم خان کے ساتھ کر دیا اور وہ کوئٹہ روانہ ہو گئے۔ مذکورہ آدمی کوئٹہ سے بخوبی آگاہ تھا۔

پہاڑ خان کے مطابق' تین روز قبل رستم خان کوئٹہ سے ناکام واپس لوٹ آیا۔ انہیں وہاں بیگم جان یا زری کے آثار نہیں ملے تھے تاہم پہاڑ خان کے آدمی کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہو گئی جو بیگم جان کے پس منظر سے واقف تھا۔ وہ شخص خاصا چلتا پرزہ تھا اور بلوچستان کے چپے چپے کا علم رکھتا تھا۔ مذکورہ شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ بیگم جان نیو قلعہ بازئی آنے سے پہلے کلی عبداللہ جان میں اپنی بہن ماہان کے پاس رہتی تھی۔ یہ اطلاع بہت عجیب و غریب اور نہایت اہم تھی۔ عجیب و غریب ان معنوں میں کہ رستم خان کے مطابق بیگم جان کی بہن ماہان کوئٹہ میں رہتی تھی اور اب پتہ چل رہا تھا کہ ماہان کلی عبداللہ جان کی رہنے والی تھی..... اور نہایت اہم ان معنوں میں کہ اگر واقعی ماہان نامی کسی عورت کا وجود تھا اور وہ کلی عبداللہ جان میں رہتی تھی تو پھر وہاں سے زری اور بیگم جان کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا تھا۔ یہ اطلاعات دینے والے اس تجربے کار شخص نے یہاں تک بتایا تھا کہ ماہان ابھی تک کلی عبداللہ جان ہی رہتی تھی۔ ان حالات کے پیش نظر اس بات کے قوی امکانات تھے کہ بیگم جان' زری کو لے کر واپس کلی عبدالہ جان چلی گئی ہوگی۔ یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد تین روز قبل رستم خان تاراگندی سے کلی عبداللہ جان روانہ ہو گیا تھا۔

پہاڑ خان کی کہانی میں چند باتیں میرے لیے الجھن کا باعث بن رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم بات تو بیگم جان کا اپنی بہن ماہان کے پاس کوئٹہ جانا تھا۔ نیو قلعہ بازئی میں جس شخص نے بیگم جان کا مکان خریدا تھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ کوئٹہ جانے والی بات بیگم جان نے صرف اسے ہی بتائی تھی۔ مراد خان کا دعویٰ اگر سچا تھا تو پھر یہ خبر رستم خان تک کیسے پہنچی؟ دوسری بات یہ کہ منظاری میں رہنے والوں کے مطابق بیگم جان لگ بھگ ایک سال پہلے وہاں آئی تھی۔ یہ وہی دور تھا جب اس نے نیو قلعہ بازئی کو خیر باد کہا تھا۔ واقعات کے مطابق تو یہی نظر آتا تھا کہ وہ نیو قلعہ بازئی سے سیدھی منظاری پہنچی تھی پھر کوئٹہ والی کہانی کیا معنی رکھتی تھی؟ ممکن ہے' بیگم جان نے اپنی پوزیشن کو خفیہ رکھنے کے لیے کوئٹہ کا شوشا چھوڑا ہو مگر اب ایک نئی بات سامنے آ رہی تھی۔

بیگم جان کی بہن ماہان کوئٹہ کے بجائے کلی عبداللہ جان کی باسی نکل آئی تھی اور..... رستم خان ان ماں بیٹی کے تعاقب میں کلی عبداللہ جان روانہ ہو گیا تھا۔

اس پورے معاملے میں رستم خان کے حوالے سے ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی جو رستم خان کو بے گناہ ثابت کر رہی تھی اور وہ بات یہ تھی کہ اگر رستم خان نے بیگم جان' زری اور امیر گل کو موت کے گھاٹ اتارا تھا یا کرایے کے قاتلوں سے انہیں ٹھکانے لگوایا تھا تو پھر وہ اس شد و مد سے انہیں تلاش کیوں کر رہا تھا؟ کیا یہ بھی اس کا کوئی ڈراما تھا یا وہ واقعی اس واردات میں سرے سے ملوث ہی نہیں تھا؟

اس کیس کے واقعات اس قدر الجھن پیدا کر رہے تھے کہ سر دست وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حقائق سے پردہ اٹھانے کے لیے بیگم جان تو اب اس دنیا میں دوبارہ آ نہیں سکتی تھی تاہم رستم خان اگر میرے ہتھے چڑھ جاتا تو حالات کی صورت واضح ہو سکتی تھی۔ میں نے رستم خان کو اپنے ذہن میں فوکس کر لیا اور پہاڑ خان سے پوچھا۔

''پہاڑ خان! تم نے بتایا ہے کہ تین روز پہلے رستم خان یہاں سے جا چکا ہے کیا وہ کلی عبداللہ جان اکیلا ہی گیا ہے یا تمہارا کوئی آدمی بھی اس کے ساتھ گیا ہے؟''

پہاڑ خان نے جواب دیا۔ ''وہ اکیلا ہی گیا ہے۔''

''اس کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع آئی؟''

''کس قسم کی اطلاع؟''

''کوئی مثبت یا منفی اطلاع۔'' میں نے وضاحت کی ''رستم خان' بیگم جان اور زری کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا یا نہیں؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں آئی جناب..... اور بیگم جان یا زری کا سراغ وہ کس طرح لگا سکتا ہے۔ آپ نے بتایا تو ہے کہ مظاری میں ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔''

''اس بات کو فوراً ذہن سے برآمد کرو پہاڑ خان۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ مجھے تو اس کیس میں رستم خان بے قصور لگتا ہے۔''

''وہ کیسے پہاڑ خان؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں پہاڑ خان نے وہی دلیل دی جس رخ کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی تائید کرنا مناسب نہ سمجھا اور کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''پہاڑ خان! بعض اوقات ہماری آنکھ جو کچھ ہمیں دکھاتی ہے' حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رستم خان اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے یہ ڈراما رچا رہا ہو۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب!'' اس کے لہجے میں حیرت اور آنکھوں میں الجھن تھی۔

میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''پہاڑ خان! میرا ایک سے ایک چالاک اور مکار مجرم سے واسطہ پڑا ہے۔ میں ان کی عیاری اور چالبازی کے ایک سو ایک زاویوں سے واقف ہوں۔ اس کیس میں عین ممکن ہے' رستم خان نے مضبوط منصوبہ بندی کی ہو۔ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ بیگم جان اور زری کی تلاش میں اسے دن رات چین نہیں ہے اور دوسری جانب ہو سکتا ہے' وہ ان کے مظاری والے ٹھکانے سے واقف ہو۔ اس نے خود یا کرایے کے قاتلوں کے ذریعے ان تینوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہو اور ظاہر یہی کر رہا ہو کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور ابھی تک انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔''

پہاڑ خان میری وضاحت سن کر خاموش ہو گیا تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ میری منطق کو وہ ہضم نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی جیب سے' جائے واردات سے ملنے والا چابیوں کا گچھا نکالا اور پہاڑ خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''یہ کیا ہے؟'' اس نے گچھا میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔

''چابیوں کا گچھا ہے۔''

''ہاں' وہ تو ہے۔'' وہ گچھے کا بغور جائزہ لینے کے بعد بولا۔

اس دوران میں میری عقابی نگاہ اس کے چہرے پر جمی رہی تھی جہاں مجھے وہ تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے جن کی میں توقع کر رہا تھا۔ میں نے بھاری بھرکم لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا پہاڑ خان؟''

''آپ نے پوچھا تھا کہ اس گچھے کے بارے میں' میں کیا کہتا ہوں۔'' وہ گچھے کی مورتی پر نظر ٹکاتے ہوئے بولا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم چابیوں کے اس گچھے سے واقف ہو؟ تم نے اسے پہلے کہیں' کسی کے پاس دیکھا ہے؟''

وہ قطعیت سے بولا۔ ”ہرگز نہیں۔ یہ گچھا آج میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“

یہ وہی جواب تھا جو نیو قلعہ بازئی میں فلک شیر خان نے مجھے دیا تھا اور ظاہر ہے یہ جواب میری توقع کے خلاف تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا۔ میں نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ واردات رستم خان کے کسی دشمن کا کارنامہ ہو؟ وہ دشمن ”رستم + زری“ کے معاملے سے واقف ہو اور براہِ راست رستم پر حملہ نہ کرنا چاہتا ہو چنانچہ اس نے رستم کو پھانسنے کے لیے یہ چال چلی ہو؟ یہ سب امکانی سوالات تھے جو لمحاتی انداز میں میرے ذہن سے گزرے تھے۔ ایسا ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی ہو سکتا تھا۔ مَیں نے اپنے خیال کی تصدیق کے لیے پہاڑ خان سے پوچھنا ضروری سمجھا۔

میں نے پہاڑ خان سے سوال کیا۔ ”پہاڑ خان! کیا تم رستم خان کے کسی دشمن سے واقف ہو؟“

وہ چند لمحات تک سوچنے کے بعد بولا۔ ”جب سے اور جہاں تک میں رستم خان کو جانتا ہوں، میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں آیا جسے میں اس کا دشمن سمجھ سکوں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جہاں انسان کے چار دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ضرور ہوتا ہے اور پھر رستم جیسے چال چلن والے افراد کے تو سو دشمن ہوتے ہیں۔ تمہارا جواب بے وزن ہے پہاڑ خان!“

پہاڑ خان نے کہا۔ ”ملک صاحب! میں نے ایک خاص نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ کے سوال کا جواب دیا تھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رستم خان کا اس نوعیت کا کوئی دشمن نہیں ہے۔“

پہاڑ خان میری توقع سے زیادہ گہرا ثابت ہو رہا تھا۔ وہ میری سوچ تک پہنچ گیا تھا تاہم میں نے اسی کی زبانی سننا چاہا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”پہاڑ خان! تم کس خاص نکتے کی بات کر رہے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بیگم جان کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ رستم کے کسی دشمن کا ”کارنامہ“ ہے اور اس نے یہ سب کچھ رستم کو پھنسانے کے لیے کیا ہے تو میں ایک مرتبہ پھر عرض کروں گا کہ ایسا سنگین اور بدترین دشمن میرے علم میں نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پہاڑ خان کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جس کا قد ساڑھے چھ فٹ، صحت

قابلِ رشک، لمبوترا چہرہ، باریک مونچھیں اور رنگ گورا ہو؟“ میں نے پراسرار اجنبی مسافر کبیر خان کا حلیہ بیان کیا تھا۔“

پہاڑ خان چند لمحوں تک آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب، ایسا کوئی شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔“

میں نے کہا۔ ”اور اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو ایک آنکھ سے کانا ہو، قد پانچ فٹ دو انچ، گھنی داڑھی اور مونچھیں، رنگ سانولا، بدن فربہ اور جس کا چہرہ گول ہو؟“ یہ کبیر خان کے ساتھی مسافر اشرف خان کا حلیہ تھا۔

پہاڑ خان نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیا اور پوچھا۔ ”یہ دونوں افراد کون ہیں؟“

میں نے جواب میں اسے تفصیلاً کبیر خان و اشرف خان کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے بھی میری اس بات سے اتفاق کیا کہ عین ممکن ہے اجنبی مشکوک مسافروں نے اپنا نام غلط بتایا ہو تاہم وہ اس واردات پر کسی اور زاویے سے روشنی نہ ڈال سکا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ پہاڑ خان سے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

سفر کی تھکن اور نیند سے ہمارا بُرا حال کر رکھا تھا اس پر پہاڑ خان نے اچھی طرح خاطر مدارات بھی کر دی تھی چنانچہ ہمارے بدن آرام کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہم نے مزید چند گھنٹے پہاڑ خان کے ڈیرے پر رکنے کا فیصلہ کیا تاکہ باری باری تھوڑی نیند لے لیں۔ اپنے ساتھیوں کے برخلاف میں نے صرف ستانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

وقتِ رخصت میں نے پہاڑ خان سے کہا۔ ”پہاڑ خان! تم نے قانون سے تعاون کا وعدہ کیا ہے لہٰذا اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“

”آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے ملک صاحب۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ”ہم یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے۔ اگر رستم خان اس دوران میں تمہارے پاس آئے تو تم خاموشی سے اسے اپنے ساتھ لے کر ہمارے پاس آؤ گے۔“

”جی جناب! میں ایسا ہی کروں گا۔“ وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

میں نے پہاڑ خان سے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ تھانے کے بجائے میرا ارادہ سیدھا کلی عبداللہ جان جانے کا تھا۔ راستے میں ایک جگہ ہم نے فلک شیر خان کو بھی خود سے جدا کر دیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فلک شیر! اب تم بھی اپنے گاؤں جا کر آرام کرو لیکن ایک بات یاد رکھنا۔“ میں نے

تاکیدی نظر سے اسے دیکھا۔

''جی حکم تھانے دار صاحب۔'' وہ سراپا انکسار نظر آنے لگا۔

میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے' رستم خان کلی عبداللہ جان سے تارا گندی جانے کے بجائے سیدھا تمہارے گاؤں نیو قلعہ بازئی پہنچ جائے۔ اس صورت میں تمہیں میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ تم حقِ دوستی نبھانے کے بجائے فوراً تھانے آ کر مجھے اطلاع دو گے۔ کیا سمجھے؟''

''سب سمجھ گیا جناب' بالکل سمجھ گیا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے مزید کہا۔ رستم خان اب زیادہ عرصے تک مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔ یہ نہ ہو کہ تم دوستی کے چکر میں خود بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچ جاؤ!''

میرے لہجے میں موجود وارننگ نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں جناب۔ میں آپ کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔''

''نہیں کرو گے تو سیدھا جیل جاؤ گے۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔ ''میرا کام تمہیں آگاہ کرنا تھا' وہ میں نے کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ اپنی عاقبت سنوارنے یا بگاڑنے کا تمہیں پورا اختیار ہے۔''

وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں ہر حال میں قانون کا احترام اور اس سے تعاون کروں گا۔''

''یہ تمہاری عقل مندی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' اب تم اپنے اونٹ کا رخ نیو قلعہ بازئی کی طرف کر لو..... اور یاد رکھو' گاؤں میں کسی کو اس واقعے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔''

''جی' میں اچھی طرح یاد رکھوں گا۔'' وہ فدویانہ لہجے میں بولا اور اونٹ کو اس راستے پر ہانکنے لگا جو سیدھا نیو قلعہ بازئی کی طرف جاتا تھا۔ ہم نے اپنے اونٹ تھانے کی سمت بڑھا دیے۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میری ہدایت پر تمام اونٹ روک دیے گئے۔ ابھی تک میں نے اپنے ساتھیوں کو آئندہ پروگرام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے سب کی استفسار یہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خان شاہ! تم کانسٹیبل زریں خان کو اپنے ساتھ لے کر یہاں سے تھانے جاؤ گے۔''

''او کے سر۔'' خان شاہ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''اور آپ سر؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں مولا زئی کے ساتھ کلی عبداللہ جان جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''اوہ!'' اے ایس آئی گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ''جب تک رستم خان ہمارے ہاتھ نہیں آ جاتا اس وقت تک اس کیس کی چولیں نہیں بیٹھیں گی۔ میں اس کے تعاقب میں کلی عبداللہ جان جاؤں گا اور تم لوگ تھانے میں رہ کر ایک ضروری کام کرو گے۔''

میں نے رک کر خان شاہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں سینکڑوں سوال تھے۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''خان شاہ! تم تھانے جاتے ہی اے ایس آئی گل زمان اور حوالدار صادق کو صورت حالات سے آگاہ کر دینا۔ میری واپسی سے پہلے ممکن ہے' تارا گندی سے پہاڑ خان یا نیو قلعہ بازئی سے فلک شیر خان کوئی اہم اطلاع لے کر تھانے پہنچ جائے۔ اس صورت میں تم لوگوں نے فوری ایکشن لینا ہے۔ میرے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہنا۔ کیا سمجھے؟''

''ملک صاحب! ان حالات میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' خان شاہ نے پوچھا۔

میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر پہاڑ خان' رستم خان کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آئے تو فی الفور رستم خان کو حوالات میں ڈال دیا جائے۔'' ایک لمحے کو میں سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر نیو قلعہ بازئی سے فلک شیر خان' رستم خان کی آمد کی اطلاع لے کر آئے تو پہلی فرصت میں نیو قلعہ بازئی جا کر رستم خان کو گرفتار کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' خان شاہ نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔ ''آپ کے حکم کے مطابق ہم وہی کریں گے جو آپ چاہتے ہیں۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے تم لوگوں سے بڑی امیدیں ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں' تم آگے چل کر بہت ترقی کرو گے۔ میں ایسے پرعزم نوجوانوں پر فخر کرتا ہوں۔''

فرطِ مسرت سے خان شاہ کا چہرہ گل و گلزار ہو گیا۔ زریں خان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ دونوں مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے مولا زئی کے ساتھ کلی عبداللہ جان کی راہ لی۔

سال ہا سال سے میرا یہ تجربہ اور مشاہدہ رہا ہے کہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی جائز اور سچی تعریف ان کا دل' حوصلہ اور ہمت بڑھا دیتی ہے۔ خصوصاً اگر آپ اپنے نیچے کام کرنے والوں

کے کام کو سراہیں' ان کی کارکردگی کو مانیں اور ان کے عزم کو داد دیں تو نہ صرف یہ کہ وہ زیادہ لگن سے اپنے کام میں جت جاتے ہیں بلکہ ان کے دل میں آپ کا مقام اور احترام بھی بڑھ جاتا ہے۔ میرے خیال میں سنئیر ہونے کے ناتے جونیئرز کا حوصلہ بڑھانا ایک نیک کام ہے اور ہر سینئر کا فرض بھی۔

ہم کلی عبداللہ جان سے تھوڑے فاصلے پر تھے کہ کانسٹیبل مولا زئی نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں ہاں' پوچھو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اگر ناراضی والی بات نہیں ہوگی تو میں کیوں ناراض ہوں گا..... خوامخواہ۔''

وہ بولا۔ جناب! آپ نے زریں خان کے بجائے مجھے کیوں اپنے ساتھ رکھا ہے؟''

اس کا سوال عجیب سا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بس ایسے ہی۔''

''میں سمجھا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔'' مولا زئی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''کوئی خاص وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے ایک کانسٹیبل کی ضرورت تھی اس لیے تمہارا انتخاب کر لیا کیونکہ تم زریں خان سے زیادہ چاق و چوبند ہو اور مجھے کسی ہوشیار ساتھی ہی کی ضرورت تھی۔ میرے خیال میں اسے خاص وجہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے' وہاں کلی عبداللہ جان میں جسمانی کارروائی کا سامنا ہو سکتا ہے چنانچہ تم زریں سے زیادہ مستعد ثابت ہو سکتے ہو۔''

''اچھا' یہ بات ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ تاہم اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اس کی تسلی نہ ہوئی ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے ذہن میں کوئی اور بات تھی مولا زی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ اور سوچ رہا تھا ملک صاحب!''

''اپنی سوچ سے مجھے آگاہ نہیں کرو گے؟''

''ضرور۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ کلی عبداللہ جان میں میری سسرال ہے۔ میں سمجھا' آپ مجھے اس لیے ساتھ لے جا رہے کہ وہاں کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات ہوں گی۔''

مولا زئی کا انکشاف بہت اہم اور مفید تھا۔ میں اس کی بات سن کر چونکے بنا نہ رہ سکا اور بے اختیار پوچھا۔ ''کیا واقعی تمہاری شادی کلی عبداللہ جان میں ہوئی ہے؟''

''جی ہاں' میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔'' وہ سادے سے لہجے میں بولا۔ ''میری بیوی یاسمین کا تعلق کلی عبداللہ جان ہی سے ہے۔''

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''تقریباً پانچ سال۔''

''اور بچے کتنے ہیں تمہارے؟''

''دو۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک لڑکا' ایک لڑکی۔''

میں نے کہا۔ ''ان پانچ سالوں میں تم کئی مرتبہ کلی عبداللہ جان گئے ہو گے!''

''جی ہاں' کئی بار گیا ہوں۔''

''پھر تو تم وہاں کے لوگوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو گے؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں میرے تعلقات صرف اپنی سسرال میں ہیں البتہ پڑوسیوں وغیرہ سے بھی رسمی علیک سلیک ہے۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا تم وہاں رہنے والی ماہان نامی کسی عورت کو بھی جانتے ہو؟''

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''جی نہیں ملک صاحب!''

''تمہاری سسرال والے تو ضرور ماہان سے واقف ہوں گے؟''

''مجھے یقین تو ہے۔'' وہ بولا۔ ''پہاڑ خان نے ماہان کا ذکر کیا تو میرا ذہن اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ سکا۔ نہ ماہان کے بارے میں اور نہ ہی بیگم جان کے بارے میں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری شادی کو صرف پانچ سال ہوئے ہیں اور بیگم جان کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ آٹھ نو سال پہلے کلی عبداللہ جان کو خیر باد کہہ کر نیو قلعہ بازئی آ گئی تھی اس لیے ممکن ہے بیگم جان کے بارے میں تم نہ جانتے ہو لیکن یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری سسرال والے ضرور ان دونوں سے آگاہ ہوں گے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔ ''مولا زئی! تمہاری سسرال میں کل کتنے افراد ہیں؟''

''صرف دو۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔ ''ایک میرے سسر چمن خان اور دوسری میری ساس رخسانہ بی بی!''

''کیا وہ شروع ہی سے کلی عبداللہ جان میں رہتے ہیں؟''

''جی ہاں' وہ کئی نسلوں سے وہاں آباد ہیں۔''

''پھر تو وہ وہاں کے بچے بچے سے واقف ہوں گے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

مولا زئی نے بھی پھر کوئی اور بات نہیں کی۔ میں چونکہ نیا نیا اس علاقے میں تعینات ہوا تھا اس لیے تھانے کے عملے کے خانگی حالات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ مجھے مولا زئی کی سسرال کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

ہم مزید کچھ مسافت طے کرنے کے بعد کلی عبداللہ جان پہنچ گئے۔ میں نے سیدھا مولا زئی کی سسرال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہماری آمد پر پہلے تو وہ حیران ہوئے کیونکہ آج سے پہلے مولا زئی اس طرح کبھی اپنی سسرال نہیں پہنچا تھا۔ یعنی باقاعدہ سرکاری وردی میں..... اور بیوی بچوں کے بغیر۔

مولا زئی نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنے سسر چمن خان کو صورتِ حالات اور اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ چمن خان کی عمر لگ بھگ پچپن سال تھی اور وہ صورت سے خاصا سمجھ دار دکھائی دیتا تھا۔

رسمی علیک سلیک اور خاطر تواضع کے بعد میں نے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کیا۔ پوری بات سننے کے بعد چمن خان نے بتایا۔ بیگم جان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تقریباً نو سال پہلے وہ اچانک یہاں سے چلی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ایک روز اچانک ہمارے گاؤں میں نمودار ہوئی تھی۔ وہ تقریباً دس سال تک یہاں رہی تھی۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں آنے سے قبل وہ کہیں اور رہتی تھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''یعنی وہ یہاں کی مستقل رہائشی نہیں تھی؟''

چمن خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جی ہاں' میرا یہی مطلب ہے۔ وہ پورے دس سال یہاں رہی لیکن اس دوران میں اس کی ذات ہمیشہ سو پردوں میں چھپی رہی۔ وہ جب ہمارے گاؤں میں پہنچی تو حاملہ تھی۔ اس کی بچی زری نے یہیں جنم لیا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ زیادہ گھل مل کر نہیں رہتی تھی اس لیے بھی لوگ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے بلکہ ایک تجسس پایا جاتا تھا اس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں۔''

''کمال ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''چپکے سے وہ یہاں آئی' ایک بچی کو جنم دیا اور دس سال کا طویل عرصہ گزار کر وہ کسی نامعلوم مقام کی طرف چل دی اس کے باوجود بھی یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیا وہ کوئی جادوگرنی تھی؟''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں بیگم جان کی پرت در پرت کھلنے والی شخصیت اور پل پل کروٹ بدلنے والے حالات سے چکرا کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایسا کردار پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری نگاہ میں پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے متعلق ہر نیا انکشاف میرے ذہن میں غور و فکر کے کئی در وا کر رہا تھا۔

چمن خان نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! میں مانتا ہوں کہ بیگم جان کوئی جادوگرنی نہیں تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے بارے میں لوگ نہ جاننے کے برابر جانتے ہیں۔''

''میں یہ کیسے مان لوں؟''

''سر' آپ کے نہ ماننے سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی نا۔'' چمن خان بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''کیا بیگم جان کے بارے میں اس کی بہن بھی کچھ نہیں جانتی؟''

میرا لہجہ اتنا سخت اور انداز اتنا کرخت تھا کہ چمن خان نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''بیگم جان کی بہن..... آپ کس بہن کا ذکر کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''بیگم جان کی بہن..... ماہان!''

''ماہان؟'' چمن خان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''ہاں' میں نے ''ماہان'' ہی کہا ہے۔''

''مگر.....'' چمن خان کے لہجے کی الجھن برقرار تھی۔ ''ہمارے گاؤں میں تو ماہان نام کی صرف ایک ہی عورت ہے..... اور وہ ہمارے سردار کی بیوی ہے۔ وہ بھلا بیگم جان کی بہن کس طرح ہو سکتی ہے؟''

میں اس کی بات سن کر الجھ گیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چمن خان' میری معلومات کے مطابق نو' ساڑھے نو سال پہلے بیگم جان یہاں کلی عبداللہ جان میں اپنی بہن ماہان کے پاس رہتی تھی۔ اور آج کل وہ یہاں.....'' میں نے دانستہ اپنے جملے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

میں جانتا تھا کہ بیگم جان اپنے مختصر سے کنبے کے ساتھ اب اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے تاہم پہاڑ خان کے مطابق رستم خان بیگم جان کو ڈھونڈنے ماہان کے پاس گیا تھا۔ اسی پس منظر میں' میں چمن خان کو بتانے والا تھا کہ بیگم جان آج کل بھی اپنی بہن کے پاس کلی عبداللہ جان آئی ہوئی ہے لیکن میں نے بروقت جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

چمن خان کے چہرے پر موجود الجھن دو چند ہو گئی۔ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں آپ کو پھر بتاتا ہوں کہ ماہان ہمارے سردار کی بیوی کا نام ہے اور وہ کسی بھی طور بیگم جان کی بہن نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بیگم جان یہاں کس کے ساتھ رہتی تھی؟"

"وہ سردار ہی کے گھر میں رہتی تھی۔"

"یعنی ماہان کے گھر میں؟"

"جی ہاں۔" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "بیگم جان ان لوگوں کی خدمت کرتی تھی۔ یوں سمجھیں' وہ ان کی نوکرانی تھی۔ وہ ماہان کی بہن بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟"

چمن خان کا جواب مجھے غور و فکر کی دعوت دے رہا تھا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چمن خان غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ بیگم جان اگر ماہان کی نوکرانی تھی تو اس نے خود کو اس کی بہن کیوں ظاہر کیا؟ کیا وہ اس طرح اپنی ذات کو مزید دبیز پردوں کے پیچھے دھکیلنا چاہتی تھی؟ وہ کہاں سے آئی تھی' کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ کلی عبداللہ جان سے کہاں گئی' کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور تھی جس کا سرا...... فی الحال کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور مجھے اس الجھن کو سلجھن میں بدلنا تھا۔

میری خاموشی نے چمن خان کو بولنے پر مجبور ر دیا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں سوال کیا۔ "تھانے دار صاحب! آپ بیگم جان کے بارے میں اتنی تفتیش کیوں کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا خدانخواستہ......؟" اس نے خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مولا زئی نے اپنے سسر چمن خان کو مختصراً اپنی آمد کے بارے میں بتایا تھا تاہم وہ بیگم جان اور اس کے کنبے کو پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے سے بے خبر تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم بیگم جان کی تلاش میں ہیں اور اس کے اسرار کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ معاملے کی سنگینی سے آگاہ نہیں تھا۔ اس موقع پر میں نے چمن خان کو بتایا کہ بیگم جان اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔

وہ افسوس ناک انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت برا ہوا۔ ظلم ہوا جناب' بیگم جان بہت اچھی عورت تھی۔"

میں نے کہا۔ "وہ اچھی عورت موت کے منہ میں جا چکی ہے' اپنی بیٹی اور داماد سمیت۔" پھر میں نے اسے بیگم جان کی منظاری آمد اور زری کی امیر گل سے شادی کے بارے میں بھی بتایا۔

"یہ قیامت کس نے ڈھائی ہے؟" چمن خان نے دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ہمیں ایک شخص پر شک ہے اور اسی کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تین روز پہلے وہ شخص کلی عبداللہ جان آیا ہے۔"

میں نے یہ بات دانستہ گول کر دی کہ رستم خان یہاں بیگم جان اور زری کو تلاش کرنے آیا تھا۔ ابھی تک میں خود رستم خان کے بارے میں مخمصے میں تھا۔ کچھ باتیں ایسی بھی سامنے آئی تھیں کہ ایک لمحے کے لیے رستم مجھے مجرم دکھائی دیتا تھا' دوسرے لمحے بے گناہ۔ میں ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ رستم خان کی دستیابی کے بعد ہی صورتِ حال واضح ہوتی۔ چمن خان کے سوال نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"اس بدبخت کا نام کیا ہے؟"

چمن خان کا اشارہ بیگم جان کو تاراج کرنے والے شخص کی جانب تھا میں نے اپنے اندازے کے مطابق جواب دیا۔ "ہم رستم خان نامی ایک شخص کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ اس کا تعلق نیو قلعہ بازئی سے ہے۔"

"رستم خان۔" اس نے زیر لب دہرایا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس نام کا تو کوئی شخص تین روز پہلے ہمارے گاؤں میں نہیں آیا۔"

"ممکن ہے' اس نے اپنا نام کوئی اور بتایا ہو؟"

"اگر ایسا بھی ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔" چمن خان نے کہا۔ "بیگم جان یا ماہان کی تلاش میں کوئی شخص یہاں نہیں پہنچا البتہ......"

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "البتہ کیا؟"

"تین روز پہلے ایک زخمی مسافر ہمارے گاؤں لایا گیا تھا۔" چمن خان نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ "گاؤں کے کچھ افراد اسے اونٹ پر ڈال کر لائے تھے۔ وہ شدید زخمی تھا' شاید اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔"

میں نے پوچھا۔ "چمن خان! کیا تم نے اس زخمی شخص کو دیکھا تھا؟"

"جی ہاں' ایک مرتبہ دیکھا تھا۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

میں نے رستم خان کے حلیے کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا اس زخمی مسافر کے بال گھنگھریالے' متناسب جسم' میانہ قد' دائیں گال پر مستا اور بائیں پاؤں میں لنگ تھا؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں چمک محسوس کی۔ وہ بے قرار لہجے میں گویا ہوا۔ "باقی سب کچھ تو آپ ٹھیک ہی بتا رہے ہیں لیکن اس کے بائیں پاؤں کے لنگ والی بات میں نوٹ نہیں کر سکا کیونکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ چند افراد نے اسے

سہارا دے رکھا تھا تاہم آپ کے بیان کردہ حلئے پر وہ پورا اترتا ہے۔ مجھے یقین ہے' تین روز پہلے یہاں لایا جانے والا زخمی مسافر ہی آپ کا مطلوبہ رستم خان ہے۔ میں نہیں جانتا' اس نے یہاں اپنا نام کیا بتایا ہے!''

چمن خان کی بات ختم ہوتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مضطرب انداز میں پوچھا۔ ''اس وقت وہ زخمی شخص کہاں ہے؟''

''سردار کے ڈیرے پر۔'' چمن خان نے جواب دیا۔ ''وہ سردار کے مہمان خانے میں آرام کر رہا ہے۔ سردار نے حکیم فرید گل سے اس کا علاج معالجہ شروع کروا رکھا ہے۔ جب تک وہ چلنے کے قابل نہیں ہو جاتا' وہ سردار کا مہمان رہے گا۔ آپ تو ہم پشتونوں کی روایتی مہمان نوازی سے واقف ہی ہوں گے۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سردار کا نام کیا ہے اور اس کا ڈیرا کس طرف ہے؟''

''ان کا نام سردار افضل خان ہے۔'' چمن خان نے بتایا۔ ''میں خود آپ کو ان کے ڈیرے پر پہنچا کر آتا ہوں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم سردار افضل خان کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار افضل کی عمر کا اندازہ میں نے ساٹھ کے اریب قریب لگایا۔ وہ ''ساٹھا پاٹھا'' کی زندہ مثال تھا۔ اس کی صحت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک معقول اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ سراپا تعاون نظر آنے لگا۔ تاہم بیگم جان کو پیش آنے والا واقعہ میں نے اسے فی الحال نہیں بتایا تھا۔ میں پہلے رستم خان کی بابت اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہتا تھا۔ بیٹھک میں اس وقت ہم تینوں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مولازئی کا سسر ہمیں وہاں پہنچا کر واپس اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ بیگم جان کے بارے میں سردست وہ اپنی زبان بند رکھے اور اپنی بیوی کو بھی اس سلسلے میں کچھ نہ بتائے۔ اس نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

افضل خان کی زبانی معلوم ہوا کہ زخمی مسافر نے اپنا نام گل زیب خان بتایا تھا۔ واقعات کے مطابق گل زیب خان (رستم خان) کا اونٹ اچانک ایسا بدکا تھا کہ وہ اونٹ کے اوپر سے قلا بازی کھاتے ہوئے اس کے قدموں میں آن گرا تھا اور اونٹ نے اسے اس بری طرح کچل ڈالا تھا کہ اس کے جسم کی بیش تر ہڈیاں چیخ گئی تھیں۔ اس وقت وہ کلی عبداللہ جان کے نزدیک پہنچ چکا

تھا۔ شدید زخمی ہونے کے بعد وہ وہیں بے ہوش ہو گیا بعد ازاں گاؤں کے کچھ افراد نے اسے ایک اونٹ پر ڈال کر گاؤں پہنچایا تھا۔

ہم افضل خان کی معیت میں مہمان خانے میں پہنچے یہاں ایک بستر پر رستم خان آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا میں نے اس پر نظر پڑتے ہی سمجھ لیا کہ وہ رستم خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ رستم خان کا حلیہ بہت واضح تھا۔

افضل خان نے مجھے بتایا۔ ''ملک صاحب! حکیم فرید گل کے مشورے پر میں نے گل زیب کو بھیڑ کا پوست پہنا دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ اگر اسے پوست نہ پہنایا گیا ہوتا تو اس کا جانبر ہونا ممکن نہیں تھا۔ اب تو اس کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔''

ہماری باتوں کی آواز سے رستم خان نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے قریب دو پولیس والوں اور اپنے محسن افضل خان کو دیکھ کر وہ بیک وقت چونکا بھی اور حیران بھی ہوا پھر اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا حال ہے رستم خان؟''

رستم خان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا اور یک بیک اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

افضل خان نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ اسے رستم خان کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ یہ رستم خان ہی ہے۔''

''تو کیا یہ گل زیب خان نہیں؟''

''بالکل نہیں خان صاحب۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نے آپ کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

میں نے ابھی تک سردار افضل کو یہی بتایا تھا کہ مجھے ایک اجنبی مسافر کی تلاش ہے۔ بیگم جان یا رستم خان کے حوالے سے میں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے رستم خان کو دوبارہ مخاطب کیا۔

''رستم خان! آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ اس وقت تم پولیس کی حراست میں ہو!''

''پولیس کی حراست!'' افضل خان ایک مرتبہ پھر چونکا۔ ''کیا گل زیب..... میرا مطلب

ہے رستم خان نے کوئی جرم کیا ہے؟"

"نہایت ہی سنگین جرم۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تین معصوم اور بے گناہ انسانوں کا قتل!"

"کس کا قتل؟" رستم خان نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی مگر درد کی ایک جان لیوا ٹیس نے اسے دوبارہ لیٹنے پر مجبور کر دیا تاہم وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

افضل خان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "ملک صاحب! آپ کن تین معصوم بے گناہوں کے قتل کا ذکر کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ اسی نامراد سے پوچھیں تو اچھا ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بستر پر لیٹے چور رستم خان کی جانب اشارہ کر دیا۔

اس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ افضل خان نے بار ہا اس سے یہی سوال کیا تاہم وہ مسلسل انکار میں گردن ہلاتا رہا۔ زبان پر بھی ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا' میں نے بے قصور ہوں۔

رستم خان کی طرف سے مایوس ہو کر افضل خان نے مجھ سے کہا۔ "آپ ہی اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالیں ملک صاحب! یہ قتل والا کیا معاملہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ کم بخت یہاں تو انکاری ہے مگر تھانے جا کر فر فر بولنے لگے گا۔ آپ فکر نہ کریں' ہم اس سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔"

"میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" رستم خان نے پُر درد لہجے میں کہا۔ "میں تو اس طرف بیگم جان اور زری کی تلاش میں آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود موت کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ میرا خدا مجھے معاف کرے۔ اگر میں زندہ بچ گیا تو عمر بھی خدا کی عبادت کروں گا۔"

"اور بدمعاشی و غنڈا گردی سے باز آ جاؤں گا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی۔

افضل خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" افضل خان کا لہجہ انتہائی سنجیدہ اور انداز دوستانہ تھا۔

میں نے کانسٹیبل مولا زئی سے کہا۔ "تم اس خبیث پر نظر رکھو۔ یہ اسی لمحے سے زیر حراست ہے۔ اس کی تلاش میں ہم نے بہت ریت پھانکی ہے۔"

مولا زئی ایک چاق و چوبند اور مستعد پولیس اہلکار نظر آنے لگا۔

افضل خان مجھے ایک خالی کمرے میں لے گیا۔ وہاں پلنگ کے علاوہ صوفے بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم دونوں صوفوں پر بیٹھ چکے تو افضل خان نے کہا۔ "اب آپ مجھے تفصیل سے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "رستم خان نامی یہ شخص ایک سکہ بند بدمعاش ہے اس کا تعلق نوقلعہ بازئی سے ہے۔ تارا گندی کے پہاڑ خان سے بھی اس کا یارانہ ہے۔ ہم اسی کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔ اس کا اصل نام رستم خان ہے۔ آپ کو دھوکا دینے کے لیے اس نے خود کو گل زیب خان کے نام سے متعارف کروایا ہے۔"

"اور آپ کے خیال میں اس نے تین افراد کو قتل کیا ہے؟ افضل خان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "واقعات اور حالات اسی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ تاہم اس کیس کی کچھ کڑیاں ابھی گمشدہ ہیں جن تک ہم رستم خان کے "تعاون" ہی سے پہنچ پائیں گے۔"

"تمہارے قتل کی یہ واردات کہاں اور کب ہوئی ہے؟"

"دو روز قبل منظاری میں۔"

"مقتولین کون ہیں؟"

"آپ کے لیے ان میں سے دو افراد ناشناسا نہیں ہیں۔"

"کک..... کون دو افراد؟" افضل خان پہلو بدل کر رہ گیا۔

میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "بیگم جان اور زری!"

افضل خان بے ساختہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے ربط الفاظ میں بولا۔ "یہ..... کیا آپ..... کہہ رہے ہیں جناب؟"

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں خان صاحب۔" میں نے قطعیت سے کہا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ تیسرا مقتول بیگم جان کا داماد امیر گل ہے۔"

"آپ کے خیال میں انہیں رستم خان نے قتل کیا ہے؟" افضل خان نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس کیس کی کچھ کڑیاں ابھی گمشدہ ہیں۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے رستم خان نے بتایا تھا کہ وہ بیگم جان اور

زری کی تلاش میں کلی عبداللہ جان کی طرف آ رہا تھا۔ اگر وہ بیگم جان اور اس کے مختصر خاندان کا قصہ پاک کر چکا تھا تو پھر اسے ان کی تلاش کس لیے تھی؟"

"یہ اس کے منصوبے کا کوئی حصہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

افضل خان کے چہرے پر فکر کی پرچھائیں دکھائی دینے لگیں۔ چند لمحات بعد وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آنے لگا اور پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ "میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں ملک صاحب!

"جی کہیے خان صاحب!" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وہ بولا۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ گل زیب یا رستم خان نے بیگم جان اور اس کی بیٹی و داماد کو قتل نہیں کیا۔"

"اس یقین کی وجہ بھی بتا دیجیے۔" میں نے کہا۔

"ضرور' ضرور۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا پھر میرے قریب دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "آپ نے بتایا ہے کہ دو روز قبل منظاری میں بیگم جان وغیرہ کو قتل کیا گیا ہے۔ یہی بتایا تھا نا آپ نے؟"

"جی' بالکل یہی بتایا تھا۔"

"لیکن آپ کا مطلوبہ بندہ تین روز سے یہاں بستر پر پڑا ہوا ہے۔" افضل خان نے کہا۔ اور اس حالت میں کہ اپنی مرضی سے یہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا۔ اب آپ خود ہی بتائیں' اس اندوہناک واقعے میں اس کا ہاتھ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کی بات میں وزن ہے اور آپ کی تصدیق کے بعد واقعات کی ایک گمشدہ کڑی بھی مجھے مل گئی ہے۔ یعنی رستم خان نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ تین قتل نہیں کیے لیکن وہ کرایے کے قاتلوں سے بھی تو یہ کام کروا سکتا ہے۔"

افضل خان بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "محترم! بہت سی باتیں میں نے دانستہ ابھی آپ کو نہیں بتائیں' شاید اس لیے آپ الجھن کا شکار ہیں۔"

"میرا بھی یہ خیال ہے۔" افضل خان نے کہا۔ "آپ کھل کر پوری تفصیل مجھے بتائیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا خان صاحب!"

"کیسا وعدہ ملک صاحب؟"

"جواب میں آپ بھی مجھے سب کچھ تفصیلاً بتائیں گے!

"سب کچھ کیا؟"

"جو بھی میں پوچھوں!"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ بہت گہرے انسان ہیں۔ یہاں ہماری گفتگو میں کئی مرتبہ بیگم جان' زری اور امیر گل کے قتل کا ذکر آیا ہے مگر آپ کے چہرے یا حرکات و سکنات سے وہ فکر' پریشانی اور تشویش ظاہر نہیں ہوئی جو ہونا چاہیے تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے کا فن بھی بخوبی جانتے ہیں۔ میں آپ سے بیگم جان کے بارے میں تفصیلی رپورٹ چاہوں گا..... کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ عرصہ دس سال یہاں کلی عبداللہ جان میں قیام کر چکی ہے۔ یعنی آپ کے ڈیرے پر..... آپ کی بیگم ماہان کی "خدمت" میں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کی بات کو جھٹلاؤں گا نہیں تاہم میں بیگم جان کے معاملے میں بہت محتاط ہوں۔ مجھے اس کی موت کا شدید صدمہ ہوا ہے لیکن جب تک مجھے آپ کا نقطہ نظر معلوم نہ ہو جائے' میں اپنی معلومات آپ تک نہیں پہنچاؤں گا۔ ویسے اب اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑتا۔ جب بیگم جان اور اس کی بیٹی ہی زندہ نہیں بچیں تو احتیاط کا کیا فائدہ!"

"آپ مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکتے ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور آپ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں پہل کر رہا ہوں۔"

افضل خان نے سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور میں نے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے بیگم جان' زری' امیر گل اور رستم خان کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ زری میں رستم خان کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ زری میں رستم کی دلچسپی اور بیگم جان کو دی جانے والی دھمکیوں کا میں نے خاص طور پر ذکر کیا تھا پھر اجنبی مشکوک مسافروں کبیر خان و اشرف خان کا بھی تفصیلی حوالہ دیا۔ چابیوں کا گچھے کا ذکر بھی آیا۔

افضل خان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے چابیوں والا گچھا دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے برہنہ عورت کی مورتی والا گچھا اس کی طرف بڑھا دیا اور مورتی پر کندہ حرف "R" کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائی۔

وہ گچھے کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بولا۔ آپ مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دیں۔ میں تنہائی میں رستم خان سے نہایت ہی اہم بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے' اس گفتگو

کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ رستم خان بیگم جان کے قتل میں کس حد تک ملوث ہے' اس کا ابھی پتہ چل جائے گا۔ میں چابیوں کا یہ گچھا بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن رستم خان کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ رستم خان میرے پاس قانون کی امانت ہے اور میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اس کے علاوہ میں کتنا امانت دار ہوں یہ آپ اس گاؤں کے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' آپ رستم خان سے علیحدگی میں بات کر سکتے ہیں۔''

پھر میں نے مولازئی کو رستم خان کے پاس سے ہٹا دیا۔ افضل خان نے ہم دونوں کو ایک آرام دہ کمرے میں بٹھایا اور کھانے پینے کا انتظام کرنے کے بعد بولا۔ ''ملک صاحب! مولازئی تو اس گاؤں کا داماد ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے کام آ کر بہت خوشی ہوگی۔ آپ یہاں کھائیں پئیں' میں اپنا کام کر کے آتا ہوں۔'' پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

افضل خان کی واپسی ایک گھنٹے کے بعد ہوئی۔ اس کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے برہنہ عورت کی مورتی والا چابیوں کا گچھا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے ٹھیک کہا تھا' میرا زخمی مہمان گل زیب خان نہیں بلکہ رستم خان ہی ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔''

''کیا اس نے اپنے جرم کو اقرار کر لیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' افضل خان نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''وہ اس لیے کہ رستم خان نے مبینہ جرم کیا ہی نہیں اور نہ ہی وہ کسی بھی حوالے سے بیگم جان' زری اور امیر گل کے قتل میں ملوث ہے۔''

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''رستم خان نے جو کہا' آپ نے آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیا خان صاحب!''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''میں نے آنکھیں بند کر کے اس کے بیان پر یقین نہیں کیا بلکہ اس کی زبان سے سچ اگلوایا ہے۔''

''اس نے کیا سچ اگلا ہے' ذرا میں بھی تو سنوں۔'' میں نے کہا۔

''میں وہی بتانے جا رہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایک بات تو آپ بھی

تسلیم کریں گے کہ اس وقت رستم خان مجھے اپنا سب سے زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتا ہے۔ میری کوشش اور توجہ سے اس کی جان بچی ہے۔ وہ میرا احسان مند ہے بلکہ بے دام کا غلام بنا ہوا ہے اس لیے مجھ سے جھوٹ بولنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں نے رستم خان پر ایک نفسیاتی حربہ آزمایا تھا جو صد فی صد کامیاب رہا۔ میں نے اس بتایا کہ پولیس اسے بیگم جان' زری اور امیر گل کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئی ہے۔ اس نے میری بات کے جواب میں بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش شروع ہی کی تھی کہ میں نے اسے خاموش کروا دیا اور اس پر یہ بات واضح کر دی کہ اسے گھبرانے یا فکر مند ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اتفاق سے تھانے دار میرا ایک دیرینہ دوست نکل آیا ہے یعنی آپ!''

وہ سانس لینے کے لیے رکا لیکن میں نے لب کشائی نہیں کی اور خاموش نظر سے اس کی جانب متوجہ رہا۔ وہ سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے رستم خان سے کہا کہ اگر اس نے جرم کیا بھی ہے تو میں اسے باآسانی بچا لوں گا۔ تھانے دار تو میرا دوست نکل ہی آیا ہے۔ ازیں علاوہ حکومتی سطح پر بھی میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ میں نہایت ہی آرام سے اسے ہر مصیبت سے نجات دلا سکتا ہوں مگر اس کے لیے اسے میری بات ماننا ہوگی۔ اس نے پُر اشتیاق نظر سے مجھے دیکھا اور لکنت زدہ لہجے میں بولا' خان صاحب! میں آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کروں گا۔ آپ نے میری جان بچا کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے میں اس کا بدلہ دے ہی نہیں سکتا۔ میری زندگی کی ایک ایک سانس آپ کی امانت ہے۔ میں آپ کے حکم پر خود اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ سکتا ہوں۔ وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا' مجھے تمہاری گردن کی نہیں بلکہ تمہاری زبان کی ضرورت ہے۔ وہ بولا' میں زبان بھی کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا' زبان کو کاٹنے کی ضرورت نہیں۔ بس میں تمہاری زبان کو سچ بولتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے بتاؤ گے کہ بیگم جان' زری' امیر گل اور تمہارا اصل معاملہ کیا ہے؟ میرے اس سوال پر اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے پھر اس نے مجھے تمام حقائق بتا دیے۔ وہ زری پر بری طرح مرمٹا تھا اور اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہاں بھی وہ اسی لیے آیا تھا کہ اسے کوئٹہ میں کسی شخص نے بتایا تھا کہ بیگم جان اپنی بیٹی کے ساتھ کلی عبداللہ جان میں ہے۔ وہ اپنی محبوبہ زری کی تلاش میں در در کی خاک چھان رہا تھا۔ اس نے مجھے

یقین دلایا ہے کہ منطاری والی بہیمانہ واردات میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں اور نہ ہی وہ اس واقعے کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان دنوں وہ ماں بیٹی منطاری میں رہ رہی تھیں۔'' چند لمحے کا توقف کر کے افضل خان نے اپنا سانس ہموار کیا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ ایک طویل عرصے سے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ انسانی نفسیات کا آپ گہرا شعور رکھتے ہیں۔ کیا موجودہ سچویشن میں آپ کے خیال میں رستم خان نے جھوٹ بولا ہوگا؟''

''میرا جواب ''نہیں'' ہوگا۔'' میں نے ٹھنڈا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے واقعی بہت بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا ہے۔ آپ جیسے لوگوں کو تو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے۔''

''اس عمر میں؟'' افضل خان نے اپنی صفائی سے ترشی ہوئی ہوئی داڑھی کو سہلاتے ہوئے مزاح کے رنگ میں کہا۔

میں نے بھی مذاقاً جواب میں کہا۔ ''ماشاء اللہ آپ تو اس عمر میں بھی ہم جوانوں سے زیادہ جوان نظر آتے ہیں۔ ایک بات سچ سچ بتائیں آخر آپ کھاتے کیا ہیں؟''

''یہ سب سادہ غذا کا کمال ہے ملک صاحب!'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''سادہ اور قدرتی غذا انسان کو بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ زندگی کے آخری سانس تک اس کے قویٰ مضبوط اور تمام نظام درست رہتے ہیں۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خان صاحب!'' میں نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ ''اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔''

''کون سا وعدہ بھئی؟''

میں نے اسے اس کے الفاظ یاد دلائے۔ ''افضل خان صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر! میں اپنا نقطہ نظر آپ پر واضح کر دوں تو آپ بیگم جان کے بارے میں مجھے تفصیلی معلومات فراہم کریں گے؟''

''اچھا اچھا وہ۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اب وہ سب کچھ بتانا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے بھی کہ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں اور اس لیے بھی کہ شاید اس طرح آپ بیگم اور اس کے کنبے کے قاتل تک پہنچ جائیں۔''

اس نے لفظ ''قاتل'' استعمال کر کے میرے وجود میں اضطراب کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔

''خان صاحب! میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ میرے مطلوبہ شخص یعنی تہرے قتل کے ذمے

دار شخص کے بارے میں خصوصی معلومات رکھتے ہیں؟''

''میں آپ کو صرف اشارہ دے سکتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''تصدیق اور تفتیش کرنا آپ کا کام ہے۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہا۔ ''میرے لیے آپ کا اشارہ ہی کافی ہوگا۔''

''میرے خیال میں بیگم جان کو زہرِ ماضی نے چاٹ لیا ہے۔''

''زہرِ ماضی!'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں دہرایا۔

''جی ہاں زہرِ ماضی۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''خان صاحب! اپنی بات کی وضاحت کریں۔ آپ ہی بیگم جان کے ماضی سے واقف ہیں اس لیے زہر کے بارے میں بھی آپ ہی کو معلوم ہوگا۔''

وہ خیالوں میں کھو گیا جیسے ماضی کے واقعات کو ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز میں خاصی گمبھیرتا تھی۔ میں یہاں اس کے بیان کا خلاصہ پیش کروں گا۔ افضل خان نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بیگم جان اور زری کے بارے میں نہایت ہی اہم اور سنسنی خیز معلومات فراہم کی تھیں۔

واقعات کے مطابق لگ بھگ انیس سال پہلے بیگم جان کلی عبداللہ جان میں وارد ہوئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور کون تھی اتفاق سے وہ سیدھی افضل خان کے ڈیرے پر پہنچی تھی۔ اس کی عمر کم و بیش اس وقت پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ مردانہ لباس میں تھی اور حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑی کٹھنائیاں سر کرنے کے بعد وہاں پہنچی تھی۔ افضل خان نے اسے اپنے ڈیرے پر پناہ دی۔ گھر کی عورتوں نے جلد ہی جان لیا کہ وہ حاملہ بھی تھی۔ افضل خان کی بیوی ماہان ایک مہربان اور ہمدرد عورت تھی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس نے بیگم جان سے اس کے تمام حالات معلوم کر لیے۔ بیگم جان کا اصل نام صابرہ تھا اور وہ خاندانی دشمنی میں لٹ پٹ کر وہاں تک آنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

بیگم جان یعنی صابرہ نے ماہان کو بتایا کہ اس کا تعلق ژوب (ZHOB) کے ایک دوافتادہ علاقے کل کچھ (KULKACH) سے تھا۔ یہ گاؤں نما قصبہ صوبہ سرحد کے نزدیک واقع تھا یعنی دونوں صوبوں (بلوچستان+سرحد) کی درمیانی حد کے پاس لیکن صوبہ بلوچستان کی حدود میں۔ صابرہ کے شوہر غنی داد خان اور اس کے چچازاد بھائی میر داد خان میں باپ داد کے وقت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ کسی زمانے میں غنی دادا خان کے باپ نے میر داد خان کے باپ کو کوئی بڑا نقصان

پہنچایا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غنی داد خان کمزور اور میر داد خان طاقت ور ہوتا چلا گیا اور انیس سال قبل ایک رات اس نے غنی داد خان کے حویلی نما گھر پر دھاوا بول کر پوری حویلی کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ تمام افراد کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے لیے بے تحاشا فائرنگ کی گئی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے۔ حملہ آور مال مویشی کو ہانک کر اپنے ساتھ لے گئے۔ غنی داد خان کا پورا خاندان تہ تیغ کر دیا گیا..... سوائے صابرہ (بیگم جان) کے۔

صابرہ اس وقت امید سے تھی۔ اس نے جب اپنی دنیا لٹتے دیکھی تو عام عورتوں کے برخلاف اس نے نہایت ہی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ بے ہوش ہونے کے بجائے اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ اس نے مردانہ لباس زیب تن کیا اور وہاں سے فرار ہوگئی۔ اس کی رگوں میں پشتون خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں سے بھیانک انتقام لینے کا عہد کیا اور چھپتے چھپاتے اپنے گاؤں سے بہت دور کلی عبداللہ جان پہنچ گئی۔ اس شب خون میں صابرہ کا تین سالہ بیٹا طور خان بھی ہلاک ہوگیا تھا۔ اب بس وہ بچی تھی یا اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ!

صابرہ نے اپنا سارا دھیان بچے میں لگا دیا۔ اسے امید تھی کہ وہ ایک نر بچے کو جنم دے گی جو اپنے خاندان کے قتلِ عام کا بدلہ لے گا۔ ماہان سے اس نے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کے راز کو راز رکھے گی اور..... ماہان نے یہی وعدہ اپنے شوہر سے لے کر صابرہ کی داستانِ الم اس کے گوش گزار کر دی تھی تاہم صحت مند بات یہ تھی کہ صابرہ عرف بیگم جان کا یہ راز ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ہی تھا۔

صابرہ بچے کی ولادت کا بے چینی سے انتظار کرتی رہی مگر کاتبِ تقدیر نے اس کے مقسوم میں ابھی اور دکھ لکھ رکھے تھے۔ صابرہ کی توقع کے برخلاف اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا..... زرینہ عرف زری کو۔ گویا اس کی امید کا دیا پھڑ پھڑا کر بجھ گیا۔

زری کی پیدائش کے بعد صابرہ چپ چپ رہنے لگی۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا' اس کا دل جیسے مُرجھا سا گیا تھا۔ ماہان جس حد تک اسے سمجھا سکتی تھی' سمجھا چکی۔ اس موقع پر افضل خان نے بھی اسے زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ دونوں کی کوششوں سے صابرہ اعتدال کی راہ پر آ گئی اور انتقام کے خیال کو ذہن سے نکال کر نارمل زندگی گزارنے لگی۔

پھر ایک صبح یہ انکشاف ہوا کہ صابرہ اپنی بیٹی زری کے ساتھ اچانک غائب ہوگئی ہے۔ وہ جس طرح گاؤں میں نمودار ہوئی تھی' ایک طویل عرصہ وہاں گزارنے کے بعد اسی طرح منظر سے غائب بھی ہوگئی۔ چند روز تک لوگ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کرتے رہے پھر گرد

بیٹھ گئی۔

افضل خان کا انکشاف انگیز بیان ختم ہوا تو میں نے کہا۔ ''خان صاحب! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بیگم جان یعنی صابرہ کو منظاری میں جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے پیچھے بھی میر داد خان کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟''

''بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خاندانی انتقام کا سلسلہ تو نسل در نسل چلتا ہے جناب۔ اگر صابرہ کے یہاں زری کے بجائے کوئی نر بچہ پیدا ہو جاتا تو پھر صورت قدرے مختلف ہوتی لیکن ہر صورت میں قتل و غارت گری اور خون ریزی لازمی تھی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''ویسے آپ کے پاس ان دو اجنبی مسافروں کے مکمل حلیے موجود ہیں۔ آپ اپنے ذرائع سے کل کچھ میں ایسی وضع قطع رکھنے والے افراد کو چیک کر سکتے ہیں۔''

افضل خان کی بات دل کو لگ رہی تھی اور اس کے انداز کو ذہن تسلیم کرتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر منظاری کے پندرہ سالہ نوجوان ملک یار خان کی بات یاد آ رہی تھی۔ کبیر خان و اشرف خان کے بارے میں اسی نے ہمیں بتایا تھا اور اس بات کا اشارہ بھی دیا تھا کہ ان دونوں اجنبی مسافروں نے بیگم جان کو پہلے صابرہ کے نام سے پکارا تھا۔ اس پس منظر میں افضل خان کی بات مزید وزنی ہو جاتی تھی کیونکہ بیگم جان کو صابرہ کے نام سے صرف اس کا ''ماضی'' ہی جانتا تھا..... اس لیے اس کی ہنستی بستی زندگی میں یہ زہر بھی اس کے ماضی ہی نے گھولا ہوگا۔

ہم افضل خان کا شکریہ ادا کر کے تھانے واپس آ گئے۔

آئندہ چند روز میں' میں نے نہایت ہی مستعد' ہوشیار اور ہر فن مولا کانسٹیبلز کی ایک ٹیم بنائی۔ یہ ٹیم چھ افراد پر مشتمل تھی۔ ان سب کو میں نے اجنبی مشکوک مسافروں کبیر خان و اشرف خان کے حلیے اچھی طرح ذہن نشین کروانے کے بعد وقفے وقفے سے کل کچھ کی جانب روانہ کر دیا۔ ان سب نے علیحدہ علیحدہ اپنی ذمے داریاں نبھانا تھیں اور بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی مدد بھی کرنا تھی۔ وہ سادہ لباس یعنی عوامی ڈریس میں تھے۔ میں نے انہیں تاکید کر دی تھی کہ مطلوبہ حلیہ رکھنے والا کوئی بھی شخص یا اشخاص انہیں نظر آئیں تو ان میں سے ایک بندہ فوراً مجھے مطلع کرے اور باقی اس مطلوبہ شخص کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں۔

اس کارروائی کے تیسرے روز مجھے ایک حوصلہ افزا رپورٹ ملی پھر اس سے اگلے روز ساری تفصیل موصول ہوگئی۔ ہمارے مطلوبہ افراد کا سراغ لگا لیا گیا تھا۔ کبیر خان دراصل رحیم داد خان تھا یعنی میر داد خان کا بڑا بیٹا۔ رحیم داد خان کے کانے ساتھی کا اصل نام سلطان خان تھا۔ وہ رحیم داد

خان کا یارِ غار قسم کا دوست تھا۔

اتنی اہم اور واضح معلومات حاصل ہونے کے بعد میں نے اوپر بات کی اور اپنے اعلیٰ افسران کو اعتماد میں لے کر ایک بھاری نفری کے ساتھ ایک رات کل کچھ پر دھاوا بول دیا۔ میرے آدمی ان دنوں مشتبہ افراد پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے اس لیے انہیں گرفتار کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

رحیم داد خان کی گرفتاری پر میر داد خان کی حالت دیدنی تھی۔ وہ زخمی شیر کے مانند دہاڑ رہا تھا' پاگل ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا تھا اور ارنے بھینسے کے انداز میں مجھے للکار رہا تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور دونوں ڈشکروں کو پابندِ سلاسل کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں ڈال دیا۔

میں نے خصوصاً اسی مقصد کے لیے پہلے ہی بہت اوپر تک بات کر لی تھی کہ مجھے معلوم تھا' رحیم داد خان کی گرفتاری پر بہت واویلا نما اودھم مچایا جائے گا۔ مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں سننا پڑیں گی اور ممکن ہے' بڑی بڑی شخصیات کے سفارشی رقعے بھی پہنچنے لگیں..... اور یہ سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہوا بھی تھا۔ مجھے چونکہ میرے اعلیٰ افسران کا تعاون پوری طرح حاصل تھا اس لیے کسی بھی مرحلے پر میرے پایہ استقامت میں جنبش پیدا نہیں ہوئی۔

جب ہم ''پراپر'' آدمی پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں تو پھر اس سے اقبالِ جرم کروانے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ رحیم داد خان پہلے تو اپنے والد کے بل بوتے پر ہمیں بڑی خطرناک قسم کی تڑیاں دیتا رہا لیکن جب میں نے اسے ''سرکاری محل'' کے ''مرصع ڈرائنگ روم'' کی سیر کروائی تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ اس نے بیگم جان (صابرہ) زری (زرینہ) اور امیر گل کے قتل کا اقرار کر لیا۔ یہ کام اس نے اپنے ساتھی کی مدد سے انجام دیا تھا۔ بیگم جان نے رحیم داد خان کو بچپن میں دیکھا تھا' وضع قطع میں بہت زیادہ تبدیلی اور شکل وصورت میں فرق آ جانے سے وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی اس لیے انہیں اجنبی مسافر سمجھ کر اپنی پشتون روایت کو ''نبھا'' بیٹھی تھی جو ازاں بعد اسے خاصی ''مہنگی'' پڑی۔

میر داد خان نے جب دیکھا کہ دھونس دھمکی سے کام نہیں بنے گا تو وہ سودے بازی پر اتر آیا۔ اس نے مجھے اس زمانے میں دس لاکھ روپے کی پیشکش کرتے ہوئے منت آمیز لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! اگر آپ چاہیں تو میرے بیٹے کو بچا سکتے ہیں' سلطان خان کو آگے بڑھا کر رحیم داد کو چھوڑ دیں۔ آپ کہیں گے تو میں رقم میں اضافہ بھی کر دوں گا۔''

میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیا سلطان خان انسان نہیں ہے یا آپ لوگ اپنے سوا کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے سلطان سے بات کر لی ہے۔ وہ بھری عدالت میں یہ بات کہنے کو تیار ہے کہ وہ تینوں قتل اس نے تن تنہا کیے تھے۔ رحیم داد اس واردات میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔''

''اور اس کے لیے آپ نے اسے یقین دلایا ہو گا کہ آپ اس کی رہائی کے لیے کوئی تگڑا وکیل کریں گے..... اور پیسا پانی کی طرح بہائیں گے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں چوٹ کی ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''ملک صاحب! آپ ان چکروں میں نہ پڑیں۔'' وہ التجا آمیز انداز میں بولا۔ ''بس آپ رحیم داد کو چھوڑنے کا وعدہ کر لیں۔ میں رقم دوگنی بھی کر سکتا ہوں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا..... بیس لاکھ روپے!''

میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ میر داد خان! آج اگر تم بیس لاکھ تو کیا' بیس کروڑ اور بیس ارب روپے بھی خرچ کرو تو میں تمہارے بیٹے کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یہ غلط فہمی دل سے نکال دو کہ میں تمہارے ہاتھوں بک جاؤں گا۔''

''آپ خواہ مخواہ ضد کر رہے ہیں۔'' وہ تلملائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''رحیم داد کو سزا ہو جانے سے بیگم جان وغیرہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہو جائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل' دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے۔ جس طرح تمہیں سزا نہیں ہوئی تھی اور..... غنی داد خان کا خاندان دوبارہ زندہ نہیں ہوا۔ کیا سمجھے؟

''آپ تو بلاوجہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''اب بھی سودا کر لیں فائدے میں رہیں گے۔''

مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میر داد خان! پہلی فرصت میں یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ مجھے اپنے عملے کو' تمہیں دھکے مار کر یہاں سے نکالنے کا حکم دینا پڑے گا۔''

وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے تھانے سے نکل گیا۔

ازاں بعد بھی اس نے اپنے اختیارات کا بہت زور لگایا مگر میں نے کیس اتنا مضبوط بنایا تھا کہ عدالت نے رحیم داد خان اور اس کے ساتھی سلطان خان کو سزائے موت سنا دی۔ میر داد خان کی کوششیں اعلیٰ عدالت تک جاری رہیں اور وہ اپنے بیٹے کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

جاتے جاتے ایک بات کی وضاحت کردوں۔ میر داد خان کی طرح بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے والا تو مر گیا۔ اس کے قاتل کو پھانسی چڑھانے سے وہ واپس نہیں آتا اس لیے سزا کی کیا ضرورت ہے؟

ان عقل سے پیدل لوگوں سے میں یہی کہوں گا کہ بے شک مقتول دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا لیکن قاتل کو سزا ملنے سے جرائم کی شرح میں کمی ضرور آتی ہے۔ آپ تصور کریں' اگر سو افراد عنقریب کسی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو قاتل کو سزائے موت ملنے کے بعد ان میں سے کم از کم پچاس فیصد اپنے ارادے سے باز آ جائیں گے۔ قرار واقعی سزا' جرائم میں کمی کا باعث بنتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام